باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

انتخابِ خاص

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

اپنا احتساب آپ!

بے درد لمحوں میں، آنکھ سے آنکھ سجھائی نہ دے۔ درد سے درد رہائی نہ دے، کالے تارکول سے چمکتی ناگن کی طرح بل کھاتی سڑکیں سراب دکھائیں۔ اُس سمے سوچیے! اندھیرے کی سیاہ چادر کتنی سفاک ہوتی ہے۔ ہر شے کو اپنی عفریت میں لے لیتی ہے۔ جس طرح ہر بھیانک منظر کے بعد، ایک بہت روشن، بہت خوشگوار نظارہ سامنے آ جاتا ہے، اسی طرح ہر بحران کے بعد خوشحالی اور ترقی کے امکانات بھی بہت روشن ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے اور ہم خوش نصیب ہیں کہ خدا کی قدرت ہماری دھرتی ماں کی کوکھ سے آج بھی خزانے اُگل رہی ہے۔

ساتھیو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ہمیں اپنی اپنی جگہ، اپنا احتساب کرتے ہوئے، وطنِ عزیز کی سالمیت پر حرف نہیں آنے دینا ہے۔ ہمیں موجودہ حالات میں بھی وطن کے مستقبل کو روشن رکھنا ہی نہیں، دیکھنا بھی ہے۔ ہمارا آنے والا کل، انشاء اللہ بہت روشن ہوگا۔

کاشی چوہان

زادِ راہ

ایک زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اپنے نبی ﷺ کو ایسے لوگوں کے لیے مطلع فرما دیا کرتا تھا کہ فلاں منافق ہے، فلاں مرتد اور فلاں متذبذب۔ اس وقت بھی ماننے والے موجود تھے جو اسلام کے برحق ہونے کو تسلیم کر کے اسے ثابت کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔ اس وقت بھی......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ہم لوگ اسلام کو برحق سمجھتے ہیں، اسے دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں، اس کا پرچار بھی کرتے ہیں اور اعلان بھی لیکن کسی بھی قسم کی عملی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہم اپنے مفاد کی قربانی نہیں دے سکتے۔ برائی کو ترک کر دینے یا اپنے نفس کو برائی سے روکنے کی قربانی نہیں دے سکتے۔ دین کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھا سکتے۔ ہم اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اسلام نے جن جن برائیوں سے روکا ہے، انہیں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ گویا کہ آج کے دور میں تیسری قسم کے لوگوں میں سب سے زیادہ مسلمان شامل ہیں جن کا دین کچھ اور ہے اور طور طریق کچھ اور۔ جدھر سے فائدہ کی توقع ہو، ادھر ہی جھک جاتے ہیں اور خود کو دونوں طرف کے خطرات سے بچا لیتے ہیں اور ہم کبھی بھی یہ غور نہیں کرتے کہ زندگی گزارنے کا یہ انداز سب سے بڑا فساد ہے، سب سے بڑی خرابی ہے جس میں نقصان دوسروں سے زیادہ ہمارا اپنا ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ دانش مندی ہے۔ منافقت ہے یا اللہ تعالیٰ نے نیکی کی توفیق سلب کر لی ہے کہ برائی کو برائی جان لینے کے بعد بھی ہم اس سے بچ نہیں سکتے؟

غور کیا جائے تو ہر عمل کے کچھ نہ کچھ نتائج ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا اجر دنیا میں بھی اور دین میں بھی ضرور ملتا ہے اور ان کا نتیجہ انسان زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی ضرور دیکھتا ہے، جزا بھی اور سزا بھی پاتا ہے۔ جس کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں، جن پر ہم غور نہیں کرتے۔ عمل کے لازمی نتیجہ میں مزید عمل کا راستہ کھل جاتا ہے اور ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا عمل جاری ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی لازمی ہے کہ عمل کا بدل عمل کے ساتھ ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ ہر عمل دوسرے عمل کو کھینچ کر لاتا ہے اور خیر کے امر پر خیر اور شر کے عمل پر شر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں، ہر عمل کی جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اسی طرح سے ہر برائی کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ خیر کی سب سے بڑی جزا یہ ہے کہ خیر شروع ہو

جاتا ہے اور برائی کی دنیاوی سزا یہی ہے کہ برائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور شاید یہ بدترین سزا ہے کہ برائی کرتے کرتے نیکی کرنے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور اس کے بعد انسان برائی کو پورے شعور اور عقل کے ساتھ محسوس کر کے بھی اسے چھوڑ نہیں پاتا مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ بھلائی اور خیر کے کام کر رہا ہے۔

ہر دور میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں' ماننے والے' نہ ماننے والے اور بین بین یا منافق۔ ایمان کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی۔ یہ تینوں قسمیں ہر دور میں اور ہر قوم میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی صفات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

ماننے والے وہ ہیں جو دل و جان سے مانتے ہیں' یقین کرتے ہیں اور ثبوت دینے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یقین اور ایمان کے ساتھ ظاہری فرماں برداری ان کا شعار ہوتی ہے۔ ان کا ایمان قلب سے شروع ہو کر تمام ظاہری اعمال تک پختہ اور پائیدار ہوتا ہے جو انہیں ناقابل تسخیر بنا دیتا ہے۔ ان کے نظریات' خیالات' ارادے' فیصلے اور عمل سب ان کی فکر کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیاں اطاعتِ الٰہی میں گزرتی ہیں۔ دنیا کے تمام تعمیری کام اور خیر کے امور ایسے ہی لوگوں سے انجام پاتے ہیں۔ تمام انبیاء کے ساتھی ان ہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے لمحہ لمحہ ساتھ دیا اور جنہیں اہلِ ایمان کہا گیا ہے۔

''جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپؐ پر نازل کیا گیا اور جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں' وہی لوگ اپنی رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں۔''

(البقرہ۔۵)

دوسری قسم کے لوگ نہ ماننے والے ہیں جو نہیں مانتے' انکار کرتے ہیں اور کھلم کھلا انکار کرتے ہیں اور قول و عمل سے خود کو مخالف ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں جو بھی کرنا پڑتا ہے' وہ کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اور خونریز جنگیں اسی بات پر ہوتی ہیں کہ ہم نہیں مانتے' ہم تسلیم نہیں کرتے' جو کرنا ہے' کر لو۔ دین کے خلاف انہوں نے ہر حربہ استعمال کیا اور خود کو چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ان میں بڑے بڑے نام ہیں۔ قرآن پاک نے ان ہی کو منکرین قرار دیا ہے۔

یہی کافی ہیں جو اپنے کفر میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کو ہدایت دینا اور نہ دینا برابر ہوتا ہے۔

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا' ان پر برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔'' (البقرہ۔۷)

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس تک دشمنانِ حق ان ہی لوگوں میں سے ہوئے ہیں' ان کے خیالات' نظریات' ارادے' فیصلے' عمل اور اعمال کے نتائج سب حق کو جھٹلانے والے رہے ہیں اور تمام زندگی حق کو جھٹلانے اور انکار کرنے میں گزر جاتی ہے اور آخرت کو بھول کر وہ اپنی زندگی کا مقصد اسی کو بنائے رکھتے ہیں۔

تیسری قسم بین بین رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ انہیں منافق بھی کہا جاتا ہے اور سازشی بھی۔ دنیا بھر کی تمام سازشیں' چالاکیاں' دھوکے اور فریب ان ہی کی بدولت عمل میں آتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ان کی خصوصیات ایک ہی رہی ہیں۔ نبی ﷺ کے زمانہ مبارک سے اب تک ان کی صفات وہی ہیں کہ یہ لوگ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں شامل رہنا چاہتے ہیں تا کہ دونوں طرف سے فیض پا سکیں۔ ان ہی کے لیے ارشاد ہوا۔

''وہ دھوکا دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو جبکہ اصل میں وہ دھوکہ دیتے ہیں اپنے آپ کو مگر سمجھتے نہیں۔ ان کے دلوں میں مرض ہے' سو اللہ نے اس کو بڑھا دیا ہے۔''

یہ لوگ دین کے معاملے میں جھوٹ بولتے ہیں اور دین میں داخل ہو کر دین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں قسم کے لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں کیونکہ ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں قسم کے لوگ صاف پہچانے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو پہچانا نہیں جاسکتا بلکہ شاید یہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتے جیسے کہ آج ہم خود کو نہیں پہچان پا رہے کہ ہم کیا ہیں؟ مانتے بھی ہیں اور نہیں بھی مانتے۔ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ خرابی سے روکتے بھی ہیں اور خرابی کا سبب بھی ہیں۔

فرمایا۔ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں مگر سن رکھو' بے شک وہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتے۔'' (سورۃ البقرہ۔١١)

اسی کیفیت کو قرآنِ پاک نے دلوں پر مہر لگانے اور کان اور آنکھوں پر پردہ ڈال دینے سے تشبیہ دی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ بذریعۂ وحی اپنے نبی ﷺ کو ایسے لوگوں کے لیے مطلع فرما دیا کرتا تھا کہ فلاں منافق ہے' فلاں مرتد اور فلاں متذبذب۔ اس وقت بھی ماننے والے موجود تھے جو اسلام کے برحق ہونے کو تسلیم کر کے اسے ثابت کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔ اس وقت بھی نہ ماننے والے موجود تھے جو کھل کر مسلمانوں کے سامنے آجاتے تھے اور اس وقت بھی منافقین تھے جن کی یہی صفات تھیں کہ اسلام سے بھی رابطہ رکھتے اور مخالفین سے بھی۔ جب جدھر فائدہ دیکھا' ادھر جھک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے انہیں اپنے نبی ﷺ پر عیاں کر دیا کیونکہ ان سب کی پہچان بتا دینی مقصود تھی اور علامتیں بھی واضح کرنی تھیں تو پھر ہر فرد جان سکتا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں منافقوں میں یہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ وہ دوستوں اور دشمنوں میں دونوں جگہ مقام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھے تو ان کی پالیسی کا دعویٰ کرنے لگے اور دشمنوں میں بیٹھے تو ان سے رفاقت بڑھا لی۔ ایسے لوگ خود کو بہت صاحب عقل اور مدبر سمجھتے ہیں لیکن اپنی تمام تر تدبیروں سے خود ان ہی کو واسطہ پڑتا ہے اور ان کے اعمال کا نقصان ان ہی کو ہوتا ہے۔

''جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں' ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطان کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو محض مذاق کرتے ہیں حالانکہ اللہ ہی ان سے مذاق کرتا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں بڑھا دیتا ہے۔ وہ اندھے ہو رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی مول لی اور ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے تھے۔'' (البقرہ۔١٦)

یہ تینوں قسم کے لوگ آج بھی ہیں مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دور میں ہم خود ہی تیسری قسم کے لوگوں میں شامل ہیں اور ایمان کا دعویٰ کر کے فساد پھیلانے والوں میں سے ہوں اور وہ ہم ہی ہیں جن کے اعمال کی بدولت ان سے نیکی کی توفیق سلب کر لی گئی ہو کہ ہم برائی کو برائی سمجھ کر بھی چھوڑ نہیں پا رہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں اپنا ٹھکانہ خود سوچ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو منافقت اور کفر سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II ۔خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو!

آپ سب کو رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ کیسی کیسی گزر رہی ہے زندگی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس پُرآشوب زمانے میں سہولت سے زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں لیکن دوستو آپ کے خیالات اور سوچ کا عملی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے آپ اپنے آنے والے دنوں کے لیے جتنا اچھا سوچیں گے اللہ آپ کی جھولی میں ویسے ہی خوبصورت دن ڈالے گا۔ نیگیٹیو سوچ ایک ایسا اندھیرا ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ آپ کی ساری خوشیوں پر سیاہی بن کر چھا جاتی ہے پوزیٹیو سوچ کی جگمگاتی روشنی کو اپنے دل میں اتار کر دیکھیے زندگی خود بخود پیاری لگنے لگے گی تو آئیے چلتے ہیں اپنے ان خوبصورت مہمانوں کی جانب جو محفل میں کب سے آئے بیٹھے ہیں۔

آج کی ہماری پہلی مہمان ہماری بہت پیاری رائٹر عتیقہ محمد بیگ ہیں جو سیالکوٹ سے تشریف لا رہی ہیں پیاری رضوانہ اس بار دوشیزہ ملا آپ کا نام پڑھ کر بے اختیار آپ سے بات کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کو دل
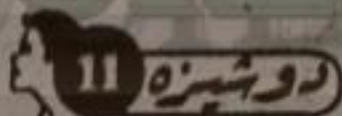
چاہا گو کہ آج کل چینلز پر لکھتے میں کافی بزی ہوں لیکن پھر بھی دوشیزہ سے رابطہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

✉: ڈیئر عتیقہ! آپ نے ہمیں سیالکوٹ سے یاد کر کے ہمارا مان بڑھا دیا کہ آپ ہمیں بھولی نہیں آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ اور ہاں اپنا وعدہ یاد رکھیے گا ارے وہی افسانہ بھیجنے والا۔

✉: احمد سجاد بابر لودھراں سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں' السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، پاکستان کی تعمیر و ترقی، اس کے اجالوں کے لئے دعا کے ساتھ بات آگے بڑھانا چاہوں گا، مارچ کے شمارے میں معاویہ عنبر کی ایک نظم لگی ہے، مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ ایک پرانی اور مشہور نظم میں صرف الفاظ کی جگہ تبدیل کر کے بنائی گئی ہے، پہلے آپ اصل نظم دیکھیے

فاختہ بھی پاگل تھی
موسموں کی سازش سے
پھر فریب کھا بیٹھی
توپ کے دہانے پر
گھونسلہ بنا بیٹھی!!

یہ کوئی گمنام نظم نہیں بلکہ ہر بڑے شاعر، لکھاری، دانشور کو اس کا پتہ ہے، یہ نظم ایک دور میں اتنی مشہور ہوئی کہ سرفراز شاہد نے اس کی پیروڈی ''فاخرہ تو پاگل تھی'' بھی لکھی، معاویہ عنبر نے الفاظ کے ادل بدل سے یہ نظم اپنے نام کر لی، اب آپ معاویہ کی نظم دیکھیے!!

وہ فاختہ بھی
ناداں، پاگل تھی کتنی
موسم کی سازش، باتوں میں آکر
فریب کھا بیٹھی
شکاری کی راہ گزر میں
گھونسلہ اپنا بنا بیٹھی!!

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ نظم کا تھیم، کلائمکس، اختتام، الفاظ سب وہی ہیں، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اب ذرا پرچے کی بات ہو جائے، صدف آصف کے کی تحریر ''گیٹ وے آف لو'' کو پہلے نمبر پر نہ رکھنا یقیناً زیادتی ہوگی، یہ وہ تحریر رہی کہ جس نے جکڑ کر رکھا، کسی بھی جگہ پر تشنگی محسوس نہیں ہوئی، اختتام بہت اچھا رہا، تمام واقعات کو مربوط رکھا گیا، تفصیلات میں جزئیات تک پر دھیان دیا گیا، جس کی وجہ سے ایک اعلیٰ پائے کا ناولٹ وجود میں آیا، چاشنی کی وجہ سے تحریر نے کسی بھی موقع پر قاری کو دامن چھڑانے نہ دیا، اور جو انجام دکھایا وہ بھی اچھا اور فطری لگا۔ مکالمے عمدہ رہے۔ صدف آصف کو بہت بہت مبارک...... ''مٹی کی قسمت'' میں دلشاد نسیم نے منفرد لفاظی کے ذریعے جاگیردارانہ نظام میں پھنسی عورت کے مقدر کو گھور اندھیروں میں پھنسا دکھایا کہ آج بھی کچھ نہیں بدلا، وہی صید اور وہی صیاد کا گورکھ دھندا یعنی ''پرندے بھی وہی ہوں گے، شکاری جال بدلے گا'' ''بے نام مسافتیں'' کو نزہت جبیں نے عمدہ پیرائے میں پیش کیا، پرکشش انداز تحریر ہے ان کا، اچھا لگا یہ افسانہ۔ ایک اور تحریر جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ''صفائی کی مہک'' تھی جس میں تحسین انجم نے ایک ایسا تھیم بیان کیا جو نیا اور کم یاب لگا، ایک مختلف موضوع پر لکھی تحریر، اور انداز بیان غضب کا پر

گنگ Punch lines انچھوتی اور پُر اثر۔۔۔۔۔۔ ویل ڈن ۔ روبینہ شاہین نے ''کیسی ہے یہ تنہائی'' میں ایک برتے ہوئے تھیم کو اپنی مہارت اور عمدگی سے پیش کیا کہ اچھا لگا۔ اداریہ حسب معمول بہت عمدہ اور حالات کا عکاس تھا۔ مجموعی طور پر پرچہ اول تا آخر اچھے مواد سے مزین تھا، ٹائٹل ہمیشہ کی طرح متوجہ کرنے والا تھا۔ شاد و آباد رہیے، رب راکھا۔

بھ: بابر صاحب! آپ نے جس بات کی نشاندہی کی ہے اس کے لیے ہمیں اس کے شاعر معاویہ عنبر ڈوسے کہنا ہوگا کہ پلیز وہ اپنی وضاحت قارئین کو اس ماہ دوشیزہ کی محفل میں عنایت کریں آپ کا دوشیزہ پر اتنا جامع تبصرہ اچھا لگا ایسے ہی آتے رہیے گا۔

بہ: افشاں رضا پہلی بار اسلام آباد سے ہماری محفل میں آئی ہیں۔ پیاری رضوانہ باجی دوشیزہ ڈائجسٹ میں اکثر پڑھتی ہوں لیکن اس ماہ سے میں اس کی سالانہ خریدار بھی بن گئی ہوں اور سچ جانیے جب پوسٹ مین نے مجھے گھر پر دوشیزہ لا کر دیا تو اس کی خوشی اور مزہ کچھ اور ہی تھا پہلی بار آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں اس لیے کچھ نروس سی ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ تفصیلی خط کے ساتھ آؤں گی ویسے اس ماہ کا دوشیزہ دل کو چھو گیا شاید

''ایک تقریب ملاقات''

بہت عزیز قارئین!

ہم نے سوچا کہ رائٹرز کے ساتھ تو گیٹ ٹوگیدر ہوتے ہی رہتے ہیں، کیوں نہ بہار کے اِس خوبصورت موسم میں اِس بار اپنے دوشیزہ پڑھنے والے قارئین کے ساتھ ایک شام منائی جائے کہ دوشیزہ کی یہ جگمگاہٹ آپ سب پڑھنے والوں کے دم سے ہی تو ہے سو محبتوں اور رابطوں کے اِس بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے ہم نے اگلے ماہ ''ایک تقریب ملاقات'' کا اہتمام کیا ہے، جس میں ہم اپنے قارئین کے ساتھ چائے پر کچھ لمحات کو یادگار بنائیں گے اور پھر اِس تقریب خاص کی تصویری جھلکیاں اگلے ماہ کے شمارے میں شائع کی جائیں گی تو قارئین اِس تقریبِ ملاقات میں شرکت کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل ٹوکن پُر کر کے ہمیں آج ہی پوسٹ کر دیں۔ دیر سے ملنے والے کوپن تقریب کے دعوت نامے میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔

تقریبِ ملاقات

کوپن برائے
اپریل 2015ء

نام: ____________________

پتا: ____________________

رابطہ نمبر: ____________________

نوٹ: اپنا کوپن ہمیں فوراً ارسال کریں، ہم آپ کے منتظر ہیں

یہ ہی ایک جملے میں اس کی مکمل تعریف ہے۔
ھ :بہت پیار افشاں تم اسلام آباد جیسے خوبصورت شہر سے آئی ہو تو ہماری مہمان خاص بھی تو ہوئی نا لیکن اب دوشیزہ کے لیے تمہارا قلم رکنا نہیں چاہیے کہ اب تو دوشیزہ ہر ماہ چل کر خود تمہارے گھر آئے گی۔
✉ : گلستان جوہر کراچی سے ریحانہ مجاہد ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس السلام و علیکم دوشیزہ ملا پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا ٹائٹل سے لے کر آخری صفحات تک لاجواب۔ افسانوں کا انتخاب بھی بہت اچھا رہا خاص طور پر آپ کے افسانے نے تو دل چھو لیا اسی طرح اگلے شمارے کا بھی انتظار رہے گا۔
ھ :اچھی ریحانہ لگتا ہے اس بار تم جلدی میں آئی ہو تبصرہ بھی ادھورہ ادھورہ سا ہے کبھی اس خوبصورت محفل میں اطمینان سے آ کر بیٹھو گھر کے سارے کام نمٹا کر۔ ٹھیک ہے نا۔
✉ :کراچی سے ندیا مسعود اپنے تبصرے کے ساتھ ہماری محفل کی مہمان بنی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ ڈاکیے نے جب دوشیزہ لا کر ہاتھوں میں تھمایا تو سب سے پہلے ٹائٹل نے ہی دل خوش کر دیا سارے ہی افسانے اچھے تھے صفائی کی مہک اور کیسی یہ تنہائی نے دل کو چھو لیا تمہارا افسانہ ''اک ستم'' اور میں رشتوں کی کڑواہٹ سب ہی نے محسوس کی ہو گی دوشیزہ گلستاں میں سب ہی کچھ اچھا تھا خاص طور پر لطیفے بہت پسند آئے اتنا پیارا رسالہ نکالنے پر تم سب لوگوں کو دعائیں اور مبارک باد۔
ھ : پیاری ندیا خوش رہو! اور ایسے ہی ہماری دوشیزہ کے لیے تبصرے بھیجتی رہو۔
✉ :انزاء نقوی آج پہلی بار کراچی سے ہماری محفل میں آئی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ آپی السلام وعلیکم سب سے پہلے آپ کو بہت بہت مبارک ہو ماہنامہ دوشیزہ کا ایڈیٹر بننے پر۔ میں نے آپ کا افسانہ ایک ستم اور پڑھا جیسے جیسے میں پڑھتی جا رہی تھی ویسے ویسے میرا Suspance بڑھتا جا رہا تھا بہت زبردست End لکھا ہے As a Wraiter آپ میں وہ کوالٹیز ہیں جو ایک لکھنے والے میں ہوتی ہیں اور میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ نئے لہجے نئی آوازیں میں میری غزل ''کاش حقدار کو اس کا حق دلا دیں ہم لوگ'' کے ذریعے میرا نام بھی دوشیزہ کے صفحات پر آ گیا غزل شائع کرنے کا بہت شکریہ اب میں بھی دوشیزہ کی مکمل قاری بن گئی ہوں میری جانب سے دوشیزہ کے تمام اسٹاف مینجمنٹ کو دعائیں اور سلام۔
ھ : پیاری سی انزاء تمہاری محبت اور پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ اور انشاءاللہ تمہارا نام دوشیزہ کے صفحات میں جگمگاتا رہے گا۔ کیوں کے ہم باصلاحیت لوگوں کی قدر کرنا جانتے ہیں ایسی ہی پیاری غزلیں بھیجتی رہنا۔
✉ :ہماری صبوحی کاظمی کراچی سے لگتا ہے بڑی جلدی میں آئی ہیں۔ ہیلو کیسے ہیں آپ سب دوشیزہ کے چاہنے والوں کو ہمارا اسلام اللہ دوشیزہ کی جگمگاہٹ کو ہمیشہ جگمگاتا رہے دوشیزہ کا نکھار اور بڑھتا جائے رضوانہ پرنس کی دوشیزہ میں آمد دیکھ کر ہمارا خواب غفلت میں سویا ہوا ذہن اور قلم جاگ اٹھا ہم کوشش کریں گے دوشیزہ سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھیں۔
ھ :صبوحی جی کبھی اطمینان سے اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ بھی تو آیئے نا۔
✉ :فریدہ فری یوسف زئی لاہور سے ہماری محفل میں رونق بکھیرنے آئی ہیں۔ پیاری رضوانہ پرنس جی السلام وعلیکم، مارچ کا دوشیزہ ملا مگر بہت ہی دیر سے۔ ٹائٹل بہت ہی دلکش تھا اور ساتھ ہی ہم

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

مارچ 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

"گیٹ وے آف لو" صدف آصف

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ اپریل 2015

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

حیران بھی ہوئے کہ اتنے پیار سے ہمیں جواب کس نے دیا ہے اور پھر نام پڑھ کر حیران رہ گئے یہ تو ہماری پیاری رضوانہ پرنس ہیں دل خوش ہو گیا۔ اک ستم اور رضوانہ جی کا ناولٹ پڑھ کر دل بے حد خوش ہوا پڑھ کر مزہ آ گیا خوش رہو۔ مکمل ناول رحمن رحیم سدا سائیں اُم مریم کا سلسلے وار ناول بے حد شاندار جا رہا ہے افسانوں میں کیسی تنہائی روبینہ شاہین کا اور صفائی کی مہک بہترین تحریریں تھیں آنگن میں بارات پڑھ کر اچھا لگا حکیم جی کا سلسلہ بے حد اچھا ہے آج کل ہم بہت ہی بیمار ہیں بس آپ سب کی دعائیں چاہتے ہیں سب کو دعا اور سلام خاص کر رضوانہ جی۔ نسیم نیازی اور زمر کو بے حد دعا اور سلام۔ یاسمین اقبال ہماری شاعری پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

ﷺ: فریدہ بھئی! ہم تو پریشان ہو گئے ہیں آپ کا خط پڑھ کر اللہ ہماری فریدہ کو جلد از جلد صحت یاب کرے اور آپ کی شاعری ایسے ہی دوشیزہ کو جگمگاتی رہے امید ہے آئندہ آپ کا خط آپ کی صحت یابی کی نوید لے کر آئے گا۔

✉: کراچی سے نسیم سحر ہمیں لکھتی ہیں السلام علیکم اللہ آپ لوگوں کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے آمین۔ جنوری کی سالگرہ نمبر پہ شاید ذرا سی تنقید ہو گئی تھی اور جو مزاج یار پہ گراں گزری۔ لیکن باخدا فروری کا سالگرہ نمبر 2 سپر ڈپر ہٹ رہا یہ بالکل سچ ہے ساری کہانیاں لاجواب رہیں رفعت سراج کے ناول نے رنگ جما دیا پہلی قسط سے ہی۔ دردانہ نوشین بھی بہت اچھا لکھتی ہیں میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دو کوڑی کی عورت دردانہ نوشین نے ہی لکھا تھا؟ اور اگر وہ مجھے پڑھنے کو مل جائے تو شکر گزار ہو جاؤں گی اگر آپ کے پاس نہیں دو دردانہ نوشین صاحبہ خود سے مہربانی فرما دیں (میں ڈاک کا خرچ دے دوں گی) فرحت کا ''الٹا سیدھا'' بہت اچھا رہا کاش آج کل کی مائیں بھی اپنے بچوں کی تربیت ایسے ہی کریں کہ وہ اپنا گھر بنا اور بچا سکیں اتالیق اعظم اور مکلی سے بہشت تک کے سب ہی افسانے خوب رہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ سے ہی بہترین ہوتا ہے اب آپ کی ذمہ داریوں میں رضوانہ صاحبہ بھی شامل ہیں اور یقیناً بہترین طریقے سے ذمہ داریوں سے عہدہ برا بھی ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمت طاقت اور صحت کے ساتھ زندہ رکھے (آمین) آخر میں اپنی کہانیوں کے بارے میں بھی پوچھنا تھا کہ کب تک شائع ہو گی؟'' ہاہاہا پلیز جواب ضرور دیجیے گا اگر نا قابل اشاعت ہیں تو بھی بتا دیں تاکہ بے چینی ختم ہو جائے خاص کر ''انہونی'' کے بارے میں۔ مارچ کا شمارہ مل چکا ہے دلشاد کا ''مٹی کی قسمت'' بچارے گاؤں کے کلچر کو واضح کر رہا تھا ایڈیٹر صاحبہ بھی اچھا لکھتی ہیں صدف آصف کا بہت ہی پرانا موضوع تھا زیادہ مزا نہ آیا فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

ﷺ: پیاری سحر تمہارے پہلے سوال کا جواب تو دردانہ ہی دے سکتی ہیں اور جناب ہم نے تمہاری تنقید کا ذرا سا بھی برا نہیں منایا کہ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے گھر والوں سے کہہ دو تمہارا افسانہ اگلے ماہ آ رہا ہے خوش؟

✉: فرح انیس کراچی سے لکھتی ہیں السلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہو گا اور دعا کرتی ہوں رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا کرم کرے (آمین) دوسری بار دوشیزہ کے شمارے میں

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

خط لکھ رہی ہوں ایسی کیا ناراضگی کہ میرا خط فروری کے شمارے میں شائع نہیں کیا چلیں کوئی بات نہیں اب کہ ضرور جگہ دیجیے گا ہمیں بھی احوال میں فروری کا شمارہ کافی طویل انتظار کے بعد ملا طلعت اخلاق اور بینا عالیہ کی والدہ کی اللہ مغفرت فرمائے آمین اُم مریم کا ناول کافی دلچسپ مرحلے طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے معصومہ منصور کا افسانہ ایثار قربانی کا خوبصورت سبق دے گیا باقی افسانے اچھے رہے شاعری زبردست تھی میرا خط اپریل کے شمارے میں لگا دیجیے گا کیوں کہ مارچ کا شمارہ ابھی نہیں ملا اور ہاں میری بھیجی ہوئی دو تحریروں کا کیا ہوا جواب ضرور دیجیے گا زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

ج: ڈیئر فرح! محفل میں خوش آمدید اور ہم آپ سے کیوں خفا ہوں گے بھلا ایسا سوچیے گا بھی مت آپ کی تحریریں کاشی چوہان کے پاس ہیں جو سچی کہانیاں میں لگیں گی۔

✉: تسنیم ماپارا ڈیفنس کراچی سے پہلی بار تشریف لائی ہیں۔ میں دوشیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور جب سہام مرزا مرحوم زندہ تھے تو اس زمانے میں دوشیزہ ایوارڈ کے فنکشن میں بھی میں نے شرکت کی ہے آج بہت عرصے کے بعد ایک بار پھر میں دوشیزہ کو یاد کر رہی ہوں اور دوبارہ اس حسین دوشیزہ سے رابطہ جوڑنے کا کریڈٹ شاید آپ کو بھی جاتا ہے رضوانہ۔ میری دعا ہے کہ منزہ سہام کی زیر ادارت ان کی دوشیزہ کا حسن ہمیشہ قائم و دائم رہے گا اور آپ لوگوں کی محنت کا صلہ آپ لوگوں کو ملتا رہے۔ رائیٹرایک گیٹ ٹوگیدر میں منزہ سے میری ملاقات ہو چکی ہے لیکن شاید اب انہیں یاد نہیں ہو۔

ج: بہت پیاری تسنیم! محفل میں ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اتنے عرصے بعد دوشیزہ سے ناطہ جوڑا ہے تو اب اسے توڑیے گا نہیں منزہ کو یقیناً وہ ملاقات یاد نہیں ہوگی لیکن ہم جلد ہی ایک خوبصورت ملاقات کا اہتمام اپنے قارئین کے ساتھ کرنے والے ہیں سو تیار رہیں۔ آئندہ آپ کے تبصرے کا بھی انتظار رہے گا۔

✉: سلمی غزل نے کراچی سے لکھا ہے۔ خوش رہیں ایک افسانہ ارسال ہے یہ وہ افسانہ ہے جو 16-7-2013 کو بھیجا تھا مجھے فون کر کے کہا گیا تھا کہ عنقریب چھپ جائے گا اور افسانے بھی تھے ان کی فوٹو اسٹیٹ نہیں کروائی تھی اس لیے نئے سرے سے لکھنے کا سوچنا پڑے گا اس افسانے کی کاپی تھی اس لیے مجھے صرف فیئر کرنا پڑا امید ہے جلد ہی دوشیزہ یا سچی کہانیاں میں جگہ مل جائے گی اور پھر اس کی کاپی بھی تو یقیناً آپ بھیجیں گے۔ منزہ کیسی ہیں آپ کا کیا حال ہے طارق روڈ والا آفس تو میں نے دیکھا تھا اور دو مرتبہ آئی بھی تھی مگر اب ڈیفنس شفٹ ہو گئے پتا ہی نہیں چلا کیوں کہ پراسرار حویلی تو میں نے پرانے پتے پر بھی بھیجی تھی۔

ج: پیاری سلمی! آپ کا افسانہ مل گیا ہے انشاء اللہ بہت جلدی لگ بھی جائے گا اور یہ ٹالنے والی بات نہیں ہے۔ پچھلی بار کی طرح آپ کو انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور ہاں آپ کا دوسرا مسئلہ تو اس کے لیے براہ راست کاشی کو فون کریں۔

✉: کراچی سے تمثیلہ زاہد بھی ہماری مہمان بن کر محفل میں تشریف لا رہی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس صاحبہ السلام وعلیکم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی فروری کا دوشیزہ نہیں ملا مارچ کے دوشیزہ میں آپ کا جگمگاتا نام پڑھ کر جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے کھٹ موبائل پکڑا اور جھٹ دوشیزہ کا نمبر ڈائل کر کے اپنے

دل وسماعت کو مکمل یقین دہانی کروائی کہ ''ہن تسی آ گئے ہو'' (اب آپ آ گئی ہو) آپ کو بہت بہت مبارک ہو اس نئے اضافے سے ۔یقیناً دوشیزہ پر جو نکھار آئے گا اس کا مجھے واثق یقین ہو گیا ہے دوشیزہ ایوارڈ تقریب میں آپ کا اپنائیت بھرا انداز میں بھول نہیں سکتی آپ کو پھر ایک بار خوش آمدید۔صدف آصف ویل ڈن ناول محبت سے گندھے جذبوں سے مزین اچھا لگا اک ستم اور میں ہر معاشرتی اور نفسیاتی مسئلہ بیٹے کی پیدائش پر دلوں کا مرجھا جانا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں ہرگز شیوا نہیں دیتا لیکن یہ ایک ایسا Fact ہے جو بہت عام ہے سب سے بڑھ کر ماں باپ کی وفادار اور حساس جتنی لڑکیاں اور بیٹیاں ہوتی ہیں ویسے ویسے بیٹے بہت کم ہوتے ہیں بہر حال نعمان اسحاق کا ناولٹ اچھا تھا افسانے تمام اچھے تھے ابھی کچھ تحریریں پڑھنی باقی ہیں اب اجازت چاہوں گی آخر میں پھر اک بار آپ کو یاد دہانی کروادوں کہ 15 فروری 2013 کو میرا ناولٹ ''راہیں محبت کی'' بھیجا تھا جس کا اب تک کچھ پتا نہیں اگر جلد اشاعت میں جگہ مل جائے تو مہربانی ہوگی۔خدا حافظ

ٹھ: پیاری سی تمثیلہ اپنائیت انہی لوگوں سے محسوس ہوتی ہے جو اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور اگر تم انہی لوگوں میں سے ہو تمہاری 'راہیں محبت کی'' یقیناً دوشیزہ کی زینت بنے گی بس تھوڑا انتظار کرلو ہم جلد ہی ناولٹ نمبر لا رہے ہیں۔

✉: مومنہ بتول کا محبت سے مہکتا خط آیا ہے کراچی سے۔جان عزیز...... رضوانہ پرنس صاحبہ میں آپ سے بالمشافہ کبھی نہیں ملی آمین لہذا مجھے معلوم نہیں آپ میری محترم ہیں یا عزیز من پیاری پیاری کا منی لہذا آپ کو مخاطب کرنے میں کچھ پس وپیش ہو رہی ہے بہتر ہے آپ وضاحت کردیں آپ کی محفل میں آپ کا انداز بہت دلنشین لگا محبت بھرا محبتوں کی ڈور میں سب کو باندھتا ہوا لہذا خط لکھنے کا خود بخود دل چاہا حالانکہ دوشیزہ (مین سٹی) میں 19 کو ملا ابھی تک پڑھا نہیں...... پھر تبصرہ......!یہ آپ کو شناسائی کی رسید کے طور پر محبت بھرے یقین کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں آپ نے میرے افسانے ''چاچی بانوری'' آنچل میں چھپالو، سودا، محبت تیز گام اور ابھی ایک دو دن پہلے لکھا افسانہ ایک تھی چڑیا پوسٹ کروایا ہے برائے کرم آپ کاشی سے مشورہ کر کے اپنی صوابدیدہ کے مطابق ان تحریروں کو مطالعہ کرکے مجھے بتادیں کہ کب شائع ہوگا تاکہ سکون سا ہو جائے گا مزید یہ کہ ''بلیک ڈے'' سانحہ پشاور پر ایک عظیم ماں مجسم نہ سہی پر تیرے پاس ہوں بھیجی تھی آپ اسے ٹائٹل پیج یعنی شروع کے صفحات پر شائع کریں کیوں کہ ہر ماں کے دل کی آواز ہے آپ جواب ضرور دیں میں منتظر رہوں گی اور ہاں آپ نے یہ جو نیا سلسلہ قاری کا ملاقات کے لیے جو پروگرام بنایا ہے کیا میں اور میری بیٹی شریک ہو سکتے ہیں کیونکہ میں ادبی لوگوں سے ملنا اور ایسی تقریب میں جانا چاہتی ہوں مجھے آپ سے اور ادب سے متعلق ہر فرد سے ملنے کا اشتیاق ہے یہ ایک عرض ابھی نہ سہی پھر کسی تقریب میں سہی مگر آپ مجھے یاد رکھنا میں جوابی لفافہ پوسٹ کر رہی ہوں چند سطروں میں جواب دینا آپ کا یہ مجھ پر قرض ہے اگر آپ جواب نہ دے سکیں تو پلیز ان نمبر پر کال کرلیں یا پھر میں کال کرلوں،اٹینڈ ضرور کریں۔

ٹھ: پیاری سی مومنہ بتول: ہمارے اور آپ کے درمیان تو محبت سے گندھا ایک بہت ہی خوبصورت تعلق ہے سو اسی حوالے سے چاہے ہمیں دوست سمجھ لو آپی یا باجی کہہ دو ہمیں کسی بھی رشتے پر اعتراض نہیں اور ہاں

تقریب تمہارے بنا تو سونی لگے گی انشاء اللہ جیسے ہی اس کا انعقاد کریں گے تمہارا آنا لازمی ہوگا باقی باتوں کے لیے ہمیں کال کرلو۔

✉: عادل حسین اپنے تبصرے کے ساتھ کراچی سے تشریف لائے ہیں مارچ کا دوشیزہ اپنی روایتی آب وتاب کے ساتھ جلوا گر ہوا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا کاشی بھائی عورت کی جو سچی تصویر آپ نے پیش کی وہ ہمارے دل کی بھی آواز ہے زادراہ دل کو ہمیشہ کی طرح منور کر گیا دوشیزہ کی محفل کے تو کیا کہنے جہاں پرانے لوگوں کے ساتھ نئے لوگ بھی محبتیں لٹا رہے ہیں صنم سعید سے ملاقات بھی اچھی رہی اور ہر دل عزیز فنکار جناب محمد علی صاحب پر مضمون بھی معلومات میں اضافہ کر گیا افسانے بہت خوبصورت رہے تھے دلشاد نسیم صاحبہ اس بار بھی بازی لے گئیں کیا خوبصورت افسانہ پیش کیا ہے جسے حقیقت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا نزہت جبیں ضیاء صاحبہ کی بے نام مسافتیں بس سو سو رہا ہے کیسی ہے یہ تنہائی روبینہ شاہین جی کا ایک اچھا افسانہ تھا معاشرتی رویوں کا عکاس تحسین انجم انصاری صاحبہ کا خوشبو کی مہک بھی ایک بہترین افسانہ تھا۔ خیال کی طرح اظہار بھی خوبصورت تھا نعمان اسحٰق کا ناولٹ بھی اپنے انجام کو پہنچا صدف آصف صاحبہ کا گیٹ وے آف لو خوبصورت لگا گوکہ کہانی وہی ساس نندوں کے جھمیلوں کی تھی مگر پیش بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا دل تا آخر سب ہی ٹھیک رہا تیرے عشق نچایا اور رحمن رحیم سدا سائیں بھی بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں پڑھنے والے کو اگلی قسط کے انتظار پر مجبور کردیتے ہیں رفعت سراج صاحبہ کا دام دل بھی اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر چکا ہے انتخاب خاص اس بار بھی زبردست رہا پڑھ کر مزہ آ گیا ہو خالہ بھی اچھا لگا باقی تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب چل رہے ہیں شاعری کے صفحات میں کچھ اضافہ ہو جائے تو اچھا ہے اب دو صفحات کم لگتے ہیں تمام لکھنے والے اور پڑھنے والوں کو سلام اور دعائیں اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو معافی کا طلبگار ہوں۔ بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ

ج: عادل صاحب محفل میں اتنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ آنے کا بہت شکریہ امید ہے آئندہ بھی آتے رہیں گے رائیٹرز کو ایسے ہی تبصروں کا انتظار رہتا ہے۔

✉: خولہ عرفان اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ ہماری محفل میں بیٹھی نظر آرہی ہیں۔ محترمہ رضوانہ صاحبہ پہلی دفعہ اس قلم کو آپ سے ہمکلام ہونے کا موقع مل رہا ہے اس امید کے ساتھ کہ جس طرح کاشی چوہان اپنے جوابات سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے آپ بھی ان سے پیچھے نہیں رہیں گی بلکہ مارچ کا شمارہ پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ ان ہی کے ہم قدم ہیں ماشاء اللہ۔ اب رسالے کی طرف آتی ہوں مارچ کا شمارہ میرے ہاتھوں میں اس وقت آیا۔ جب سترہ مارچ کا سورج انتظار کی گھڑیوں کو طے کرتا ہوا مغرب میں ناراض ہو کر چھپ چکا تھا مطالعہ کا موقع بیس مارچ کو نصیب ہوا اب تبصرے کے لیے بیٹھی ہوں تو چوبیس مارچ کا سورج آب و تاب سے چمک رہا ہے اور ماہ مارچ کے گذرنے کی خبر دے کر ہاتھ ہلا رہا ہے کہ ابھی خط لکھنا ہے تو لکھو ورنہ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک اس لیے قلم سنبھال لیا ہے دلشاد نسیم صاحبہ کا ”مٹی کی قسمت“ بہت عمدہ ماشاء اللہ شہد میں ڈبو کر خنجر مارا ہے بقول میرے

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ
ہم شکل
ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔
''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''
کیا یہ روایت دُرست ہے؟
اسی روایت کی کھوج میں موت سے پنجہ کش اُس سرکش نوجوان کی
ناقابلِ فراموش داستان......
کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟
کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟
ایک انوکھی داستان...... جو ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں دھوم مچا رہی ہے
آپ بھی پڑھنا مت بھولیے اور ناول ہم شکل کا حصہ بن جایئے

آہ بھی نہیں نکلی اشک بھی نہیں آئے
تیر کیا نشانے پر ٹھیک جا کے بیٹھا ہے!

نزہت صاحبہ کا افسانہ ''بے نام مسافتیں'' معاشرے کی عکاسی کرتا ہے ہلکی پھلکی تحریر کے ساتھ اچھا لگا رضوانہ پرنس یعنی آپ کا ''ایک ستم اور'' اور روبینہ شاہین صاحبہ کا ''کیسی ہے یہ تنہائی'' حقیقی رشتوں کے ایسے زہریلے رویوں کی کہانی ہے جو انسانی رشتوں کا ناسور ہوتے ہیں۔ موضوع کی سفاکی کے باوجود کہانی اور انداز تحریر دونوں اچھے تھے تحسین انجم انصاری کا ''صفائی کی مہک'' مختلف انداز میں اچھی تحریر تھی نعمان اسحٰق صاحب کا ''میرے پرندہ دل'' کا اختتام کچھ بے تاثر سا رہا البتہ غزل اچھی تھی انتخاب خاص خاص ہی ہوتا ہے یعنی گراموفون بہت بہت اچھا رہا ماہ مارچ میں روشن خیال کاشی صاحب کا عورت کی عظمت دلوں میں اجاگر کرتا اداریہ بھی بہت عمدہ تھا جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو محترمہ رضوانہ جی میری رائے یہ کہتی ہے کہ تحریر تو معاشرے کا آئینہ دار ہوتی ہے مصنف تو ان کو لفظوں کے لباس سے آراستہ کرتا ہے اور جیسا دیس ویسا بھیس ہو تو چار چاند لگ جاتے ہیں میرے نزدیک سب مصنفین اور ان کی تحریریں قابل احترام ہیں کہ وہ اپنا قیمتی وقت غیر محسوس طریقے سے معاشرے کی اصلاح کے لیے وقف کرتے ہیں کاشی صاحب اور رضوانہ جی وہ آنکھیں اور وہ ہاتھ قابل احترام ہیں میرے لیے جو اپنے خیال اور خواب سے اوراق کو سیراب کرتے ہیں اور لفظوں کو کاشت کرکے کہانیوں اور افسانوں اور ناولوں کی فصل بہار دیتے ہیں اتنے بڑے لوگوں پر میں کیا تنقید کرسکتی ہوں اللہ ان آنکھوں اور ہاتھوں کو سلامت رکھے آمین جو بھی رائے ہے آپ کے سامنے حاضر ہے ایک غزل ارسال کر رہی ہوں عزت بخش دیجیے گا فی الحال ماہ مارچ کے شمارے کا جتنا مطالعہ کیا اس کا تبصرہ حاضر ہے باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔

٭: بہت پیاری خولہ! دوشیزہ کو ایسے ہی مکمل تبصرے اچھے لگتے ہیں لیکن دوست تنقید کرنا کوئی بری بات نہیں ہوتی رائیٹرز ہمارے لیے بہت ہی قابل احترام ہیں لیکن مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے اگر آپ کو کسی تحریر میں کوئی خامی نظر آئے یا آپ کو اختلاف ہو تو بلا جھجک لکھ دیا کریں تب ہی تو دوشیزہ کا معیار بڑھے گا آپ کی غزل شائع ہو رہی ہے مٹھائی کدھر ہے۔

✉: لاہور سے رضوانہ کوثر کا محبت بھرا تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے لکھتی ہیں ماہ مارچ کا دوشیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت میرے ہاتھوں میں موجود ہے۔ سب سے پہلے تو رضوانہ آپ کو میرے خط کا اتنا خوبصورت جواب دینے پر شکریہ۔ کاشی کا اداریہ ماہ مارچ اپنے اندر بہت گہرائی لیے ہوئے تھا زادراہ سے ہوتے ہوئے محفل تک پہنچے۔ سب اپنوں کے خطوط دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ س سے سوال میں صنم سعید سے ملاقات نے مزہ دیا۔ اس بار منی اسکرین غائب تھا اور سلور اسکرین اِن۔ آنگن میں بارات میں اس بار رضیہ زمان کی پوتی کی شادی کا احوال پڑھ کر دل خوشی اور غم کے احساسات سے نم رہا۔ رفعت سراج کا نیا ناول دام دل زبردست ثابت ہو رہا ہے۔ رفعت سراج نے دوسری قسط میں کمال کر دیا۔ ایمن اور چمن دونوں کے سسرال پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور پڑھتے ہوئے ہم خود کو ان ہی گھروں میں محسوس کرتے ہیں۔ بینا عالیہ کے ناول تیرے عشق نچایا کی سترہویں کڑی بھی خوب رہی
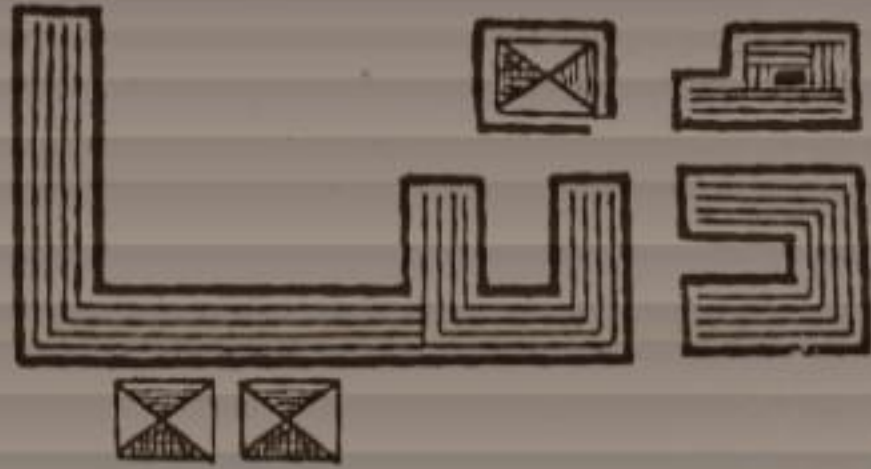
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا ——— اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

رحمٰن رحیم سدا سائیں میں اُم مریم نے جہاں ساری گتھیاں سلجھادیں وہیں ناول کے اختتام میں جب پڑھا کہ اگلے ماہ سے ناول نیا موڑ لے رہا ہے تو تجسس اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ دیکھیے اب مریم اس ناول کو کیا نیا موڑ دیں گی۔ نعمان اسحٰق کا پرندہ دل بلآخر اپنے ٹھکانے پر پہنچ ہی گیا۔ صدف آصف کا مکمل ناول گیٹ وے آف لو بہت زبردست تھا۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ ''اک ستم اور'' بھی پڑھ کر مزہ آیا افسانوں میں دلشاد نسیم کا مٹی کی قسمت بہت زبردست تھا۔ نزہت جبیں ضیاء کا بے نام مسافتیں روبینہ شاہین کا کیسی ہے تنہائی اور تحسین انجم انصاری کا صفائی کی مہک بھی اچھے تھے۔ انتخاب خاص میں گراموفون نے سماں باندھ دیا۔ رنگ کائنات کی جلو خالہ بھی کمال تھیں اس کے علاوہ دوشیزہ میگزین کے تمام مستقل سلسلے اپنی مثال آپ ہیں۔ جس کے لیے آپ لوگ داد کے مستحق ہیں۔ چلیے تبصرہ تو اختتام کو پہنچا اب کچھ اپنی بات ہو جائے۔ آج کل میری طبیعت بہت خراب ہے میری اپنے پیاروں سے درخواست ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کریں۔ اب تبصرے کا دی اینڈ کرتی ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

ج: بہت پیاری رضوانہ اللہ جلدی آپ کو صحت یاب کرے صرف ہم ہی نہیں ساری محفل کے مہمانوں کے ہونٹوں پر بھی یہی دعا ہے۔

★ فوزیہ احسان رانا کی حاصل پور سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں مارچ کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل بہترین تھا۔ کاشی بھائی آپ کے ساتھ اب ایک اور ایڈیٹر صاحبہ رضوانہ پرنس بھی آ گئی ہیں۔ امید ہے آپ دونوں مل کر دوشیزہ کا معیار اور بلند کریں گے۔ رضوانہ جی کو خوش آمدید، امید ہے آپ بھی ہمارے ساتھ مکمل تعاون کریں گی۔ کاشی بھائی کا ''ماہ مارچ'' ان کی سوچ کا عکاس تھا۔ محفل کی باگ دوڑ رضوانہ جی کے ہاتھ میں ہے۔ رضوانہ جی ذرا خیال سے...... ہم بڑی دور سے دوشیزہ کی محبت میں حاضر ہوتے ہیں اس لیے اپنی قینچی کو ہمارے تبصرے سے دور رکھیے گا۔ خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ اپنی فیورٹ رائٹر رفعت سراج ٹھہری ہیں۔ دام دل زبردست ناول شروع ہوا ہے۔ اور رفعت سراج نے آتے ہی اپنی دھاک بٹھادی ہے۔ بینا عالیہ کا ناول ٹھیک ہے۔ اُم مریم رحمٰن رحیم سدا سائیں میں کمال کر رہی ہیں۔ مریم میری طرف سے اس شاندار ناول کی کامیابی پر بہت بہت مبارک باد قبول فرماؤ۔ نعمان اسحٰق کا میرے پرندہ دل بھی بہتر تھا۔ نعمان کو ابھی مزید محنت کرنا ہوگی۔ دلشاد نسیم، نزہت جبیں ضیاء، روبینہ شاہین، اور تحسین انجم انصاری کے افسانے بھی اچھے تھے۔ کاشی بھائی آپ کی اور رضوانہ جی کی خدمت میں ڈھیروں دعائیں اچھا اب اجازت دیں۔ ارے اجازت سے پہلے یہ تو بتا دیں میرا انتظار کب ختم ہوگا۔ میرے ناولٹ کی باری کب آئے گی۔ پلیز کچھ خیال کریں اب تو بہت عرصہ گزر گیا۔ امید ہے میری بات کا برا نہیں منایا جائے گا۔ خدا حافظ۔

ج: اچھی فوزیہ خوش ہو جائیں اس ماہ سے آپ کا ناولٹ شروع ہو رہا ہے اب بتائیے محفل کے مہمانوں کو مٹھائی کی ٹریٹ کب مل رہی ہے۔

ساتھیو! اب اس دعا کے ساتھ آپ سے اجازت چاہیں گے کہ اللہ آپ سب کو ہمیشہ اپنی مہربان پناہ میں رکھے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اسی محفل میں ملاقات ہوگی، آنا نہ بھولیے گا۔

☆☆......☆☆

آپ کی دعاؤں کی طالب
رضوانہ پرنس

آر اے

مدیرۂ اعلیٰ منزہ سہام مرزا کی پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج میں تقریبِ تقسیمِ انعامات میں بطور مہمانِ اعزازی شرکت کا مختصر احوال
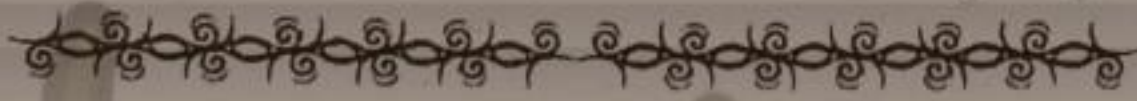
جیسے ہی پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج کی طالبات نے سنا' ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیاں' کی سرپرست اعلیٰ آرہی ہیں تو سب میں ہلچل مچ گئی ان کا انتظار ہر طالبہ بے چینی سے کر رہی تھی۔ بار بار انچارج پروگرام الماس روحی سے طالبات تقریبِ تقسیم انعامات کا پوچھ رہی تھیں اور بالآخر وہ تاریخ

پروفیسر راشدہ محترمہ منزہ سہام مرزا کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

اور وہ دن آ ہی گیا۔ تین مارچ بروز منگل طالبات بہت پر جوش تھیں۔ منزہ سہام مرزا کے بارے میں جان کر اساتذہ کو بھی ان کا انتظار تھا۔ ''کانچ کی عورت'' اور اُجلے حروف کی مصنفہ

ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں' کی مدیرا علیٰ محترمہ سہام مرزا کالج کی پرنسپل محترمہ عفت بانو اور سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ پرویز کے ہمراہ طالبات میں انعامات واسناد تقسیم کرتے ہوئے

سے سب ملنا چاہتے تھے۔ منزہ سہام مرزا کو اساتذہ نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ ان کا ظاہری اور باطنی حسن انہیں خیرہ کر رہا تھا۔ مدھم آواز اور ٹھہراؤ کے ساتھ گفتگو کے فن سے آشنا منزہ سہام مرزا دیکھنے اور سننے والوں کے دل میں اتر گئی تھیں۔ چائے پر ادبی سماجی اور معاشرتی موضوع پر منزہ سہام کی اساتذہ

طالبات کو ان کے قریب لا رہی تھی۔ طالبات نے ان کے ساتھ نمائش میں تصویریں بنوائیں۔ منزہ سہام مرزا نے طالبات کے بنائے ہوئے پوسٹرز اور پروجیکٹ کو سراہا۔ ہجوم میں گھری منزہ سہام کو ہال میں لایا گیا۔ جہاں طالبات کا جمِ غفیر تھا، جو اُن کا منتظر تھا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد اردو کی ہیڈ

محترمہ منزہ سہام مرزا کالج میں منعقدہ پوسٹرز نمائش کو انہماک سے دیکھتے ہوئے، ساتھ میں پرنسپل محترمہ عفت بانو اور انچارج پروگرام محترمہ الماس روحی بھی ہمراہ ہیں

سے گفتگو ہوتی رہی ادھر انچارج پروگرام الماس روحی اور ان کی طالبات، پرنسپل محترمہ عفت بانو کے آفس پہنچیں۔ اس پروگرام کی مہمانِ اعزازی منزہ سہام مرزا اور مہمانِ خصوصی سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ پرویز صاحبہ تھیں جنھوں نے کالج کی بہتری کے لیے نمایاں کام کیے اور یادگار فنکشن ان کے عہد سے منسوب رہے۔ پرنسپلز، اساتذہ اور طالبات کے ہجوم میں منزہ سہام مرزا نے پوسٹرز نمائش کا ربن کاٹ کر افتتاح کیا۔ طالبات خوبصورت سی منزہ سہام کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ اجلی اجلی اور پُروقار شخصیت

آف دی ڈپارٹمنٹ محترمہ ذولیخا ذریں صاحبہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور محترمہ منزہ سہام مرزا کو ”کالج کی گڑیا“ سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر راشدہ نے محترمہ منزہ سہام مرزا کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔

انچارج پروگرام محترمہ الماس روحی صاحبہ نے سال بھر وقتاً فوقتاً طالبات میں مقابلے منعقد کروائے تھے۔ یہ مقابلے پوسٹرز، کہانی، کارڈز، افسانے، اور ریسیپی پر مشتمل تھے۔ ان مقابلوں میں جیتنے والی طالبات کو انعامات دینے کے لیے محترمہ منزہ سہام

مرزا پرنسپل عفت بانو اور سابقہ پرنسپل محترمہ صبیحہ پرویز کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ طالبات منزہ سہام مرزا کے ساتھ تصویریں بناتے ہوئے بہت خوش تھیں۔ انعامات کی تعداد ''اجلے حروف''، ''دوشیزہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیوں'' کی شمولیت سے بڑھ چکی تھی۔ آخر میں محترمہ منزہ سہام مرزا نے پرنسپل عفت بانو، پرنسپل صبیحہ پرویز، جج منٹ کے فرائض انجام دینے پر شاعرہ اور ادیبہ پروفیسر ہما اعظمی، پروفیسر شہناز، تقریب کے مہمانانِ گرامی محترمہ منزہ سہام مرزا، جن کی آمد نے بہار کو پُر بہار بنا دیا تھا۔ محترمہ صبیحہ پرویز جن کے ذوق کو کالج نے ہر موقع پر سراہا۔ پرنسپل عفت بانو جن کی معاملہ فہمی الجھے کاموں کو سلجھا دیتی ہے۔

پروفیسر ہما اعظمی جو ادب دوست ہیں۔ پروفیسر راشدہ اور پروفیسر ثمر جن کے تعاون نے تقریب کو چار چاند لگائے، ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے اختتام کے بعد منزہ سہام مرزا اور اساتذہ کرام

محترمہ منزہ سہام مرزا طالبات کے بنائے گئے پروجیکٹس کو بغور دیکھتے ہوئے

انتظامی امور میں پروفیسر راشدہ اور پروفیسر ثمر کو فہم دین پبلی کیشنز کی جانب سے کتابوں اور رسائل کے تحائف دیے گئے۔

محترمہ منزہ سہام جب طالبات سے مخاطب ہوئیں تو تالیوں سے ان کی ہر بات پر طالبات نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کہانی لکھنے اور عملی زندگی کے گر منزہ سہام نے طالبات کو بتائے۔ آخر میں انچارج پروگرام الماس روحی صاحبہ نے ادارہ فہم دین، پبلی کیشنز اور ادارہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں ڈائجسٹ پرنسپل عفت بانو کے ہمراہ آفس آ گئے، جہاں ٹی پارٹی کا اہتمام تھا۔ گفتگو کا پھر ایک سلسلہ تھا۔ منزہ سہام مرزا نے طالبات کی صلاحیتوں کو سراہا۔ محترمہ الماس روحی کی خدمات کی تعریف کی۔ منزہ سہام مرزا کی گفتگو اساتذہ مزید سننا چاہتے تھے مگر وقت کا پنچھی اڑنے کے لیے پر تول چکا تھا۔ محترمہ منزہ سہام اب رخصتی کی اجازت لے رہی تھیں۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اساتذہ نے انہیں خدا حافظ کہا۔

☆☆......☆☆

سن سے سوال

آج کے کامیاب اور وجیہہ اداکار

شہزاد شیخ

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥:شہزاد شیخ۔

☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥:شہر جی۔

☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥:کراچی۔

☆زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥:لبرا۔

☆علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥: بیچلر کمپیوٹر سائنس اور فلم کے بارے میں کورس کیا ہے۔

☆کتنے بھائی بہن ہیں۔آپ کا نمبر؟

♥:بس ایک چھوٹی بہن ہے۔

☆اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥:بالکل۔

☆اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥: نماز کے لیے وقت نکالنا کیوں کہ شوٹنگ پہ وقت کا پتا نہیں چلتا اور نماز فرض ہے اس لیے سب سے مشکل کام لگتا ہے۔

☆کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

♥:شکر ادا کرتا ہوں فی الحال اللہ نے ہر خواہش پوری کی ہے۔

☆:اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥:ایمانداری میری اچھی عادت ہے۔

☆:اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥:میں بہت سست واقع ہوا ہوں، یہی میری سب سے بری عادت ہے۔

☆کون سا کردار ہے جو آپ ادا کرنا چاہتے ہیں؟

♥:کوئی ایک نہیں بہت سارے کردار ہیں جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔

☆:اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟

♥:اپنی کار۔

☆صبح کا آغاز کس طرح کرتا ہیں؟

♥:ناشتا کر کے۔

☆دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟

♥:رات کا۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: کوئی آپ کی برائی کرے۔ کوئی غلط بات کرے۔ کوئی آپ سے غیر دیانت دار رہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بہت دکھ دیتی ہیں۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: صحت، عزت، محبت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: سمندر کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ زندگی میں ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں اصل میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

☆: خودستائشی کے کس حد تک قائل ہیں؟

♥: ایک حد تک تو خودستائشی کے سب قائل ہوتے ہیں۔

☆: کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

♥: ہاہاہا...... لوگوں کو دکھانے کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن کھالیتا ہوں۔

☆: آپ کی نظر میں خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟

♥: پوری دنیا ہی خدا کی حسین تخلیق ہے۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے

علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥: موت سے سب ڈرتے ہیں۔

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: یہ تو بالکل سچ ہے۔ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔

☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥: مجھے اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پسند ہے۔

☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے قائل ہیں یا تدبیر کے؟

♥: آپ محنت کریں ایمانداری سے، جو آپ کے نصیب میں ہوگا، وہ آپ کو ہر حال میں مل جائے گا۔

☆: ویک اینڈ کیسے گزارتے ہیں؟

♥: سو کر۔

☆: شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟

♥: بس اچانک ہی ایکٹنگ کا شوق ہو گیا تھا۔

☆: وجہ شہرت کون سا پروگرام بنا؟

♥: آگ ٹی وی کے لیے ڈراما سیریل ''ڈریمر'' کیا تھا اور شہرت بھی اسی سیریل میں ملی۔

☆سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟

♥: اپنی سالگرہ کے دن کا...... ویسے تو ہر دن ہی نیا ہوتا ہے۔

☆آپ کی نظر میں بہترین تحفہ کیا ہے؟

♥: امی اور بابا جو بھی تحفہ دیں میرے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔

☆محبت کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

♥: محبت کا اظہار موقع محل کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔

☆ہمارے معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟

♥: اچھی اور بری دونوں ایک ہی ہیں، وہ یہ کہ ہم جذباتی بہت ہیں۔

☆بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟

♥: موویز بہت دیکھتا ہوں۔

☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥: شہرت اچھی چیز ہے۔ لوگ تعریف کرتے ہیں، حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔

☆: کیا آپ اچھے راز داں ہیں؟

♥: پتا نہیں، ویسے آج تک کسی کی بات کسی سے نہیں کی۔ دل دریا سمندروں ڈونگے والی مثال ہے۔

☆: عام لوگوں سے ایک اداکار کی زندگی کتنی مختلف ہوتی ہے؟

♥: قطعی مختلف نہیں ہوتی۔ میں تو خود کو ایک عام انسان سمجھتا ہوں۔

☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥ شیو کے وقت آئینہ دیکھتا ہوں اور ڈریسنگ کے لیے، آئینہ دیکھ کر کبھی سوچتا نہیں ہوں اس لیے خیال نہیں آتا کوئی۔

☆: ''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتے ہیں؟

♥: جو جتنا مستحق ہوتا ہے اسی حساب سے عمل کیا جاتا ہے۔

☆: کس ملک کی شہریت لینا چاہتے ہیں؟

♥: I proud To be Pakistani

ویسے امریکہ کی شہریت ہے میرے پاس۔

☆: زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟

♥: زندگی کبھی بری نہیں لگتی۔

☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥: مطالعہ بہت ضروری ہے۔ مطالعہ آپ کو ہر بار کچھ نہ کچھ نیا ضرور دیتا ہے۔

☆: انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی کس حد تک ہے؟

♥: ان چیزوں سے دلچسپی بہت محدود ہے۔ ویسے بھی بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

☆: کون سا چینل شوق سے دیکھتے ہیں؟

♥: اسپورٹس چینل شوق سے دیکھتا ہوں۔

☆: کس تاریخی شخصیت سے ملنے کے خواہش مند ہیں؟

♥: قاعداعظم سے۔

☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟

♥: پانی کے بغیر سفر ممکن نہیں۔

☆: اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟

♥: بس یہی چاہوں گا کہ میں صبح جلدی اٹھنا شروع کردوں۔

☆: کون سا تہوار شوق سے مناتے ہیں؟

♥: 14 اگست۔

☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گے؟

♥: اپنی زندگی میں ایمانداری کو شعار بنائیں، بس آپ ایک اچھے انسان بن جائیں سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔

☆☆......☆☆

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

اے آر وائی ڈیجیٹل نیٹ ورک پر نشر ہونے والا سوپ ''دلِ برباد'' یہ دو بہنوں ہانیہ اور رانیہ کی کہانی ہے، جن کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور وہ اپنی نانی کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہیں۔ نانی عالیہ بیگم کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے، جس کا تذکرہ وہ اپنے بیٹے شمس سے بھی کرتی ہے اور فکرمند نواسیوں کی وجہ سے۔ شمس کی بیوی فرحت آرا بہت اچھی خاتون نہیں ہیں۔ وہ ان لڑکیوں کو بالکل پسند نہیں کرتی ہیں۔ نانی عالیہ بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ شمس بیوی فرحت آرا کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یہاں سے ہانیہ اور رانیہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ خوبصورت سوپ کو تحریر کیا ہے معروف مصنف نزہت سمن نے جبکہ ہدایت شاہد یونس کی ہیں اس سوپ کے فنکاروں میں سنگیتا، فرح علی، مریم انصاری، انعم تنویر، عمران اسلم اور فضیلہ قاضی قابل ذکر ہیں سوپ ''دلِ برباد'' پیر سے لے کر جمعرات رات دس بجے تک ARY ڈیجیٹل پر دکھایا جائے گا۔

سیریل ''تم سے مل کے'' 21 سالہ ظلِ ہما کی کہانی ہے جو ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے، بچپن میں یتیم ہو جانے کے باعث اپنی تائی اماں کے ہمراہ رہتی ہے اور نانی کے بیٹے سے خاموش محبت کرتی ہے مگر اپنے کزن ہمایوں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ ہمایوں ایک محنتی لڑکا ہے۔ ہمایوں کی ماں اور ظلِ ہما کی تائی نے بیوہ ہونے کے بعد اپنے بچوں کو بہت مشکل سے پالا ہے اور ظلِ ہما سے نوکروں والا سلوک کرتی ہے۔ تائی کے حالات بہتر ہو جانے کے بعد وہ اپنے بیٹے کے لیے ہر ماں کی طرح امیر بہو لانا چاہتی ہے۔ ظلِ ہما تو ایک غریب لڑکی ہے تائی کے

تحریم زبیری، فیروز خان اور سنبل اقبال سیریل 'تم سے مل کے' میں

بیٹیاں ہیں دلشاد بیگم کی طرف سے توجہ نہ ملنے پر چاروں بچے اپنی اپنی سوچ کے مطابق زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بچے کس طرح اپنی زندگی کا معیار پرکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس کا جواب آپ دیکھ سکتے ہیں ہدایت کار محسن مرزا اور مصنفہ میمونہ خورشید کی تحریر کردہ سیریل ''پرورش'' دیکھ کر۔ یہ سیریل ہر منگل کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔

سیریل کے فنکاروں میں اسفر رحمٰن، سدرہ بتول، انعم فیاض، محمود اختر، سندس طارق، صبا فیصل، بابر خان، نوید رضا، فردوس جمال، سیمی پاشا، قابل ذکر ہیں۔

سیریل ''ممتا'' ہر بدھ کی رات 9 بجے دکھائی جائے گی اے آر وائی ڈیجیٹل سے۔

سوپ ''قسمت'' میں اداکارہ میرا مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ جس میں دیورانی اور جیٹھانی کے

سیریل 'ممتا' میں سونیا حسن اور آغا علی

جھگڑوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوپ کو لکھا ہے نادیہ اختر نے جب کہ ہدایت کار شاہد یونس ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ اے آر وائی ڈیجیٹل سے 7 بجے دکھایا جارہا ہے۔

''خدانہ کرے۔'' ہر پیر کی رات 9 بجے دکھائی جارہی ہے۔

☆☆......☆☆
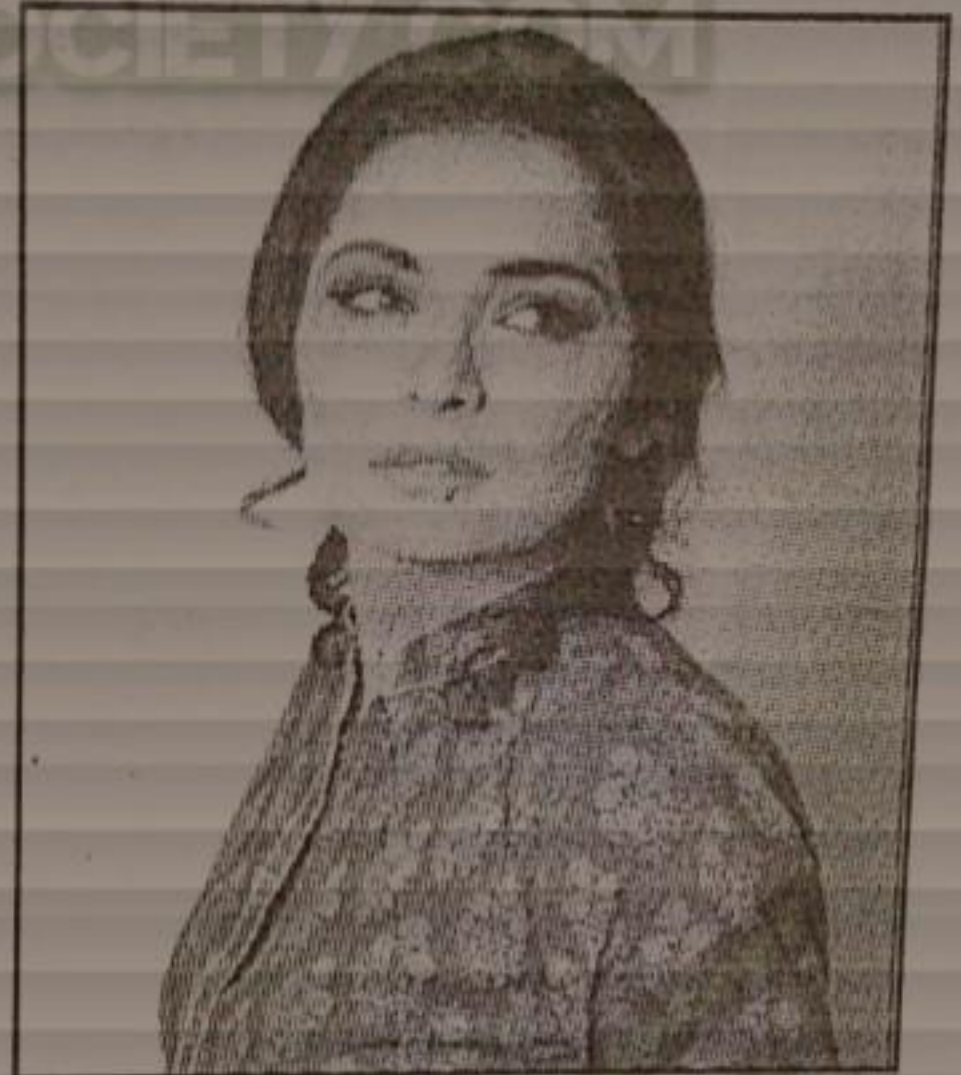
سپر اسٹار میرا سوپ 'قسمت' میں

گھر میں پلتی ہے (تائی کے بیٹے) کے خواب دیکھتی ہے۔ ہمایوں کو دل و جان سے چاہتی ہے جبکہ تائی ہمایوں کے لیے مالدار بہو لانا چاہتی ہے۔ کیا ہمایوں سے ظل ہما کی شادی ہو جاتی ہے؟ ظل ہما کی تائی رابعہ خوشحال گھرانے سے بہو لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب تو سیریل ''تم سے ملے کے'' دیکھنے کے بعد ہی ملے گا۔ اس سیریل کے ہدایت کار فرقان خان ہیں۔ سیریل کو تحریر کیا ہے عنیزہ سید نے جبکہ فنکاروں میں سنبل اقبال، فروز خان، فرح شاہ، تریم زبری، سیمی پاشا، اوز شہریار زیدی شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جاتی ہے۔

سیریل ''پرورش'' کی کہانی اس والدہ کی ہے جس نے شوہر کی کمائی کو اپنی عیاشیوں اور آرام میں ضائع کیا۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، دلشاد بیگم کے شوہر ابراہیم کمال بیرون ملک سے وافر رقم بھجوا رہے ہیں، جس سے روز بروز گھر کے حالات کیا دلشاد بیگم کے جینے کا اسٹائل بھی بدل جاتا ہے۔ جو وقت دلشاد بیگم کو بچوں کو دینا چاہیے وہ وقت اپنی دوستوں میں گزارتی ہیں۔ دلشاد بیگم کے دو بیٹے اور دو

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی تیسری کڑی

چمن بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اصل میں وہ ثمر کے واش روم سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک اچھی خبر بلکہ خوش خبری اسے دن بھر بے چین کیے رہی۔ وہ پل پل گن کر ثمر کے گھر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی

میڈیکل رپورٹ آج آ گئی تھی، اس میں سب سے اچھا ہے کی خوش خبری تھی۔ رپورٹ نے اس کے نسوانی پندار کی بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ ایک مکمل عورت تھی۔ ماں بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ قدرت نے دونوں ہاتھوں سے خزانے اس کی جانب اچھالے تھے۔ وہ محروم نہیں تھی...... اسے ہر دنیاوی نعمت سے نوازا گیا تھا، مگر......

ثمر واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔ چمن کو حالت مراقبہ میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ اُبھری۔

''اللہ رحم کرے...... اکیلے اکیلے مسکرا رہی ہو۔ کل تمہارا چیک اپ کراتے ہیں۔'' ثمر کے شریر جملے نے اسے ایک حسین خیال کے سمندر سے باہر اچھال دیا۔

''چیک اپ تو ہو گیا ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر پُرسکون انداز میں گویا ہوئی۔ ''اور آج رزلٹ بھی آ گیا ہے۔'' وہ بیڈ سے اُتر آئی۔ ثمر ٹاول سے اپنے بال خشک کر رہا تھا۔ اگلے مرحلے میں یہ ٹاول چمن کو پکڑایا جانا تھا۔ چمن اپنی معمول کی ڈیوٹی کے لیے پہلے ہی سے مستعد ہو گئی۔

''کیا کہہ رہی ہے رپورٹ؟ ویسے تو میں رپورٹ کی تفصیلات تمہارے چہرے سے پڑھ رہا ہوں۔'' ثمر نے سر رگڑنے کا آخری راؤنڈ مکمل کیا اور ٹاول چمن کی طرف بڑھا دیا۔

''پھر بھی آپ پڑھ لیں تو زیادہ اچھا ہے۔'' چمن کو عجیب سی بے تابی لاحق ہو چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ثمر خود اپنی آنکھوں سے پڑھ لے کہ اس کی بیوی ایک مکمل عورت ہے۔ قدرت نے اسے ہر طرح سے نوازا ہے۔

''وہ تو پڑھ ہی لیں گے۔ تمہاری زبانی سننے سے زیادہ اچھا لگے گا۔'' ثمر نے ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش چلانا شروع کیا۔ وہ آئینے میں چمن کو بغور دیکھ رہا تھا جو خوشی سے نہال، شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ گویا خود سے اُلجھ رہی تھی۔ الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔

''بھئی...... اتنا تکلف! بتا دو ناں کیا لکھا ہے رپورٹ میں؟'' ثمر نے پیشانی پر آنے والے بالوں کو دو تین پھونکیں مار کر گویا پھونکوں سے ڈرائیر کا کام لیا۔

''I Am Perfect۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی بھی وقت ماں بن سکتی ہوں۔''

''میں تمہیں کیا کہتا تھا کہ فضول میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ چاہے گا اولاد بھی ہو جائے گی۔'' ثمر برش رکھ کر چمن کے قریب چلا آیا اور اسے شانوں سے تھام لیا۔

چمن نے نظریں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت پیار سے چمن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چمن کے پاس اگلی بات بہت متنازعہ تھی اسی لیے وہ الفاظ منہ سے نکالنے سے پہلے تول رہی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ آنکھوں میں اُلجھن کے تاثرات تھے۔

''ارے...... کیا سوچنے لگیں؟ اب کیا مسئلہ ہے۔ خوش رہو، ریلیکس کرو۔'' ثمر نے پیار سے اس کے بکھرے ہوئے ریشمی بال سنوارے۔

''مسئلہ ہے...... ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے ہزبینڈ کا بھی میڈیکل چیک اپ کروالیں۔ یہ بہت ضروری ہے، ہو سکتا ہے......''

''ہو سکتا ہے اس ڈاکٹر کا دماغ خراب ہو۔'' ثمر کو یوں لگا جیسے چمن نے اسے کوئی ننگی گالی دی ہو۔ اس نے چمن کے شانوں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ صاف شفاف آسمان پر اچانک کالی آندھی آنے کے امکانات چھا گئے۔

''ثمر...... یہ پرانے وقتوں میں مردوں کی سوچ ہوا کرتی تھی کہ مرد کو کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ جو کمی ہوگی عورت میں ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ لیکن آج میڈیکل سائنس......'' چمن نے اپنی دانست میں ثمر کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی تھی مگر ثمر نے بڑی درشتگی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''بکتے ہیں سب...... ہر مرد کو اپنا پتا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جب آپ کو یقین ہے تو ایک ٹیسٹ کرانے میں حرج ہی کیا ہے؟'' چمن بھی آج ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی وگرنہ ثمر کے ریش ہونے پر وہ یا تو خاموش ہو جاتی تھی یا دُم دبا کر بھاگ جاتی تھی۔ مگر آج وہ اپنی نظر میں بہت معتبر ہو چکی تھی۔ انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

''کیوں کراؤں میں اپنا ٹیسٹ...... کچھ نہیں ہے مجھے۔ ہمیشہ میرے خوشگوار موڈ کا ستیاناس مار دیتی ہو۔ کیا اب گھر آنا چھوڑ دوں؟ تم نے تو جیسے میری چڑ ہی بنالی ہے۔'' ثمر بری طرح برسنے لگا۔

''اچھا آہستہ تو بولیں۔ امی جان سمجھیں گی پتا نہیں کس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔'' چمن نے نرمی سے ثمر کا بازو تھام کر آہستہ آواز میں کہا۔

''نہیں کروں گا آہستہ آواز میں بات، میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ لپیٹ لپیٹ کر گالیاں دیتی ہو مجھے۔ چاہتی ہو میں خود کو تمہارا مجرم سمجھوں۔ تمہاری خوشیوں کا قاتل محسوس کروں۔ تم مجھے فضول کے احساس جرم میں مبتلا کرنا چاہتی ہو۔ چلی جاؤ میرے سامنے سے، اس وقت تمہاری شکل زہر لگ رہی ہے۔ ورنہ میں چلا جاتا ہوں کہیں۔''

''ثمر...... کیا ہو گیا ہے آپ کو...... پلیز ریلیکس...... میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اپنے کسی بھی مسئلے پر کیا بات نہیں کیا کرتے ہیں اور کوئی بھی خوشی صرف میری خوشی نہیں ہو سکتی جب تک اس خوشی میں آپ شریک نہ ہوں، آپ کا حصہ نہ ہو۔ میاں بیوی دُھوپ چھاؤں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کیا کریں۔'' چمن کے انداز میں منت تھی۔ اب اسے مزید اندیشے بھی ستا رہے تھے کہ بانو آپا بیٹے کی اونچی آواز سُن کر دروازے سے کان لگا کر نہ کھڑی ہو گئی ہوں اور ایک محاذ سے گزر کر دوسرے محاذ پر گھمسان کا رن نہ پڑ جائے۔

''ہٹو میرے سامنے سے، پہلے آگ لگاتی ہو پھر معصوم شکل بنا کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' ثمر اسے ایک طرف دھکیل کر نامکمل جملے کے معنی خیز انگارے اُچھالتا بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

چمن کا حال یوں تھا جیسے کسی نے پیروں تلے زمین کا تختہ کھینچ لیا ہو۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹ کر بیڈ تک گئی اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک اور دل کی دھک دھک کے آہنگ کے ساتھ اسے بانو آپا کے قدموں کی دھمک کا بھی انتظار تھا۔ وہ نئے محاذ کی تیاری کے قابل نہیں تھی۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ قدرت کو بالآخر اس پر رحم آ گیا۔

اس نے باہر ثمر کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ آن واحد میں پورچ تک جانا، پھر کار اسٹارٹ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ راہ میں ماں بیٹے کی ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً بانو آپا بلڈ پریشر کی ٹیبلیٹ لے کر فل A.C چلا کر دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔

اب وہ اَدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت دنوں بعد آج کی اس رات میں ہزار راتوں کے برابر رت جگا ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

ایمن کی دونوں بچیاں مہ وش اور مہ پارہ لاؤنج میں کھیل رہی تھیں۔ دونوں میں بمشکل ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ دیکھنے میں جڑواں ہی لگتی تھیں۔ کھیلتے کھیلتے اچانک ہی ایک دوسری سے اُلجھ پڑی تھیں۔ چھوٹی مہ پارہ نے کیرم میں اپنی ہار کا بدلہ مہ وش کی گڑیا کے بال اکھیڑ کر لیا تھا جس کے ردِعمل میں مہ وش نے مہ پارہ کے بال نوچ ڈالے تھے۔ وہ درد سے بلبلا کر چیخ پڑی تھی۔ اس سے قبل کہ ایمن کچن سے دوڑتی ان کے پاس آتی حامد حسین سودا سلف لے کر لاؤنج میں داخل ہو چکے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے...... ارے...... رے...... یہ کیا کر رہی ہو؟'' حامد حسین نے مہ پارہ کے بازو میں دانت گاڑتے دیکھ کر غصے سے ٹوکا تھا۔

دادا کی آواز سُن کر مہ پارہ ایک دم دبک گئی تھی۔ پھر بڑی مظلوم شکل بنا کر بولی۔

''دادا جان مہ وش مجھے مار رہی ہے۔ اس نے میرے بال بھی نوچے تھے۔'' اس نے گویا دہائی دی تھی۔

''ہیں...... ہیں...... میں نے خود دیکھا تم مہ وش کے بازو میں کاٹ رہی تھیں۔ اُلٹا اس پر الزام لگا رہی ہو۔ یہ سکھا رہی ہے تمہیں تمہاری ماں؟ خوب تربیت ہو رہی ہے بھئی شاباش۔'' ایمن سامنے آ گئی تھی۔ حامد حسین یہ سنہری موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا یہی تو وقت تھا۔

''مہ پارہ...... چلو اوپر کمرے میں۔ تمہیں بتاتی ہوں اچھی طرح۔'' ایمن کے حساب سے یہی بہتر تھا کہ وہ بچیوں کو ان کے دادا کے سامنے سے فوراً لے جائے، اس سے بیشتر حامد حسین مزید زہر افشانی کرتے یا ایمن بچیوں کو لے کر اوپر جاتی ساس صاحبہ کمر پر ہاتھ رکھے باری باری سب کو گھورتی میاں کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔

''ارے کیا ہو گیا۔ کیوں اتنی زور سے چلا رہے ہیں؟''

''دشمنوں کی طرح لڑتی ہیں۔ کون کہے گا یہ سگی بہنیں ہیں۔ بچوں کا بھلا کیا قصور، یہ تو ماں کی تربیت ہوتی ہے۔ گیلی مٹی جیسے مرضی ڈھال لو۔'' حامد حسین نے سہمی سہمی سی ایمن پر ایک بیزار کن نگاہ ڈال کر لاڈلی بیگم کو جواب دیا۔

''ٹھیک بولے آپ! ارے یہ کیا بچوں کی تربیت کریں گی۔ ان کی ماں نے کون سا ان کو نیک تربیت دی۔ زمانے بھر کی سست و کاہل، ایک کام بتا دو اور رات تک بھول جاؤ۔ میاں رات کو بارہ بجے گھر آئے گا تو الگنی سے کپڑے اتریں گے تاکہ میاں کو ترس آ جائے کہ بے چاری بیوی رات بارہ بارہ بجے تک گھر کا کام کرتی ہے۔ بس یہ چترائیاں سکھائی ہیں ماں نے۔ سارا دن خوب آرام کرو۔ کام جمع کرو...... جیسے ہی شوہر آ جائے، اس کے سامنے کام کر کے نمبر بناؤ۔''

''رات کو تو کپڑے ویسے ہی سیل جاتے ہیں۔ اللہ بخشے ہماری اماں تو مغرب کے وقت کسی کو دھلے کپڑے اُتارتے دیکھتی تھیں تو طوفان کھڑا کر دیتی تھیں۔ گھر سے برکت جاتی ہے۔ خارش کے کیڑے الماریوں میں پلنے لگتے ہیں۔ اینٹی بائیوٹک کھا کھا کر دس پندرہ بیماریاں اور پالنا ہوتی ہیں۔'' حامد حسین نے ہمیشہ کی طرح بیگم کی ہاں

میں ہاں ملانے کی حد ہی کردی۔

''صرف ایک مرتبہ ہی رات کو اتارے تھے۔ منی خالہ (خلیا ساس) اپنی بہوؤں کے ساتھ آئی تھیں۔ میں شام تک کچن میں رہی ذہن سے نکل گیا کہ...... '' ایمن نے گھبرا کر وضاحت پیش کرنا چاہی۔ مگر اسے بات مکمل کرنے کون دیتا۔ ساس صاحبہ چمک کر بولیں۔

''دیکھ رہے ہیں...... جتارہی ہے کہ سسرالیوں کے لیے دیگیں دم کرنا پڑتی ہیں۔ ارے ہماری خدمتیں کرتے کرتے ایسے گٹھیا ہو گیا ہے۔'' فردوس کی زبان کے آگے تو ویسے ہی خندق تھی شوہر کی شہہ پر تو دل کھول کر کلیجہ ٹھنڈا کرتی تھیں۔

ایمن کی آنکھوں میں احساسِ بے بسی سے آنسو چمکنے لگے تھے۔ بچیاں بھی اپنی لڑائی بھول کر ماں کے دائیں بائیں آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جو بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

''چلو بیٹا...... اوپر چلو...... اپنا ہوم ورک شروع کرو۔ میں آتی ہوں۔'' اس نے بمشکل گلوگیر آواز میں بچیوں سے کہا۔ جو دادا دادی کی سخت سست کی وجہ ومعنی سمجھنے سے ضرور قاصر تھیں مگر اتنا محسوس کرسکتی تھیں کہ ان کی ماں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔

''اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔'' فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

''ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔'' حامد حسین نے لقمہ دیا۔

''پ...... پ...... پندرہ لاکھ...... '' فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

''ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟'' وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

''آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہو گا۔'' حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔

جسے رب العالمین کہتے ہیں۔

جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔

جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کرسکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''ارے کیا لاکھوں کروڑوں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔ بس کریں۔ اسپتال پہنچ گئی تو لاکھ دو لاکھ ٹھکانے لگ جائیں گے۔ سارے پرائز بانڈز، سیونگ سرٹیفکیٹ بک جائیں گے۔'' فردوس دہل کر شوہر کو خاموش کرا رہی تھیں۔

زینے کے موڑ پر گم ہونے سے پہلے ایمن سوچ رہی تھی۔ اللہ آپ کے پرائز بانڈز اور سرٹیفکیٹ کو سلامت رکھے جو آپ کو خاموش کرانے کی طاقت رکھتے ہیں...... آہ

☆......☆......☆

ثمر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر Mails چیک کر رہا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ بہت سنجیدہ نوعیت کے معاملے میں اُلجھا ہوا ہے۔ چمن اس کی یہ مصروفیت دیکھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا، اُسے اپنے کپڑے وغیرہ بھی دیکھنے تھے۔ اسے یہ موقع غنیمت لگا تو جا کر اپنا کام نپٹانے لگی۔

اسے عام بہوؤں کی طرح ماں بیٹے کی باتیں کان لگا کر سننے کا ذرہ برابر شوق نہیں تھا۔ بلکہ چار سالوں میں تو بہت کچھ ''Under Stood'' ہو چکا تھا۔

''اُدھر بانو آپا ادھر اُدھر آتے جاتے جیسے کسی موقع کی تاک میں تھیں۔ شاہ جی سے لایا ہوا تعویذ تو وہ کچن کی کیبنٹ میں بہت احتیاط سے چھپا چکی تھیں۔ چمن اپنے کمرے میں چلی گئی تو دل کو مزید تقویت پہنچی۔ ثمر اتنا زیادہ مصروف دکھائی دے رہا تھا کہ پاس جا کر چائے پانی پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی مبادا انکار ہی نہ کر دے۔

بلی کے بھاگوں آخر چھینکا ٹوٹ ہی گیا۔ ثمر ملازمہ کو ٹھنڈا پانی لانے کے لیے آواز دے رہا تھا۔ بانو آپا برق رفتاری سے اس کے قریب جا پہنچیں۔ اس سے پیشتر کہ اس کی خدمت گزار بیوی آ دھمکے۔

''ایک منٹ...... میں لے کر آتی ہوں پانی۔'' بانو آپا کچن کی طرف بڑھیں۔

''امی آپ رہنے دیں۔ ساجدہ (ملازمہ) ہے۔ چمن ہے۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟'' ثمر نے شرمندہ ہو کر ٹوکا۔

''ارے میرا بچہ صبح سے رات تک جان مارتا ہے۔ کس کے لیے؟ ہمارے لیے ناں، ایک گلاس ٹھنڈا پانی اپنے ہاتھ سے دے دوں گی تو کیا قیامت آ جائے گی؟ البتہ میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔'' بانو آپا راج دلار کے موتی رولتی کچن میں جا رہی تھیں۔ ثمر بے ساختہ مسکرا دیا۔

'میرا بچہ...... ماں نوے برس کی ہو اور بیٹا ستر برس کا۔ مگر ماں کا بچہ ہی رہے گا۔' وہ شکر گزاری اور محبت کے جذبوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

آن واحد میں پانی آنے کا اندازہ تھا۔ مگر چند منٹ لگ گئے۔ شاید ٹھنڈا پانی نہیں ہو گا یا زیادہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کیوبز ڈال رہی ہوں گی۔ ثمر نے کچن پر ایک سرسری نگاہ دوڑا کر گلے سے ٹائی اُتار کر بیک پر لٹکا دی۔ واقعہ یہ تھا کہ بانو آپا اپنی بھرپور تسلی کرنا چاہتی تھیں کہ تعویذ کی کرامات پوری طرح پانی میں حل ہو کر ثمر کے رگ و ریشے میں حلول کر جائیں۔ پلاسٹک کے امپورٹڈ ڈی اسپون سے تعویذ پانی میں گھمائے جا رہی تھیں۔

اسٹیل کے چمچ سے تو آواز ہی بہت ہوتی ہے۔ گیلا تعویذ گلاس سے نکال کر دوپٹے کے پلو میں باندھا کیونکہ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق کسی جگہ کچی زمین میں نہایت ادب و احترام سے دفن کرنا تھا۔ شاہ جی کے حساب سے کسی فاقہ کش کی میت کو غسل و کفن نصیب ہو نہ ہو یہ ان کا ''Concern'' نہیں تھا مگر ان کے ہاتھ کے لکھے زردے کے رنگ اور کیوڑے (مشک و زعفران نام نہاد) کے مٹ جانے والے ہندسوں کی حیثیت بہت متبرک تھی۔

کمال شفقتِ مادری سے بیٹے کو پانی پیش کیا۔

''امی آپ تو بس شرمندہ کردیتی ہیں۔ آخر ساس بہو کو کس لیے لاتی ہے؟'' ثمر نے ہنس کر گلاس تھامتے ہوئے کہا۔

''بہو اس لیے لاتے ہیں کہ دادی چاند سے پوتے کھلائے، شجرہ مضبوط ہو، نسب آگے بڑھے۔'' بانو آپا بہت خوش قسمت تھیں انہیں دل کی بات کہنے کا موقع جلدی جلدی ملتا رہتا تھا۔ خود سے بات نکال کر بری بننے سے بچ جاتی تھیں۔

''امی جان بس آپ تو......'' ثمر نے آدھا گلاس پانی پی کر رُک کر سانس لیا۔

''بیٹا پورا پانی پیو، شور تو ایسے مچا رہے تھے جیسے، بہت سخت پیاس لگ رہی ہو۔'' بچا ہوا پانی دیکھ کر بانو آپا کو اندیشے ستانے لگے۔

''پی رہا ہوں امی......سانس لے رہا ہوں۔ آپ ہی نے تو سکھایا ہے کہ تین سانس میں پانی پیتے ہیں تو ثواب ملتا ہے۔ ثمر نے ہنس کر کہا اور پھر گلاس منہ سے لگالیا۔ عجب طرح کی مسرت کے احساس سے بانو آپا بھیگ بھیگ گئیں۔

''ماں واری جائے اور میرے بیٹے کو نظرِ بد سے بچائے۔'' ثمر نے گلاس خالی کر کے ان کو واپس کرتے ہوئے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام کر چوم لیا۔ بانو آپا نہال ہوگئیں۔ انہوں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے اِدھر اُدھر کن انکھیوں سے دیکھا مبادا کہیں چمن کھڑی نظر آجائے۔ کاش وہ دیکھ لیتی کہ ثمر اپنی ماں سے کتنا پیار کرتا ہے۔

''تین تعویذوں کی مار ہے......ثمر کی دوسری شادی تو پکی......''

بانو آپا کو گھر کے چہار اطراف سے نئی بہو کی پازیب کی چھن چھن سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ لگا کر دوپٹے میں لگی گرہ کو چھوا، گیلا کاغذ اپنی جگہ موجود تھا۔ جس کی تدفین کا عمل باقی تھا۔

☆......☆......☆

یاور سر جھکائے ماں باپ کے بیڈروم میں بیٹھا ماں باپ سے بیوی کی لن ترانیوں، بدزبانیوں کے تذکرے سن رہا تھا۔

''یار اب تو حد ہوگئی ہے۔ بہت بدزبان اور چڑچڑی ہوگئی ہے۔ سیدھی بات کرو تو اُلٹا جواب دیتی ہے۔''

''تھوڑا سا صبر کرلیں ابا جان! چند مہینوں کی بات ہے، پھر دیکھتے ہیں۔''

''ارے تم کیا دیکھو گے! میں نے تو لڑکیاں دیکھنی شروع کردی ہیں۔'' فردوس نے بیٹے کی بات کاٹ کر چمک کر کہا۔ یاور نے حیران ہوکر ماں کی طرف دیکھا۔

''لڑکیاں......؟'' پھر طنزیہ مسکرایا۔ ''گھر میں بارش کی طرح برسنا تو شروع ہوگئی ہیں لڑکیاں......بیٹھی دیکھتی رہیں۔''

''یہ برسات دیکھیں گے لڑکیوں کے نانا نانی، خوب یاد دلایا۔ ارے اس کا الٹرا ساؤنڈ کروا کر پتا تو کراؤ، اس بار بھی کہیں......'' فردوس جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ جیسے شوہر کی طرف سے بھی کچھ سننا چاہتی ہوں، جو درحقیقت بیٹے ہی کو سنانا تھا۔

''اچھا ہوا تم نے بات بیچ میں روک لی۔ بدشگونی کی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔'' حامد حسین نے بیوی

سے آف موڈ میں کہا اور یاور کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پہلی فرصت میں اس کا الٹراساؤنڈ کراؤ۔ اگر لڑکی ہے تو ہمارے سات سلام پہنچا کر ماں کے گھر چھوڑ آؤ۔ ویسے بھی دو بیٹیاں بیاہ کر فارغ بیٹھے ہیں۔ دونوں کا خرچہ ہی کیا ہے۔ 65 ہزار پنشن آرہی ہے مشکور احمد کی۔ بچی کو چار چھ مہینے پاس رکھیں، ڈلیوری کا خرچہ اٹھائیں۔''

''اور نہیں تو کیا! بیٹی بیٹیاں پیدا کر رہی ہے۔ نرے خرچے ہی خرچے خود تو تین کروڑ کی کوٹھی میں جنت بنائے بیٹھے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں بیٹیوں کو ترکہ تو ملنے سے رہا۔ اللہ جانے کب مریں، صحت تو دونوں کی بہت اچھی ہے۔ لگتا تو یہی ہے قیامت کے بورے سمیٹیں گے۔ ہماری طرح تھوڑا ہی ہیں۔ ستر روگ لگے ہوئے ہیں جان...... کو...... نہ ڈھنگ سے کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں۔''

فردوس نے بھی جی بھر کر دل کی بھڑاس نکالی۔ یاور آسانی سے ہاتھ ہی کہاں لگتا تھا۔ گورنمنٹ جاب سے فارغ ہو کر ایک پرائیویٹ فرم میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ گھر آتے آتے رات کے دس گیارہ بج جاتے تھے۔ اس وقت تک حامد حسین اور فردوس مٹھی بھر دوائیاں پھانک کر محو استراحت ہو چکے ہوتے تھے۔ البتہ ہفتہ اتوار یاور کی چھٹی ہوتی تھی جو وہ سو سو کر گزارتا تھا اور دونوں گھات لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ جیسے ہی وہ سامنے پڑتا بڑی ترکیب سے حصار میں لے کر بیٹھ جاتے۔ پہلے اس کی صحت پر تشویش کا اظہار ہوتا پھر رشتے کی بھتیجوں، بھانجوں کے سسرالی رشتے داروں کے ہاں پیدا ہونے والے چاند سے بیٹوں کا ذکر کیا جاتا۔ پھر انتہائی غم ناک انداز میں اپنی محرومیوں کا ذکر ہوتا۔ اپنی بدنصیبی کا ذکر کرتے ہوئے آواز گلوگیر ہو جاتی۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بیٹے سے ہریرہ یا ہریسہ کھانے کی بابت دریافت کیا جاتا۔ اس خیال کے پیش نظر مبادا بیٹا یہ سمجھے کہ ماں کو رونے سنانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ اسے یہ بھی احساس ہو کہ انتہائی توانائی بخش تغذیہ کا اہتمام بھی بس ماں ہی کر سکتی ہے۔ بیوی تو بس شوہر کا مال اڑانے اور ہڈحرامی کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

یاور کے اعصاب شل ہونے لگے۔ دو دو نوکریوں کو بھگتا کر ماں باپ کی بے تکان گفتگو مرے پر سو دُرے کے مثل ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر دباتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے...... میں بات کرتا ہوں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کل لے جاؤں گا اسے الٹراساؤنڈ کے لیے۔'' وہ نڈھال سے انداز میں آگے بڑھا، فردوس نے ترحم آمیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''کتنا کمزور ہو گیا ہے میرا بچہ...... یا اللہ! اس کو اپنی جناب سے مضبوط بازو عطا فرما، آمین۔'' دعا با آواز بلند اور آمین سر بلند تھا۔

''اللہ تو سنتا ہی ہے۔ بیٹے کو بھی سننا چاہیے۔

☆......☆......☆

عطیہ بیگم گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے معمول کی تسبیحات میں مصروف تھیں۔ کال بیل کی آواز نے چونکا کر رکھ دیا۔ بے اختیار نظر وال کلاک کی طرف اُٹھیں۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

'اس وقت کون آ گیا؟' وہ سوچتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ مشکور حسین کافی دیر ہوئی سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے۔ تفکر چہرے سے جھلکنے لگا۔ وہ بڑی تیز چلتی ہوئی انٹر کام تک آ گئی تھیں۔

''کون؟'' محتاط انداز تھا۔

''امی...... میں ایمن۔'' ایمن کی آواز انٹر کام کے ایئر پیس میں گونجی تو ہفتِ آسمان گھومتے دکھائی دیے۔

''ایمن! اس وقت'' وہ گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے پریشان کُن کیفیت میں سوچ رہی تھیں۔ گیٹ وا ہوا۔ سامنے ایمن مہ وش و مہ پارہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی دونوں بچیاں دائیں بائیں کھڑی نانی کو بہت مسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''السلام علیکم امی!'' ایمن میں ماں سے نظر ملانے کا یارا نہ تھا۔

''وعلیکم السلام! تم اِس وقت اکیلی...... یاور ساتھ نہیں ہے؟''

''امی اندر تو آنے دیں۔ یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ پوچھ لیں گی؟'' ایمن کے انداز میں عجیب بے کسی تھی۔ جو ماں کا کلیجہ شق کرنے کے لیے کافی تھی۔

''ارے...... آؤ آؤ...... میں تو یوں اچانک اتنی رات کو تمہیں سامنے پا کر حواس باختہ سی ہوگئی۔'' عطیہ بیگم نے ایک طرف ہو کر ماں بیٹیوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

ایمن بچیوں کے ساتھ اندر آ گئی تو عطیہ بیگم نے گیٹ بند کر دیا۔ ایمن اب ایک بیگ تقریباً کھینچتی ہوئی اندر بڑھ رہی تھی۔ بچیوں نے دائیں بائیں ہو کر نانی کے ہاتھ تھام لیے۔

''پاپا کہاں ہیں بیٹا؟ کیسے آئی ہو آپ؟'' عطیہ بیگم کا دل اندیشوں نے لرزا کر رکھا ہوا تھا۔

''نانو ہم ٹیکسی سے آئے ہیں۔ پاپا تو گھر پر نہیں تھے، اس لیے ہم خود ہی آ گئے۔ ماما کہہ رہی تھیں نانو کو سرپرائز دیں گے۔'' بڑی بچی مہ وش نے بڑے جوش وخروش سے جواب دیا تھا۔

'یاور گھر پر نہیں تھا...... ایمن اسے بتائے بغیر آئی ہے۔' سوالات ذہن میں کلبلانے لگے۔

وہ بچیوں کے ساتھ بوجھل قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوئیں تو ایمن بھاری بھرکم صوفے میں دھنسی ہوئی گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔ تیسری پریگنینسی تھی۔ ساتواں مہینہ ختم ہو کر آٹھواں لگا تھا۔ ذرا سا چلتی تھی تو ہانپنے لگی تھی، شدید ذہنی دباؤ، غیر متوازن اور بہت کم مقدار میں غذا لے رہی تھی اس لیے کمزوری بھی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں کو سامنے پا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

''ایمن یاور کو بتا کر آئی ہو؟''

''نہیں۔'' خوف میں لپٹے سوال کا جواب بڑی بے خوفی سے ملا۔ عطیہ بیگم نے دہل کر دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

''لڑ کر آئی ہو؟'' ماں کی آواز شکستگی کے آخری مرحلے کو چھو رہی تھی۔

''لڑنے کی تو ہمت ہی نہیں امی۔ بس خاموشی سے مر جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''خبردار...... اس حالت میں اچھی اچھی دعائیں مانگتے ہیں اور بچیوں کے سامنے یہ اول فول بک رہی ہو۔'' عطیہ بیگم نے دکھ اور صدمے کی کیفیت میں تقریباً ڈانٹا تھا۔

ایمن نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔

☆......☆......☆

یاور ہکا بکا خالی بیڈروم کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرے میں ہر چیز بڑی بے ترتیب تھی۔ بچیوں کے کپڑے، ایمن

اختلاف

ایک بہت بڑا کہانی کار تھا'Aesop' وہ لکھتا ہے کہ ایک سڑک پر اسلحہ سے لیس گھڑسوار آ جارہے تھے۔ سڑک پر ایک دوطرفہ بورڈ آویزاں تھا۔ دفعتاً ایک سورما اس بورڈ کو دیکھ کر رُک گیا۔ وہ بولا۔''واہ! کیسا خوبصورت نیلے رنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔''سڑک کی دوسری جانب سے ایک اور سورما آ گیا۔ بولا۔''واقعی بہت خوبصورت بورڈ ہے مگر رنگ تو سرخ ہے۔''پہلا سورما بولا۔''ہم کہتے ہیں کہ اس کا رنگ نیلا ہے۔'' دوسرے نے کہا کہ اس کا رنگ سرخ ہے۔ پہلے نے کہا''تم ہماری توہین کررہے ہو۔ نکالو تلوار۔''دونوں سورماؤں نے تلوار نکال لیں اور ڈوول (لڑنے) کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنے میں ایک سیانا بوڑھا موقع پر آ پہنچا۔ بولا''بھائیو کس بات پر ڈوول لڑنے لگے ہو؟''پہلے سورما نے کہا۔''اس شخص نے ہماری توہین کی ہے۔''''کیسے؟''بوڑھے نے پوچھا۔''ہم کہتے ہیں یہ بورڈ جو سڑک پر آویزاں ہے نیلے رنگ کا ہے جبکہ یہ کہتے ہیں اس کا رنگ سرخ ہے۔''بوڑھا بولا۔''آؤ دیکھیں کہ بورڈ کا کیا رنگ ہے؟''انہوں نے دیکھا کہ بورڈ پر ایک طرف نیلا رنگ ہے اور ایک طرف سرخ۔ آج بھی دنیا میں بیشتر جھگڑے اسی بات پر ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے''بورڈ نیلا ہے۔''دوسرا کہتا ہے''بورڈ سرخ ہے۔''

(ممتاز مفتی کی تصنیف'تلاش' سے ایک اقتباس) انتخاب: روبینہ شاہین، کراچی

کا دوپٹہ، واش روم سلیپرز، ناول، کھلونے، تکیے، کشن، آرٹ پیڈز، کلرز، برش، پونی، ہیئر برش غرض کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ کئی آوازیں بھی دے ڈالی تھیں مگر جواب میں دل دھڑکانے والی لامحدود خاموشی تھی۔

پھر اس کی نظر بیڈ پر پڑے ہوئے ایمن کے موبائل پر پڑی...... وہ تیزی سے آگے بڑھا اور موبائل اٹھالیا۔

''کہاں گئی ہے؟ موبائل بھی چھوڑ گئی یا بھول گئی۔ اس وقت کہاں جاسکتی ہے۔ امی جان کو بغیر بتائے گئی ہے، ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتی۔ ایک گھنٹے سے تو ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔''وہ سوچنے لگا، اُلجھنے لگا۔

ایمن کی آج کل جو حالت تھی اس کے پیشِ نظر وہ بہت جلدی سمجھ گیا کہ وہ اتنی رات کو کہاں جاسکتی ہے۔ اور یہ کہ اس بات سے اس کے والدین لاعلم ہیں۔ جس کا سیدھا سیدھا مطلب ہے وہ غصے یا ناراضگی کی کیفیت میں بچیوں کو ساتھ لے کر گئی ہے۔ یہ یقین روح میں اُترا تو خون جیسے کھولنے لگا۔

''میرے ماں باپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اس عورت میں بلا کی ہٹ دھرمی ہے۔ ضرور یہ میرے ماں باپ سے زبان درازی کرتی ہوگی۔ شکل سے کتنی مظلوم لگتی ہے۔ جو عورت اتنے دھڑلے سے رات کو اس حالت میں گھر سے نکل جائے وہ سب کچھ کرسکتی ہے۔''یاور غم و غصے کی کیفیت میں کھڑا مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

''ارے میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی عورت پر، جس کو اپنی شکل پر اتنا گھمنڈ ہو اور اس کے پاس ہے ہی کیا، امی ٹھیک کہتی ہیں۔''

ایمن نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ ساس صاحبہ کی پروگریس رپورٹ مضبوط ہورہی تھی۔ وہ میرٹ پر پاس ہورہی تھیں۔

یاور کچھ دیر تک اپنی سانسوں کو کنٹرول کرتا رہا، خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اب اسے پھر ایک محاذ کا سامنا تھا۔

جا کر ماں باپ کو بتانا تھا کہ ایمن بچیوں کو لے کر چلی گئی ہے اور جب عورت بچے لے کر خاموشی سے گھر سے نکل جائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

☆......☆......☆

''امی...... میں سچ کہہ رہی ہوں اب اُس گھر میں ایک پل گزارنا بھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی بیمار بستر پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہو۔'' ایمن سسکیاں لیتے بول رہی تھی اور عطیہ بیگم سکتے کی کیفیت میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سُن رہی تھیں مگر گویائی کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ تیسری مرتبہ ماں بننے جا رہی تھی۔ تین بچوں کے ساتھ پہاڑ سی جوانی، اتنی اندھیری رات میں اس گھر کو چھوڑ کر آنے کا مقصد واضح تھا۔

''بیٹا تمہیں بہرحال اس طرح ان کو بتائے بغیر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ بھی بے وقت۔'' وہ بمشکل گویا ہوئیں۔

ایمن نے آنسو بھری آنکھوں سے ان کی سمت دیکھا۔

''بے وقت......؟ وقت تو ٹھہر گیا ہے امی...... ایک لمحہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے...... وہاں ہر آنکھ میں میرے لیے نفرت، بے زاری اور اجنبیت ہے۔ ایسے ماحول میں کب تک رہا جا سکتا ہے۔ مجھے تو چھوڑیں، یہ بچیاں تو ان کا اپنا خون ہیں۔ مگر ان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے اگر آپ دیکھ لیں تو خود ہمیں وہاں سے لے آئیں۔'' اتنا کہہ کر ایمن پھوٹ پھوٹ کر نئے سرے سے رونے لگی۔ عطیہ بیگم کے کلیجے پر گویا آری سی چلنے لگی، بے اختیار ایمن کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''یاور کو تو بتایا ہوگا؟'' وہ کربناک لہجے میں پوچھنے لگیں۔

''نہیں...... وہ آج دیر سے گھر آئے ہوں گے۔ میں ان کے آنے سے پہلے ہی نکل آئی۔ اگر وہ آجاتے تو میں اس گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔'' ایمن نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سسکیاں دبا کر جواب دیا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یاور کو بتائے بغیر تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بیٹا ان باتوں سے شوہر کے دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہے۔''

''چھوڑیں امی...... یاور نہ شوہر ہیں نہ باپ، وہ صرف اپنی ماں کے بیٹے ہیں جو فرشتہ ہیں، گنگا نہا کر آئی ہیں۔ کبھی غلطی نہیں کر سکتیں۔'' ایمن نے بڑی تلخی سے جواب دیا تھا۔

''بری بات بیٹا! میاں بیوی کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا۔ مگر ان بچیوں کا تو وہ باپ ہے۔ یہ تو اس کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ماں کا تو دوسرا نام ہی قربانی ہے۔ تمہیں بس ان بچیوں کی طرف دیکھنا چاہیے۔ ایک دن ان بچیوں کی وجہ ہی سے اس کی نظر میں تمہاری اہمیت ہوگی۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' عطیہ بیگم نے ایمن کو بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

وہ جو کچھ محسوس کر سکتی تھیں، اندازے لگا سکتی تھیں، ایمن ابھی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کیونکہ تجربہ سب سے بڑا استاد ہے۔ وہ جانتی تھیں کہ طلاق یافتہ جوان عورت، جس کا بیٹیوں کا ساتھ ہو اس معاشرے میں کس طرح جیتی ہے۔ پورا معاشرہ ہی ظالم سسرال بن جاتا ہے۔ وہ بیٹی کو عزت سے رہنے کا ہنر بتا رہی تھیں۔

''یہ دنیا تو ویسے بھی مشقت گاہ ہے، جو آسمان سے گرتا ہے کھجور میں اٹک جاتا ہے۔ کیوں نہ پھر عزت کی بھاری قیمت چکا کر قید بامشقت کی میعاد مکمل کی جائے۔''

''امی آپ چاہتی ہیں میں مر کر وہاں سے نکلوں؟'' ایمن بلک بلک کر رو پڑی۔ عطیہ بیگم دہل کر رہ گئیں۔

''بیٹا! تم بھی ماں ہو۔ ماں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ماں تو اولاد کی زندگی وخوش بختی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتی۔'' بولتے بولتے عطیہ بیگم کی آواز بھرانے لگی۔ وہ بڑے ضبط سے کام لے رہی تھیں۔ مقصد عظیم ہو تو حوصلہ بھی بڑا درکار ہوتا ہے۔ بیٹی کے مضبوط مستقبل سے زیادہ ایک ماں کے نزدیک عظیم مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ ایمن کے سر پر تھا۔ بمشکل آنسو روک رہی تھیں۔

''اچھا چلو...... پہلے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا پی لو۔ بچیاں بھی بھوکی ہوں گی۔ جن حالات میں تم گھر سے نکلی ہو ان حالات میں کس سے کھایا پیا جاتا ہے۔ چلو اُٹھو شاباش...... صبح بات کرتے ہیں۔ تمہارے ابا جان یاور سے خود بات کریں گے۔ مجھے تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو بیٹا...... دیکھو بچیاں کیسی سہی ہوئی تمہاری طرف دیکھ رہی ہیں۔'' عطیہ بیگم نے ون پیس صوفے میں پھنسی پھنسی بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا تھا۔ جو درحقیقت اپنی ماں کو مسلسل آنسو بہاتے دیکھ کر پتھر کے بت کی مانند محسوس ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''اے ہئے...... کم بخت بھاگ گئی، دیکھ لیا۔ شکل سے کتنی معصوم لگتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی، حوصلہ دیکھو، ارے یاور! میرے بچے کلنک کا ٹیکہ بج گیا ہمارے ماتھے پر۔'' فردوس مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے رانوں کو پیٹ پیٹ کر دہائی دے رہی تھیں۔

''امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کہاں گئی ہو گی؟ ظاہر ہے ماں کے گھر گئی ہو گی۔'' یاور کے اعصاب میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کسی خوفناک تصور سے پاگل ہوتا۔ حامد حسین زخمی ناگ کی طرح بل کھاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔

''ارے ہمارے بچے بھی لے گئی۔ اپنے باپ کے گھر سے لائی تھی کیا؟'' فردوس نے پھر دہائی دی اور اب اپنا سر پیٹنے لگیں۔

''میں خوب سمجھ رہا ہوں، وہ ہمیں نیچا دکھانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ مگر کیا کریں دو مہینے تو ہمیں صبر کرنا ہی ہے۔'' حامد حسین اندر کا اشتعال بمشکل کنٹرول کر پا رہے تھے۔

''اب کیا فائدہ صبر کرنے کا، ہماری مال و متاع تو ساتھ لے گئی۔'' فردوس ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھیں۔

''اگر وہ چار سو بیس ہے تو ہم اسے آٹھ سو چالیس بن کر دکھائیں گے۔ تم ذرا آسرا تو کرو۔ مجھے اور یاور کو بھی پاگل کیے دے رہی ہو۔ کچھ سونے تو دو۔'' حامد حسین کے انداز میں اب جھلاہٹ سی تھی۔

''تمہارا پہ بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھ دیے۔ ارے مجھ پر کیوں غصہ ہو رہے ہیں۔ میں تو آپ کے جانشین کی ماں ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر کبھی سبزی لینے نہیں گئی۔ دفتر جاتے تھے تو اپنے ہاتھوں سے جوتے پہناتی تھی۔ یاور کو سوتے سے اُٹھاتی تھی کہ باپ کو سلام کرو۔ خود بھی عزت کی اولاد سے بھی کرائی۔ اُس کلموہی کے پیچھے مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔'' فردوس نے اب نیا فساد مچا دیا۔ ایسا واویلا کیا کہ حامد حسین کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ لگے بیگم کو بچوں کی طرح چمکارنے۔

''بھاگوان میں تو تمہاری پریشانی دور کرنے کی فکر میں ہوں۔ ٹینشن سے تمہارے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ سب بھاڑ میں جائیں، مجھے تو بس تمہاری فکر ہے۔'' پھر یاور سے گویا ہوئے۔

''میں تمہاری ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے زندگی بھر میری خدمت کی ہے۔ میری اجازت کے بغیر کبھی دہلیز پار نہیں کی۔ تمہاری نانی کا انتقال ہوا تو میں پنڈی میں تھا۔ جب تک میں گھر نہیں آ گیا یہ اپنی مری ماں کا منہ دیکھنے نہیں گئی۔ میں رات کو بارہ ایک بجے ڈیوٹی سے آتا تو یہ میرے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہتی تھی۔ ارے میں اس عورت کی کیا کیا خوبیاں گنواؤں۔ تم خوش نصیب ہو جو ایسی ماں ملی ہے۔''

فردوس کے آنسو تھم گئے۔ شوہر نے قصیدہ پڑھا تو سچے موتیوں کے ہار یاد آ گئے۔ پرانے وقتوں میں بادشاہ قصیدہ سننے کے بعد موتیوں کا ہار گلے میں ڈالتے تھے۔ شوہر پر ایسا ٹوٹ کر پیار آیا کہ جوان بیٹا سامنے نہ ہوتا تو اپنی بانہوں کا ہار ہی اُن کے گلے میں ڈال دیتیں۔

''بس یہ پہاڑ سی رات گزرنے دو۔ ارے تمہارے قدموں میں لا کر بٹھاؤں گا۔ معافی مانگے گی تم سے۔''

''ارے بس کریں...... بھاگ گئی وہ اب نہیں آنے کی۔'' فردوس کو اچھے گمان آنا بند ہو چکے تھے۔ اپنی کار گزاری جو مدنظر تھی۔

''میں کون سا اسے کھینچ کر لاؤں گا، ایسی ترکیب لڑاؤں گا سر کے بل آئے گی۔'' پھر بیٹے کو سنانے کو بولے جیسے جلتی پر تیل چھڑک رہے ہوں۔

''جس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شادیانے بجوا کر لاتے ہیں وہ بہو ہوتی ہے اور بھاگی ہوئی بھگوڑی کنیز ہوتی ہے۔ اب دیکھنا تم...... یاور کی غیرت کا سوال ہے۔'' شوہر کے منہ سے طفل تسلیاں سنتے ہوئے فردوس نے یاور کی طرف دیکھا جو سر جھکائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ آنے والے دنوں میں ایمن کی درگت بننے کے خیال سے ہی کلیجے میں ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔ پھر 'Wind-Up' ضروری تھا۔

''ارے میرا چاند سا پوتا ساتھ لے گئی، قرار کیسے آئے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی! ابھی تو وہ الٹرا ساؤنڈ کرانے پر ہی تیار نہیں اور آپ پوتے کے خواب دیکھ رہی ہیں؟'' یاور ذہنی دباؤ کی وجہ سے جھلا کر بولا۔

''تمہاری ماں کو سچے خواب آتے ہیں۔ کسی فرشتے نے فوٹو دکھائی ہوگی۔ میں تو سات مہینوں سے بس پوتا پوتا سُن رہا ہوں۔'' حامد حسین نے بیگم کے چہرے پر گمشدہ مسکراہٹ دیکھنے کے جتن کیے۔ رات پڑی تھی، انہیں روتی دھوتی بیگم کے پہلو میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی ہری ہری سوجھنے لگی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اور کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ بڑی سخت مجبوری تھی، بیگم کا موڈ خوشگوار بنانا بہت ضروری تھا۔

☆......☆......☆

''امی...... کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' چمن کے کان سے موبائل لگا تھا۔ ''ایمن آپا اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آ گئی ہیں؟'' چمن نے چند لمحے دم لے کر پھر بے ساختہ انداز میں سوال کیا۔ خبر پر حیرت تو ہرگز نہیں تھی مگر صدمہ تو تھا۔ اسے پتا تھا کہ ایمن اس وقت تیسری پریگنینسی کے کٹھن وقت سے گزر رہی ہے۔

ایسے وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اپنی ساری ریاضتوں پر پانی پھیر دینے کے مترادف تھا۔

''ساری رات نیند نہیں آئی۔ وہ تو شکر ہے کہ تمہارے پاپا میڈیسن کی وجہ سے گہری نیند سو جاتے ہیں ورنہ ایمن کا حال دیکھ کر تو ان کی طبیعت بگڑ جاتی۔'' عطیہ بیگم اعصاب شکن رات کاٹنے کے بعد نہایت پژمردہ، نڈھال لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مشکور احمد کو انہوں نے فجر کے وقت بس اتنا بتایا تھا کہ رات ایمن بچیوں کے

ساتھ آ گئی تھی۔ دو چار دن رُکے گی۔ آنکھ کھلتے ہی ہارٹ پیشنٹ شوہر کو وہ Stress دینا نہیں چاہتی تھیں۔ دل کی بے کلی سے عاجز آ کر یہی سوجھی کہ چمن سے فون پر باتیں کر کے خود کو قدرے ہلکا کر لیں۔ یوں بھی چمن کا تاثر بچپن سے کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ گویا آہنی اعصاب کی مالک ہے۔ آسانی سے ہار نہیں مانتی۔ ایک لگانے والے کو دو لگانے کا فارمولا بہت پسند کرتی ہے۔

مشکور احمد اپنی اس خود اعتماد، صاف گو، باہمت بیٹی پر بہت فخر کرتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ چمن جیسی بیٹی پا کر کبھی بیٹے کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا اور آج کل کے بیٹے یا تو باہر چلے جاتے ہیں یا بیویوں کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ چمن جیسی بیٹی تو نعمت بھی ہوتی ہے اور رحمت بھی۔

عطیہ بیگم بھی شوہر کے خیالات سے اختلاف نہیں کرتی تھیں البتہ یہ ضرور کہتی تھیں کہ بیٹا کہنے سے بیٹی بیٹا نہیں بن جاتی۔ آخر عورت ہی ہوتی ہے۔ شیشے جیسا دل رکھتی ہے...... اور بلور جیسی آبرو......''

مگر آج صبح سویرے جب چہار سو اُداسی اور مایوسی بال کھول کر ناچنے لگی تو بے اختیار جی چاہا چمن سے حوصلہ اور اُمید کی تازہ کمک حاصل کی جائے۔ کیونکہ وہ کبھی ہتھیار ڈالنے اور منفی رویوں کی آبیاری کرنے کی باتیں نہیں کرتی تھی۔ بہت مدلل، پُر امید، آخری ہتھیار ٹوٹ جانے تک مقابلہ کرنے کی باتیں کرتی تھی۔ پژمردہ انسان میں نئی روح پھونکنے کی صلاحیت ودیعت شدہ تھی۔

''بیٹا اُس کی جو حالت ہے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اگر وہ جذبات میں آ کر اس گھر سے نکل آئی ہے تو اب میں اس کی جان چھڑاؤں گی۔ اس جہنم میں دوبارہ نہیں بھیجوں گی۔'' عطیہ بیگم کی آواز بھرانے لگی۔

''امی...... امی...... خود کو سنبھالیں...... ایمن آپا تو اس وقت پریشان ہیں، کچھ بھی الٹا سیدھا کر جائیں تو حیرت نہیں۔ مگر آپ تو......''

''بس چھوڑو...... رات میں نے بھی اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر رات بھر جاگ کر جب اس کی حالت پر غور کیا تو یہی سمجھ میں آیا۔ دنیا میں بھرم بنانے کے لیے اپنی اولاد کو دن رات تڑپتا دیکھوں۔ ہماری بیٹی کی بات تو چھوڑو اس ظالم کو تو اپنی بیٹیوں کا احساس نہیں۔ ذرا تم آ کر ان معصوم بچیوں کی باتیں تو سنو۔'' عطیہ بیگم اب ضبط نہ کر سکیں رونے لگیں۔

چمن بری طرح پریشان ہو گئی۔ معاملہ نہایت حساس اور سنجیدہ نوعیت کا تھا۔ وہ خود ایک کڑے امتحان سے گزر رہی تھی مگر ماں باپ، بہن کو بھنک نہیں پڑنے دیتی تھی۔ یہ الگ بات کہ اسے اپنے شوہر کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا جبکہ ایمن کا شوہر اپنے والدین کی ڈگڈگی پر ناچتا تھا۔

''آپ ریلیکس کریں امی...... ثمر آفس چلے جائیں تو میں آتی ہوں آپ کے پاس۔ ایمن آپا کیا کر رہی ہیں اِس وقت؟''

''سو رہی ہے...... ہائے کاش تم دیکھ سکو ایسے سو رہی ہے جیسے سالوں بعد سکون کی نیند ملی ہو۔ میں نے رات اسے کہہ دیا تھا کہ میں بچیوں کو لے کر سو جاؤں گی، تم اپنی نیند پوری کرو۔ بچیوں کی فکر میں اٹھنے کی ضرورت نہیں۔'' عطیہ بیگم آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ہاں خیر! تھکی ہوئی تو بہت ہوں گی۔ وہاں سارا گھر اکیلے ہی تو سنبھالتی ہیں اور شوہر کے نخرے...... توبہ...... فردوس آنٹی کا ایک بیٹا گیارہ بیٹوں کے برابر ہے۔'' چمن نے اب قدرے شگفتہ انداز میں بات کر کے

ماں کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

وہ فون لے کر لابی میں چلی آئی تھی ثمر واش روم میں تھا۔ کسی بھی لمحے باہر آ کر فون کی بابت پوچھ سکتا تھا۔ وہ صبح صبح اپنے مسائل پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ماں سے بات کرتے کرتے ایک خیال پریشان کرنے لگا۔ ''کہیں اُس کی اپنی ساس تو کسی دیوار سے کان لگا کر نہیں سُن رہیں؟''

''ٹھیک ہے امی...... میں آتی ہوں۔ بس آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ حافظ۔'' اس نے جلدی سے موبائل آف کر کے اِدھر اُدھر دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا پڑی۔

ماں...... کسی وقت دل چاہتا ہے کہ آپ کو یہ شعر سنائیں۔

کسی کی آنکھ جو پُرنم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے

☆......☆......☆

''دیکھ لو...... دن چڑھ گیا۔ اُدھر سے کوئی فون نہیں آیا۔ یہی پوچھ لیتے کہ ایمن یہاں پہنچی بھی کہ نہیں...... ارے اپنی بچیوں ہی کی فکر کرتے...... سوچ لو...... یہ کیسے وقت کاٹ رہی ہے۔''

چمن جیسے ہی میکے پہنچی ماں نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کی۔ ایمن نڈھال سی ماں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چمن کا دل اگرچہ اسے دیکھ کر بہت کڑھ رہا تھا۔ تاہم پھر بھی اس نے حوصلہ دلانے والے انداز میں بات کی۔

''آپا...... مرنے سے پہلے تو کوئی نہیں مرتا۔ البتہ زندہ لاش بن جاتے ہیں۔ آپ کی دو بیٹیاں ہیں۔ ممتا کی قوت کو اپنی طاقت بنائیں۔ ماں بن جانے کے بعد عورت کو بھول جانا چاہیے کہ اس کی بھی کوئی ذات ہے۔ اسے صرف اپنے بچوں کی بہتری کے لیے سوچنا اور عمل کرنا چاہیے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی چمن...... میں کیا کروں۔ یا ور بھی مجھے سمجھنے کی کوشش کرتے تو میں ان کے ماں باپ کی ساری سختیاں برداشت کر لیتی یا کم از کم وہ اپنی اولاد کو تو وہ توجہ و پیار دیتے جو ان کا پیدائشی حق ہے۔'' ایمن نے دل شکستہ انداز میں چمن کو جواب دیا۔

''میں امی کی طرح آپ سے یہ نہیں کہوں گی کہ آپ ظلم پر سمجھوتا کر لیں۔ اب آ گئی ہیں تو آرام سے رہیں۔ دیکھتے ہیں کیا کرتے ہیں وہ لوگ؟'' چمن نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''میرا آرام میرے والدین کی تکلیف بن جائے گا...... بوجھ بن جاؤں گی اُن پر۔'' ایمن نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ پڑھی لکھی ہیں۔ بے شمار عورتیں مرد کے بغیر زندگی گزارتی ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے دن رات جان کھپاتی ہیں۔ کیوں اتنی کم ہمت بن رہی ہیں؟ مت کریں یہ مایوسی کی باتیں۔'' چمن نے ایمن کو مزید بے چارگی طاری کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔

''میں اس مفلوج ذہن کے ساتھ کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوں۔ مر جاؤں تو جان چھوٹے۔'' اب ایمن رو پڑی تھی۔ چمن نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈپریشن کی اس کیفیت کو باتوں سے کنٹرول کرنا ناممکن تھا۔ جتنی بڑی تکلیف ہوتی ہے دوا بھی اتنی ہی ہائی پوٹینسی کی درکار ہوتی ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ

ایمن کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے مزید بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

''آپ فی الحال اُس گھر سے اپنا ذہن بالکل ہٹا لیں۔ یاور بھائی کے فون کا بھی انتظار نہ کریں۔ اس گھر میں سکھ ہے۔ امن ہے پیار ہے۔ یہاں تو کھل کر سانس لیں۔'' چمن اُٹھ کر ایمن کے قریب آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ بہت پیار سے تھام لیا۔

''یہ کڑوا گھونٹ ہے ایمن، ہمیں پینا ہی پڑے گا۔ اب ہم ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں کون سا ہماری دوسری شادی کرنا ہے جو فیصلہ کرانے کے لیے بھاگ دوڑ کریں۔''

''شادی!'' ایمن کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوئی۔ ''مجھے تو شادی کے نام سے بھی خوف آتا ہے۔ جب کسی کی شادی کی خبر سنتی ہوں تو دعا کرتی ہوں یا اللہ یہ شادی سچ مچ شادی ہو اور اس دلہن کا نصیب میرے نصیب جیسا نہ ہو۔'' ایمن بول رہی تھی ماں کا کلیجہ شق ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

چمن جب سے ایمن سے مل کر آئی تھی اس کا ذہن اسی میں اٹکا ہوا تھا۔ آج تو ساس کی گفتگو میں طنز، طعنے، تشنے بھی اس کی سوچ کے تالاب میں لہریں پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ سوچ ایمن سے ہٹتی تو کسی اور طرف جاتی۔ گھر واپس آ کر اس نے معمول کے کام نمٹائے اور اپنے بیڈ روم میں آ کر پہلے نماز پڑھی پھر ڈسپرین کھا کر لیٹ گئی۔ جانے کب تک آنکھیں موندے لیٹی رہی تھی۔ نیند تو شاید رات کا وعدہ بھی نہیں کر رہی تھی، بے وقت کیسے آتی۔ لیکن ثمر ذرا سا لیٹ سہی مگر آ گیا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چمن نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اٹھنے کے بجائے ثمر کی طرف کروٹ لے کر آہستہ سے سلام ضرور کیا۔

ثمر کو اس کے بے وقت لیٹنے کی وجہ سے اگرچہ خاصی حیرت تو تھی مگر اس قدر تھکن غالب تھی کہ حیرت کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اعصاب شل ہو رہے تھے۔ کمرے کی طرف آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بس اب اندر گھستے ہی شاور لے گا تا کہ دماغ ذرا تازگی محسوس کرے۔ اس لیے اس نے چمن سے سوال و جواب کرنے کے بجائے کوٹ اور ٹائی اُتار کر صوفے پر پھینکے اور بیلٹ کھول کر بیڈ پر پھینکی۔ شاید لاشعوری طور پر بیلٹ بیڈ پر پھینکنے کے عمل کے ذریعے چمن کا کچھ ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر چمن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ثمر شرٹ کے بٹن کھولتا ہوا ڈریسنگ کی طرف بڑھ گیا۔ چمن نے واش روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کو کئی سال گزر جائیں تو بیوی کو شوہر کے واش روم جانے کے بعد واش روم سے باہر آنے کے دورانیے کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے اندر کسی قسم کا اضطرار یا بے چینی نہیں تھی۔ آنکھیں بند کر کے بالکل خالی الذہن اور خاموش لیٹنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

جانے کتنی دیر وہ ایک ہی زاویے سے لیٹی رہی تھی۔ یہاں تک کہ ثمر شاور لے کر واش روم سے باہر آ گیا تھا۔ ٹاول سے سر رگڑتے ہوئے اب اس نے بہت سوچتی ہوئی نظر چمن پر ڈالی تھی۔ اب سوال جواب کا مرحلہ قابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا، اُس نے بے ساختگی سے آخر پوچھ ہی لیا۔

''میری ماں نے پھر تمہیں اُداس کر دیا؟'' چمن نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر بڑے سکون سے گویا ہوئی۔

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تم کم بولتی ہو...... مگر تمہارا چہرہ بہت بولتا ہے۔ لیکن جب یہ بولتا ہے تو کبھی اس کی بات سمجھ آجاتی ہے کبھی اُلجھ جاتا ہوں۔'' ثمر نے اب گیلا تاول بھی صوفے پر پھینک دیا۔

آخر بیوی کس لیے ہوتی ہے۔ نوے فیصد شوہر فریج کے پاس کھڑے چلا رہے ہوتے ہیں۔ ''ارے بھئی کہاں ہو؟ ایک گلاس پانی پلاؤ۔'' گیلے تولیے، پھیلے ہوئے کپڑے، ٹائی، موزے، مختلف سمتوں میں پڑے ہوئے، سلیپر بھی شوہر کے موجودہ موڈ اور تاثرات جانچنے کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ جب شوہر کا موڈ اچھا ہو تو وہ جوتے موزے بھی بہت سکون اور اہتمام سے اتارتا ہے اور اچھے بچے کی طرح انگلیوں سے پکڑ کر سائیڈ میں بھی رکھ دیتا ہے اور جب میدانِ کارزار یا روزگار کے ٹھسّے سے کسی سے دو دو ہاتھ کر کے نکلا ہو تو گھر پہنچ کر جوتے بھی اس طرح اُتارتا ہے جیسے کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔ شاید ثمر نے ردِعمل کے لیے عمل کیا ہو۔ مگر چمن پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ جو چیز جہاں پھینکی گئی تھی اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں کسی اور وجہ سے تھوڑی ڈسٹرب ہوں۔ آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' چمن نے خود کو یوں اٹھایا جیسے بڑے بڑے پتھر سمیٹ رہی ہو۔

''میں آج لیٹ ہو گیا تھا اس لیے چائے پی چکا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تو کھانے کا ٹائم ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کھانا باہر تو نہیں کھانا پڑے گا؟'' ثمر اب آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا، ساتھ ہی آئینے میں اُسے دیکھ بھی رہا تھا۔

''اتنا خراب نہیں کہ آپ کو وقت پر کھانا بھی نہ دے سکوں۔'' چمن زبردستی کے انداز میں مسکرائی۔

''جتنا بھی خراب ہے اس کی وجہ...... امی ہیں یا افشاں؟ کیونکہ تمہیں تنگ کرنے کا ٹھیکہ تو میری ماں بہن کے پاس ہے۔''

''طنز کے علاوہ بھی کوئی بات کر لیا کریں۔'' چمن سلیپر میں پاؤں بھی پھنسا رہی تھی، ساتھ ہی بالوں کو جوڑے کی شکل میں بھی سمیٹ رہی تھی۔

''تمہارے منہ سے تو پھول جھڑ رہے ہیں بلکہ جھڑتے ہی رہتے ہیں۔ مگر تم بھی کیا کرو...... اپنی محرومیوں کے بدلے مجھ ہی سے تو لے سکتی ہو۔''

ثمر نے بال سنوار کر تنقیدی جائزہ لیا ساتھ ہی زبان کو بھی تنقید کی ترشی سے آلودہ کیا۔ چمن جو اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اس نے بوجھل اعصاب سے اضافی خدمت لینے کی کوشش کی یعنی ثمر کی بات کو نظر انداز کرنا چاہا مگر اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھی، منہ سے نکل ہی گیا۔

''مجھے میری محرومیوں کے طعنے مت دیا کریں ثمر، ابھی تک جو کچھ بھی ہے ادھورا ہے، نامکمل ہے، نامکمل مواد پر نتیجہ نہیں سنایا جاتا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے بڑھی۔

''ایک منٹ...... میری بات سنو...... کیا ادھورا اور نامکمل ہے؟'' ثمر نے غضب ناک ہو کر پوچھا تھا۔ چمن جہاں تھی وہیں رُک گئی تھی۔

''ثمر...... ہم ماڈرن نہیں الٹرا ماڈرن دور میں جی رہے ہیں۔ Mars (مریخ) پر پانی کی موجودگی کے انکشافات کر رہے ہیں۔ تصویریں کھینچ کر زمین پر بھیج رہے ہیں۔ اتنے میچور ہو گئے ہیں کہ حیران ہونا چھوڑ دیا ہے اور Latest میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ اولاد سے محرومی کی وجہ صرف عورت کے اندر نہیں ہوتی، اس لیے

اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے بالکل سپاٹ اور دھیمے لہجے میں محرومی کا طعنہ دینے والے کو احساس دلایا کہ اسے ناجائز اسلحہ دریابرد کر دینا چاہیے۔ مگر وہاں تو تیر کے جواب میں ایٹم بم تیار تھا۔

''بہت پڑھی لکھی ہو؟ ایک نمبر کی جاہل ہو۔ شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔ اتنا نہیں جانتیں مذہب نے مرد کو عورت پر قوام (نگران) بنایا ہے اور یہ برتری اسے فزیکلی بھی ہے اور Morally بھی۔ کیوں کہ وہ اپنی فیملی کے لیے جان مارتا ہے۔ سختیاں اُٹھا کر کما کر لاتا ہے اور خرچ کرتا ہے۔''

''عورت کو بھی گھر کی چار دیواری میں بہت کام ہوتے ہیں ثمر، گھر میں کتنی بھی تھک جائے شوہر کی اجازت کے بغیر اس سے پہلے سو نہیں سکتی اور اگر سو بھی جائے تو مرد تھکی ہاری عورت کو جب دل چاہے جگا سکتا ہے۔ مرد کو نگراں بنایا ہے تو اسی مذہب نے گھر میں رہنے والی عورت کے حقوق کی حفاظت کی بھی سختی سے تاکید کی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رُکی نہیں دروازہ آرام سے کھول کر باہر نکل گئی۔

ثمر کا دل چاہ رہا تھا اس وکیل نما بیوی کو کھڑے کھڑے فارغ کر دے۔

''کیسی عورت ہے یار...... امی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ اولاد نہیں ہے تو اتنا زور دکھاتی ہے۔ زبان چلاتی ہے۔ اگر شادی کے دس مہینے بعد جڑواں بیٹے پیدا کر لیتی۔ ہمارا تو اس گھر سے بوریا بستر گول تھا۔'' وہ بری طرح تلملا رہا تھا۔

مرد کی مردانگی پر ضرب کاری لگانے والی عورت کے ہاتھ سے تو پانی نہیں پینا چاہیے۔

اُسی وقت اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔

'چلو زہر مار کرتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کھانا لگا رہی ہوں گی۔' اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور خود کو سمجھاتا بجھاتا لاؤنج کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

یاور کے بستر میں جیسے کانٹے اُگ آئے تھے۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ ایمن نے نہ خود فون کیا نہ اس کا فون اٹینڈ کیا۔ اپنا موبائل تو وہ گھر پر چھوڑ گئی تھی۔ اس نے عطیہ بیگم کے موبائل پر اسے کئی مرتبہ ٹرائی کیا۔ عطیہ بیگم نے خود اس کی کال ریسیو نہیں کی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ صورتِ حال کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ اب معاملہ چلا تو بات طویل مذاکرات تک جا سکتی ہے اور مذاکرات ناکام بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کے ماں باپ خود بھی ایک جھٹکے سے تعلقات ختم کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ان کے پوتے کو ان سے دور لے گئی ہے اور اتنے دھڑلے سے رات کو گھر سے نکلنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس نے الٹرا ساؤنڈ سے پتا کرا لیا ہوگا کہ وہ اس بار بیٹے کو جنم دینے والی ہے۔ سہمی سہمی، فوراً ہتھیار پھینک دینے والی ایمن ایک دم سے اتنی حوصلہ مند کیسے ہو سکتی تھی۔

وہ پڑا گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار سرا چھوٹ کر گتھی میں گم ہو جاتا تھا۔ وہ پھر سے سرا ڈھونڈنے لگ پڑتا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے کمرے میں اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

آٹھ سالہ رفاقت...... اس پر تیسرے بچے کی آمد کا موسم...... اتنا کمزور بندھن بھی نہیں تھا کہ کھانا کھا کر آرام سے سو جاتا اور کچھ سجھائی بھی نہیں دے رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اِس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

رخ چوہدری

ردا کی نظروں کے سامنے کئی مناظر گھوم گئے۔ وہ انٹر میں تھی تو رشتے والیاں آرہی تھیں۔ ہر ماں بہن نے اس کی قابلیت اور سیرت کو پہچانے بغیر اس کی ظاہری سنہری رنگت کو ''پکا'' رنگ کہا ہے یا کہ ہم خواتین رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتی ہیں اس لیے ردا کی سنہری سانولی رنگت......

معاشرے کا ایک المیہ، خوب صورت افسانے کی صورت

''ردا...... ردا بیٹا آؤ کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

سراج صاحب نے چاولوں کی ڈش اپنے قریب کرتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا تو قدسیہ بیگم نے بھی قدرے گھور کر انہیں دیکھا۔

''آپ! کھانا تناول فرمایئے سراج صاحب آپ کی صاحب زادی آنے والے دو دنوں تک بھوک ہڑتال کرے گی۔ احتجاجاً۔''

''ہائیں...... مگر کیوں!'' میاں کی ممکنہ حیرت قدسیہ کو کھولا گئی۔

''جیسے آپ تو کچھ جانتے ہی نہیں۔''

''بخدا! جانتا ہوتا تو...... تم سے...... خیر مان لیا ہم جاہل ہیں اب بتاؤ ہماری بیٹی کی بھوک ہڑتال کس سلسلے میں ہے۔ مطلب سلسلہ کس حد تک سیریس ہے اس کے بعد ریلی شیلی کا تو ارادہ نہیں۔''

''اف! بند کریں جگت بازیاں...... اس کا موڈ کیوں آف ہے وہ کیوں ہرٹ ہے وہ کیوں دکھی ہے آپ نہیں سمجھ سکتے۔ باپ ہیں ناں مرد ہیں ناں...... اس لیے۔!! کئی آنسو ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ماں کے رخساروں کو تر کر گئے تو سراج صاحب نے نوالہ منہ میں ڈالنے کا ارادہ ترک کر کے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر قریبی کرسی پر بٹھایا۔

''تم! مائیں یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ہم باپوں کو اپنے بچوں کی تکلیف اور دکھ کا اس وقت تک پتا نہیں چلتا جب تک بتایا نہ جائے۔ باپ بھی وہی دکھ اور تکلیف محسوس کر رہے ہوتے ہیں جو مائیں کرتی ہیں ہاں اظہار کی راہ میں ان کی مضبوطی اور دلیری حائل ہوتی ہے۔ اور میڈم ہمیں مردانگی کا طعنہ دینے سے پہلے آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ آپ کی بیٹی کو Reject کر کے جانے والی خواتین آپ ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں یعنی حسب معمول اس بار بھی ہماری بیٹی کو لڑکے کی ماں نے ریجیکٹ کیا ہے جب کہ میں دیکھ رہا تھا...... لڑکے کا باپ اور لڑکا خود آگے بات بڑھانا چاہ رہے تھے۔ مگر آپ خواتین ہیں ناں...... سارا بگاڑ بھی خود پیدا کرتی ہیں اور پھر لڑتی جھگڑتی بھی خود ہی

ہیں۔"

شوہر کی ایک ایک بات درست تھی قدسیہ چپ چاپ ایک گہرا سانس لے کر کچھ کھائے بغیر اٹھ گئیں سراج صاحب نے دکھ اور کرب کا ایک گہرا کش باہر نکالنے کے بجائے اندر دبالیا۔

☆......☆......☆

رداس معاشرے کی کوئی پہلی لڑکی تو تھی نہیں کہ اس کو قبول صورت ہونے کی سزا لڑکے کی ماں بہنیں دیتی اور اس کی طرح ہر لڑکی ٹرالی کرب......، اب آپ پوچھیں گے کہ بھیا یہ ٹرالی کرب کیا نئی بیماری ان ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں یہ بیماری تو ہر لڑکی کو پیدائشی طور پر لگی ہوتی ہے۔ یعنی

جب لڑکی شادی کی Age کو پہنچ جاتی ہے تو اس پر لازم ہے کہ سر پر دوپٹہ جمائے کیک پیسٹری اور دیگر لوازمات سجا کر ان مہمانوں کے سامنے لے کر آئے جو اس کی سیرت اس کی قابلیت اس کی ڈگریوں کو پرے دھکیلے لڑکی کی صورت ناک نقشہ سب سے بڑھ کر رنگت...... ارے بھئی ہر کسی کو اپنے کوجے سے کوجے پتر (بیٹے) کے لیے چاند چہرہ ستارہ...... آنکھوں والی کانچ کا پیکر رکھنے والی...... بہو اور بھابی چاہیے اور جو لڑکیاں ماں بہنوں کا پل صراط سفر ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ عبور کرتی ہیں وہ قبول کرلی جاتی ہیں...... ورنہ ماں بہن ردا جیسی لڑکیوں کو دیکھتی ہیں پھر کانوں میں کھسر پھسر کرتی ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹے کو اٹھنے کا اشارہ کرتی ہیں جو لڑکی کو دیکھ کر سوچ رہا ہوتا ہے۔

''اچھی! ہے مگر یہ اماں اور آپا ہیں ناں...... جانے کس دور بین سے لڑکیوں میں خامیاں تلاش کرلیتی ہیں۔''

''اچھا! بہن جی رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ملنا ملانا تو رہے گا آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔''

''اجی! بھاڑ میں گئی ایسی اچھائی آپ ہماری کندن جیسی بیٹی کو پیتل کی طرح ریجیکٹ کر کے اسے احساس کمتری کی آگ میں دھکیل کر دفعان ہو رہے ہیں۔''

یہ تو وہ حقائق ہیں جو ہر لڑکی پیدائش پر اس کے ساتھ چلے آتے ہیں اب آپ کہیں گے یہ کون سا نیا ٹاپک ہے یا نئی بات ہے کہ اس پر لکھا جائے بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔

ہے ناں کہنا فقط یہ ہے کہ ہر لڑکی کا اک ایسی Rejection کے بعد ایکشن مختلف ہوتا ہے کچھ تو احساس کمتری کی دلدل میں دھنس جاتی ہیں۔

بہر حال ہر ریجیکٹ ہونے والی لڑکی کا Reaction مختلف ہوتا ہے۔ ہماری ہیروئن ردا کا ری ایکشن بھی خاصا مختلف ہے۔ جو اس بار اپنے ماں باپ کے سامنے کھڑی ہوگئی ہے۔

''میں! میں بتائے رہی ہوں...... آج کے بعد اس گھر میں کسی منحوس مارے کی ماں بہنیں آئی تو...... تو واپس اپنے گھر نہیں جائیں گی۔''

''تو! تو! وہ میرا مطلب ہے بیٹا جی کہاں جائیں گی؟''

ابا نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کی تو...... وہ ان کی طرف گھومی۔

''سیدھی! ہوسپٹل۔''

''باپ رے ہماری بیٹی تو دہشت گرد بن گئی ہے۔''

''ٹھکرائے جانے کا احساس وہ بھی اتنی بار یا تو لڑکی کو مار دیتا ہے یا پھر دہشت گرد بنا دیتا ہے۔ خیر یہ بات آپ نہیں سمجھے گے ابا...... کیوں کہ آپ ٹھکرائے جانے والی لڑکی نہیں۔''

ردا کی آواز کا موسم بھیگ سا گیا تو قدسیہ آگے بڑھیں۔

''ردا میری بچی...... تم...... تم اتنا سیریس کیوں ہو رہی ہو جان تم کوئی پہلی لڑکی تو نہیں ہو...... ہر لڑکی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔''

''کیوں! کیوں...... ماں...... کیوں ہوتا ہے چاند سی بہو تلاش کرنے والی مائیں پہلے اپنی ڈائن جیسی بیٹیاں تو گھر چھوڑ کر آیا کریں اس دن جو نہ ہونے والی میری ساسو ماں ہیں میرا ایکسرے پرنٹ نکال رہی تھیں ساتھ بیٹھی ڈائن جیسی بیٹی کو بھول گئیں جن کی آنکھیں دوسروں کو غلط فہمی کا شکار کر رہی تھیں...... وہ اپنے بھیا جان کو دیکھ رہی تھیں

میں شرما گئی کہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔''
''بہت بری بات ہے ردا...... وہ جیسی بھی تھی اللہ کی مخلوق تھی۔ اللہ تعالیٰ جیسے چاہے اپنی مخلوق بنا دے۔''
قدسیہ نے غصے میں سرخ بیٹی کے بال سنوارے۔
''یہ! یہ...... یہ ہی تو...... میں کہتی ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مصوری ہے۔ ہم آپ یا اور کوئی کون ہوتا ہے اللہ رب العزت کی مصوری میں نقص نکالنے والا پھر کیوں...... کیوں لڑکے والے لڑکیوں میں نقص نکالتے ہیں...... جب کہ بغل میں چڑیل کی ہم شکل بیٹی بٹھائی ہوتی ہے۔''
''سو فیصد درست کہہ رہی ہے ہماری بیٹی...... آخر ان لوگوں کو اپنی بیٹی بھی کی تو شادی کرنی ہو گی ان کو بھی تو باتیں سننا پڑتی ہوں گی ناں۔
''ارے! نہیں میاں بڑی لکی ہوتی ہیں ایسی چڑیلیں وہ میرا مطلب ہے لڑکیاں اس کی منگنی اس کے چچا کے بیٹے سے ہوگئی ہے وہ ڈاکٹر ہے۔
قدسیہ نے جلے دل سے کہا واقعی بات تھی بھی تو جلنے کی ان کی ٹھیک ٹھاک اچھی شکل کی بیٹی کو وہ ٹھکرا گئے تھے۔
''ارے بھئی تب ہی اتنا اترا رہی تھی وہ اس کی اماں جان۔''
''جی خود لڑکی صرف انٹر پاس ہے نخرے دیکھے تھے آپ نے جیسے آسمانی حور ہو میری ردا کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ ہو۔''
ماں اور باپ دونوں ہی دکھی تھے اپنی پرکشش اور تعلیم یافتہ بیٹی کی Rejection پر...... جو ان دونوں کو پیار سے دیکھ رہی تھی یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ کوئی آیا اور اسے Reject کر کے گیا ہو۔ اور ان تینوں میں بحث نہ ہوئی ہو والدین کا اندر ہی اندر بیٹی کی انسلٹ پر کڑھنا اور پھر اسے دلاسے دینا کہ کوئی بات نہیں بیٹا تمہارے معاشرے کی ہر لڑکی کو یہ سب سہنا پڑتا ہے مگر اس بار مختلف یہ بات ہوئی تھی کہ ردا کا رویہ بہت حوصلہ مند تھا۔ وہ جلنے کڑھنے کے بجائے بہت مطمئن نظر آ رہی تھی اور ماں باپ کو Relex کر رہی تھی۔
''Forget it! اماں بابا...... ہوتا ہے...... ایسا بھی ہوتا ہے اور جب تک عورت کی سیرت اس کی تعلیمی یا دوسری صلاحیتوں کو اس کی ظاہری شکل و صورت پر ترجیح دیتے رہیں گے ایسا ہوتا ہی رہے گا۔ ناسمجھی کی حد ناں...... ایک انسان کی بلا وجہ تذلیل کی جاتی ہے اسے ان چیزوں کی کمی کی سزا دی جاتی ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہوتیں اگر ایسا ہوتا تو ہر لڑکی سارا حسن خود میں سمیٹ لیتی تاکہ لڑکے والے اس کو Reject نہ کر سکے۔''
ماں اور باپ اپنی بیٹی کو دکھی ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مگر آج کی Rejection کے بعد جیسے ردا پھر سے پیدا ہوگئی۔ ایک عجیب سی ہمت آ گئی تھی اس کے اندر۔
'میری بچی!...... قدسیہ نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا ممتا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
''اوہ کم آن مام! مام...... Leave it سب چلتا ہے۔ آپ کو پتا ہے ماں آج جب وہ لوگ مجھے Reject کر کے گئے تو میں آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور بابا آپ کو معلوم ہے میں نے کیا دیکھا۔''
ابا بھی خاصے سنبھل چکے تھے۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
''کیا دیکھا میری شہزادی نے...... آئینے میں۔''

''ابا شاید زندگی میں پہلی بار میں نے خود پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی بلکہ میں نے ان مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے میں نے خود کو حقیت کی نظر سے دیکھا اور مجھے خود پر پیار آ گیا۔ اللہ کے حضور سجدے میں شکریہ ادا کیا۔ کہ اللہ کریم نے مجھے آنکھیں دیں جن سے میں دیکھ سکتی ہوں ناک دیا جس سے میں سونگھ سکتی ہوں زبان دی جس سے میں کلمہ پڑھتی ہوں سچ بات کہتی ہوں اور اگر بھی آپ دونوں سے مذاق میں بدتمیزی کرتی ہوں تو دانت زبان کو چبا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور رنگت سنہری گندم جیسی...... یہ تمام نعمتیں اللہ کریم نے عطا کر کے بھیجا ہے دنیا میں۔ جن میں سے ایک بھی نہ ہوتی تو میں معذور ہوتی۔ مگر میری رب العزت نے مجھے سب کچھ نوازا ہے اور پھر اللہ نے قابلیت اور تعلیمی ڈگریاں نواز کر میری شخصیت کو چار نہیں آٹھ آٹھ چاند لگا دیے ہیں۔ میں حیران ہوں آج سے پہلے مجھے اپنے اندر موجود اتنی خوبیوں نظر کیوں نہیں آئیں۔ میں اگر اللہ سے شکوہ کرنے بیٹھ جاتی کہ مجھے بھی چاند چہرہ اور ستارہ آنکھیں دی ہوتیں تو شاید...... بہر حال...... آج کے مہمانوں نے مجھے سمجھا دیا کہ تم ناشکری مت بنو اللہ کا شکر ادا کرو اور آج میں نے خود کو پہچانا ہے اللہ کی نعمتوں کو پہچانا ہے آج میں بہت خوش ہوں...... اور مطمئن ہوں۔ ہاں بس اماں بابا آپ لوگ بالکل اُداس اور پریشان مت ہوں ہاں بس ایک بات پلو سے باندھ لو...... اماں جان کہ اب میں شادی صرف اسی سے کروں گی...... جس کی ماں بہنیں مجھے خود پسند کر کے جائیں گی کوئی چاہے میرے عشق میں مر بھی جائے اس سے نہیں کروں گی...... کہیے ابا منظور ہے شرط۔''

وہ جارحانہ انداز میں ابا کی طرف گھومی اور ابا جو اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی جوان کے جینے کی آس تھی جس کو ٹھکرائے جانے کا درد دل میں لیے چپ کھڑے تھے چونک کر بولے۔

''منن...... منن منظور ہے میری گڑیا منظور ہے۔''

''مگر مجھے منظور نہیں یہ شرط۔''

اماں نے بڑی دلیری سے بیٹی کی عدالت میں اپنا فیصلہ سنایا تو بیٹی گھومی۔ ''کیوں...... کیوں اماں کیا آپ ناامید ہو چکی تھیں کہ واقعی کسی لڑکے کی ماں بہنیں مجھے پسند نہیں کر سکتیں۔''

''نہیں! بیٹا...... دیکھو ناں اگر کوئی معقول لڑکا تمہیں پسند کرتا ہے اور۔''

''اور اپنی ماں بہن کو خودکشی کی دھمکی دے کر ہمارے گھر لے آتا ہے اور ماں بہن اپنے بیٹے کی محبت میں آ کر مجبوراً مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں...... تو...... تو...... مام اس طرح بھیک میں ملا ہوا شوہر مجھے نہیں چاہیے۔''

''مام...... آئی ایم سوری۔''

ارے بھئی ہو سکتا ہے اس کی ماں بہنیں نہ ہوں میرا مطلب ہے بہن قدرتی طور پر نہ ہو اور ماں فوت ہو چکی ہو۔''

''واہ! واہ! بھئی...... بیگم آج تک تو ہم آپ کی ذہانت کے قائل ہوئے نہیں آج ہو گئے...... واہ...... کیا سوچ ہے آپ کی۔ کیا تربیت ہو رہی ہے بیٹی کی۔ میڈم شکر کیجیے آپ کا کوئی بیٹا نہیں ورنہ کسی لڑکی کی ماں بہن کی بھی آپ کے لیے یہی سوچ ہوتی ہر ماں کو بیٹیوں کے رشتے نبھانا اور رشتے جیتنا سیکھنا چاہیے...... یہ...... یہ...... نہیں کہ بہن ہو ہو ماں فوت ہو چکی ہو...... حد ہو گئی ہے قدسیہ۔''

''ارے! بھئی میں نے تو یونہی بات کہہ دی

اس کی الٹی سیدھی شرطوں سے ڈر لگتا ہے...... مجھے ...... ایسا کون سا عزیز رشتے دار بیٹھا ہے آپ کا یا میرا جو ہمارے مرنے کے بعد اس کا خیال رکھے گا۔''

''اوہ کم آن مام سیریس کیوں ہو رہی ہیں۔ کوئی عزیز رشتے دار خیال نہیں رکھتا خیال ہمیشہ وہی رکھتا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے......اور پیدا کرنے والا اللہ ہے وہی مالک ہے اسی نے خیال رکھنا ہے۔۔But یہ ہے کہ میں شادی اسی لڑکے سے کروں گی جس کی ماں بہنیں مجھے پسند کریں گی کیوں کہ اب میں کسی بھی ماں بہن کی Rejection برداشت نہیں کر سکتی۔''

ردا کی نظروں کے سامنے کئی مناظر گھوم گئے وہ انٹر میں تھی تو رشتے والیاں آرہی تھیں ہر ماں بہن نے اس کی قابلیت اور سیرت کو پہچانے بغیر اس کی ظاہری سنہری رنگت کو''پکا'' رنگ کہا جیسا کہ ہم خواتین رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتی ہیں اس لیے ردا کی سنہری سانولی رنگت کو''پکا'' یعنی کالا کہا گیا۔اس کی چھوٹی ناک کو پھینی کہا گیا ۔مناسب قد کو گٹھی کہا گیا اب آپ پوچھیں گی گٹھی کیا تو مطلب پستہ قد...... اب لڑکیاں اپنا خیال رکھتی ہیں، قہوے پیتی ہیں پودینے کا پانی پی کر خود کو اسمارٹ رکھتی ہیں تو آنے والیاں ناک پر انگلی رکھ کر سر سے پاؤں تک دیکھتی ہیں پھر ساتھ بیٹھی پڑوسن رشتے دار کے کان میں کہتی ہیں۔'' اوئی نوج یہ لڑکی تو ٹی بی کی مریضہ لگتی ہے۔''......

لیجیے اب آپ کی شخصیت ایک اور اضافہ ہو گیا یعنی آپ پھینی گٹھی پکے رنگ والی ٹی بی کی مریضہ بھی ہو گئی۔ مبارک ہو۔ آپ کو آپ ایک بار پھر ریجیکٹ ہو گئیں۔

اب آپ خود بھی انصاف کیجیے کہ ردا پھر چڑتی کہ نہ چڑتی۔ اب اس نے جو فیصلہ کیا...... ہے یقین کیجیے بالکل......ٹھیک کیا ہے مگر قدسیہ ماں ہیں ناں سو طرح کے وہم دامن گیر رہتے ہیں یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہیں کہ بیٹی کی یہ سوچ رہی تو وہ کہیں بیٹھی نہ رہ جائے کیوں کہ وہ لڑکے والیوں کو جانتی ہیں۔

''ٹھیک ہے یہ تجربہ کرلو، لیکن پھر اگر نہ ہو سکی تمہاری شرط پوری......تو میں تمہاری...... اسی سے فوراً نکاح کر دوں گی جو تمہیں پسند کرے گا۔''

''اور آپ کو یقین ہے کہ کوئی احمق مجھے ذرا سا بھی پسند کرے گا۔''

''ویسے بیٹا تم نے خود کو کچھ زیادہ ہلکا نہیں لے لیا۔ کچھ کو تو میں بھی جانتا ہوں...... جو تمہیں۔''

''اوہ کم آن ابا آپ اس جھینگر کی بات کر رہے ہیں ناں۔''

''بری بات! ابا نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔''

جی اس کی والدہ ماجدہ نے کہا یاد ہے آپ کو کیا فرمایا تھا کہ مجھے تو اپنے بیٹے کے لیے کترینہ کیف جیسی لڑکی چاہیے ہونہہ جیسے بغل میں سلمان خان لیے بیٹھی ہوں ہونہہ اور ماں آپ کی جو ایک کزن آئیں تھیں اپنے چُند بیٹے کہ ساتھ اے قدسیہ چاند لے کر آئی ہوں چاندنی لے کر جاؤں گی...... اور جب قدسیہ کی بیٹی کو دیکھا تو اپنے چاند کو جسے پہلے سے ہی گرہن لگا ہوا تھا آنچل میں چھپایا اور کہتے ہوئے چل دیں اگر تمہاری کوئی اچھی لڑکی ہو تو دکھانا اب اتنی ڈگریوں والی لڑکی کو کیا کرنا جو ساتھ چلتی اچھی نہ لگتی ہو اور یوں اپنوں اور غیروں نے آپ کی لاڈلی بیٹی کو کنویں میں دھکیل دیا۔''

بولتے بولتے ایک بار پھر لہجے کا موسم بھیگا

قریب تھا کہ بوندا باندی بھی ہونے لگتی ہے اس نے خود کو سنبھالا وہ جانتی تھی کہ اس کی بھیگی پلک اس کے اکلوتے والدین کے دل میں درد پیدا کر دیں گی تو اب اتنی بھی کمزور اور بدعقل نہیں تھی کہ عقل کے اندھوں کی سزا اپنے جانوں ماں باپ کو دیتی۔

''اچھا تو پھر فرح کی مہندی میں جانا ہے خالدہ کو منع کو دوں۔

''قدسیہ کی افسردہ سی آواز گونجی تو سراج صاحب نے برہمی سے ان کو دیکھا۔''

کیوں بھئی کیوں منع کر دوں کتنے اصرار سے بلایا ہے ان لوگوں نے ہونہہ کر دوں...... ارے بھئی بیٹی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے تا کہ۔

''اوہو آپ تو جان کو آجاتے ہیں آپ کی بیٹی ہی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتی اس لیے کہہ رہی تھی۔'' اب قدسیہ کو اپنا دفاع کرنا تو تھا ناں۔

لیکن اماں اب میں ہر تقریب میں جاؤں گی اب میں کسی سے نہیں چھپوں گی کیوں کہ اب میں نے اللہ تعالیٰ خود پر مہربانیوں کو پہچان لیا ہے۔ الحمد اللہ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے کمی ہے تو لوگوں کی عقل کی۔ اب میں نے لوگوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دی ہے۔ ہم فرح کی مہندی میں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی چاند کی ماں بہن مجھے پسند کرلے ...... ہے ناں ابا۔''

ردا نے شرارت میں کہا گیا تو ابا اندر ہی اندر اس کے لہجے میں چھپی احساس کمتری کی تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کر کے تڑپ سے گئے۔

''میری! بیٹی یہ تو معلوم نہیں لیکن یہ بات ضرور سمجھ گیا ہوں کہ واقعی عقل کے اندھے لوگ ہی تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو صرف دیکھتے ہیں پہچانتے نہیں۔''

☆......☆......☆

فرح کی مہندی پر ردا خلاف توقع بڑے اہتمام سے ہوئی تھی گولڈن کام دار سوٹ فل میک اپ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے پہن کر وہ واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی کیوں کہ وہ اب پسند کیے جانے اور ٹھکرانے سے آزاد ہو چکی تھی یعنی CareFree ہو چکی تھی ایک عجیب سا اعتماد سا آ گیا تھا اس کے اندر۔ اسی لیے مہندی کی رسم میں اس نے بھرپور حصہ لیا خاصی شوخ ہو رہی تھی۔ قدسیہ نہال وہ رہی تھیں بیٹی کو دیکھ کر۔ اور کتنی اچھی وہ لگ رہی تھی ان کو امید ہو گئی تھی کہ شاید کوئی خاتون اس کو پسند کرلیں گی اور ان سے بات کریں گی۔ ''پر کتھوں جی'' مگر ماں کی سوچ سے بے خبر ردا مہندی کے ہنگامے میں بزی تھی کسی کو مہندی لگا رہی تھی تو کسی سے بچ کر بھاگ رہی تھی...... فرح کی فیملی کوئی غیر نہیں تھی ابا کے کزن کی فیملی تھی اسی لیے سب سے فری تھی اس بار اس نے ہاتھ میں مہندی لی اور فرح کے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھی اور راحیل نے اسے بڑھتے دیکھا اور جب وہ قریب آئی اپنے بڑے بھائی کے ایک دوست ارمان کو سامنے کر دیا اور پھر کیا ہوا وہی جو فلموں میں ہوتا ہے...... یعنی کہ ارمان میاں ہیرو ہیں ہیروئین جیسے ہی ردا کا مہندی کا ہاتھ اٹھا ارمان نے مضبوطی سے ان کی کلائی تھام لی اور شوخی سے اسے دیکھنے لگا۔

''چھوڑیے میرا ہاتھ۔'' لیجیے باقاعدہ لو اسٹوری کا آغاز اس جملے سے ہو گیا۔'' کیوں چھوڑیں ہاتھ کیوں کہ ہاتھ اور ہاتھ والی ہماری مجرم ہیں اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارا یہ روپ یہ وجاہت یہ اتراہٹ تو دھری رہ جاتی

ناں مہندی لگ جاتی ہمارے اس دلکش روپ کو اور لیڈیز کمپاٹمنٹ میں ہماری سو فیصدی پسندیدگی مہندی دار ہو جاتی۔

''لگتا ہے آپ نے خود کو کبھی آئینے میں نہیں دیکھا۔خوش فہم نہ ہوں تو۔''

ارے میرا یقین کیجیے میں بالکل بھی خوش فہم نہیں ہوں آئینے میں خود کو دیکھتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنا ہینڈ سم پیدا کیا ہے۔

''یہ!یہ تو...... میری سوچ بھی رکھتا ہے۔''

اس نے آہستگی سے سوچا اور پھر اپنا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشس کی مگر گرفت مردانہ تھی اور خاصی مضبوط۔

''...... What Ever چھوڑیے میرا ہاتھ۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا کہ ہاتھ چھوڑ دوں اٹھائی گیر دل پھینک۔ٹھرکی سمجھ رکھا ہے جو شخص لڑکیوں کو ستانے کے لیے ہاتھ پکڑتے ہیں اور ایک آدھ تھپڑ کھا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

اس کی اس بات پر ردا کا تملانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔

''اچھا تو آپ پھر کیسے چھوڑا کرتے ہیں لڑکیوں کے ہاتھ۔''

اس کا طنزیہ جملہ ارمان کے دل میں تیر بن کر اترا۔

''یعنی!کہ کیا مطلب ہے آپ کا آپ نے ہمیں بھی اٹھائی گیر سمجھ لیا ارے خاتون زندگی میں یہ پہلا حادثہ ہوا ہے کہ کسی لڑکی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں آیا ہے وہ بھی ہماری خواہش کے بغیر تو جب اللہ تعالیٰ نے یہ خوبصورت ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دے ہی دیا ہے تو چھوڑ کر ہم کفران نعمت تو نہیں کر سکتے ناں...... سمجھو...... لڑکی۔''

''تو کیا کریں گے آپ۔''

''ارے کیا کروں گا یہ مت پوچھو لڑکی۔ تمہارے گھر جاؤں گا تمہیں پرپوز کروں گا۔اس ہاتھ میں پھر اپنے نام کی مہندی لگاؤں گا کیوں کہ پہلی نظر کی محبت کا بڑا شدید جان لیوا حملہ ہوا ہے مجھ پر کہ میں پہلی نظر کے اس حادثے میں جان بحق ہو گیا ہوں۔'' اس کو چڑانے کے لیے ارمان نے شوخی سے گہرا سانس لیا تو وہ غصے میں آ گئی۔''

''دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہی ہیں مگر باتیں خاصی فٹ پاتھیا ہیں آپ کی۔''

''ذرہ! نوازی ہے آپ کی۔ But I Really Mean it۔

''میرا ہاتھ چھوڑیے ورنہ۔''

''ورنہ!یار قسم سے یہ ورنہ ہی فساد کی جڑ ہے اس ورنہ ہی سے لو اسٹوری اسٹارٹ ہوتی ہے۔دشمنی شروع ہوتی ہے۔''

''آپ!آپ......''

بندے کو ارمان کہتے ہیں!جس کے دل میں آپ کو دیکھ کر ہزاروں ارمان پیدا ہو گئے ہیں۔''

وہ مسلسل شوخ جملوں سے اسے تپا رہا تھا۔

''شٹ اپ۔''

اس نے جب پوری قوت سے ہاتھ کھینچا تو اس نے بھی جھٹکے سے چھوڑ دیا...... تو ارمان کھلکھلا کر ہنس دیا وہ تلملاتی ہوئی آ گئی تو ارمان شوخ سیٹی نے دور تک اس کا پیچھا کیا وہ گنگنا رہا تھا اک اجنبی حسینہ آنکھوں کو بھا گئی ہے۔

☆......☆......☆

ارمان نے واقعی اس بات کو سچ ثابت کر دیا تھا اس نے فرح کے بھائی سے ردا کے بارے میں ساری معلومات لے لی تھی اور فرح نے تو اس کا

سیل نمبر بھی دے دیا تھا کیوں کہ وہ چاہتی تھی کہ ردا جیسی اچھی لڑکی کو ارمان جیسا اچھا جیون ساتھی ملے۔اس لیے پوری فیملی اس مہم میں شامل تھی اور پھر ردا کا اکثر ارمان سے ٹکراؤ ہونے لگا۔ وہ ردا کو چاہنے لگا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا مگر ردا اپنی ضد میں تھی کہ جب تک کوئی ماں بہن اسے پسند نہیں کرے گی وہ شادی نہیں کرے گی اور ارمان کے بارے میں تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ اتنا خوبرو اور ہینڈسم ہے۔اس کی ماں بہنوں کو تو کوئی حسین لڑکی درکار ہو گی۔ اس لیے ارمان کو پسند کرنے کے باوجود وہ اسے اگنور کردیتی۔۔

''آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں آخر۔'' وہ چڑ گئی تھی۔

''اس لیے کہ تم میں کچھ خاص بات ہے۔ اور یہ بات میں مذاق میں نہیں کہہ رہا Believe Me۔''

''تو! یہ خاص بات کسی ماں بہن کو نظر نہیں آتی۔''

دکھ کی ایک لہر اس کے ظاہری سکوت کو مرتعش کر گئی۔

''ایکسیوز می! کہاں کھو گئیں میڈم...... میں کوئی فلرٹ نہیں کر رہا آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تھرو پراپر چینل۔Because i Love You ارمان کے دل کی سچائی اور ارادے...... کی پختگی کی چمک آنکھوں میں تھی اور لہجے کی کھنک اس کی گواہ۔وہ اسے ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھنے لگی تو ارمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''I am not Joking ردا میں ایسا کیا کروں کہ تمہیں میرے جذبوں کی سچائی پر یقین آجائے اور وہ چھ ماہ سے اس کے گھر کسی بھنورے کی طرح منڈلا رہا تھا وہ تو محبت کے جانے کتنے فاصلے طے کر آیا تھا مگر ردا اجنبیت کے کسی موڑ پر کسی معجزے کی منتظر تھی۔

''آپ کو ایسا ویسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ آپ سیریس ہیں اس نے اس کی محبت کے اعتراف پر نظریں جھکالی تو وہ مچل گیا۔''

''پھر! پھر ردا کیوں مسلسل انکار کر رہی ہو۔ کیوں؟''

''Rejection سے ڈرتی ہوں۔

''اوہ تو یہ بات ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا ردا میرا یقین کرو ایسا نہیں ہوگا میری امی اور آپا مجھے اتنا چاہتی ہیں کہ میری ذرا سی خواہش رد نہیں کرتیں تو تم تو ان کے بیٹے کی پسند ہو محبت ہو...... تمہیں ریجیکٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تم Rejection کا خوف نکال دو اپنے دل سے۔''

''میں اپنی Rejection کی بات نہیں کر رہی میں آپ کی ماں بہن کی بات کر رہی ہوں کیوں کہ میں لڑکے کی ماں بہنوں سے اتنی بار ریجیکٹ کے تیر کھا چکی ہوں کہ اب فیصلہ کر چکی ہوں کہ اس درد سے دور رہوں گی اس لیے آپ اپنی محبت یا اپنی جان کا واسطہ دے کر ہرگز اپنی ماں بہن کو لے کر مت آئیں میں بری طرح انکار کر دوں گی...... اور جانتی ہوں...... غلط کر رہی ہوں مگر مجھے اب یہ درد لینا نہیں دینا ہے اگر آپ چاہیے ہیں کہ آپ کی ماں بہن کوئی دکھ نہ ملے تو مت لے کر آئیں میرے گھر ان کو۔ردا کی آواز بھیگنے لگی تو وہ آگے بڑھ گئی وہ دکھ سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

ارمان میاں کی خوش فہمی بھی دور ہو گئی جب اس کی والدہ نے اس کی پسند کی ہوئی لڑکی کو بہو

بنانے سے انکار کر دیا۔
"کیوں! امی آپ ایک بار اس سے مل لیں آپ کو پسند آ جائے گی...... ارمان کے ارمانوں پر اوس پڑنے لگی۔
"اور جو لڑکی میں نے تمہارے لیے پسند کی ہے ناں...... تم اس سے ملو گے تو۔ کہو گے امی میرا ابھی اس سے نکاح پڑھوا دیں۔"
"کون وہی لڑکی جو وقار کی شادی میں آپ نے پسند کی تھی۔"
"ہاں میں نے تمہیں اتنا ڈھونڈا کہ تم بھی دیکھ لو۔ مگر تم نجانے کہاں تھے نظر ہی نہیں آئے۔"
"میں! وقار کے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ خیر اماں پلیز آپ اس لڑکی کو دیکھ لیں آپ کی طرح ڈھیر ساری ڈگریاں جمع کر رکھی ہیں اس نے بہت اچھی ہے۔"
"اچھی تو وہ بھی بہت تھی۔"
"اماں ہو سکتا ہے اب اس کی شادی وادی نہ ہو گئی ہو...... آپ نے بھی اس کا نہ نام پوچھا نہ پتا اب بضد ہیں کہ اسی کو ہی بہو بنائیں گی۔" بیٹا نے تو بڑی اچھی بات کی تھی تب ہی تو شہل بیگم کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔
"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر کیا کروں وہ بچی مجھے اتنی بھائی تھی کہ۔"
"اماں جب اتنی پسند آ گئی تھی تو اس کا اتا پتا بھی معلوم کر لیتیں لیکن اب چونکہ اب اس کا آپ کے پاس کوئی نام و نشان نہیں تو آپ میری پسند کی ہوئی لڑکی دیکھ لیں آپ اسے دیکھیں گی تو کہہ اٹھیں گی آج ہی اس سے شادی کر لو ارمان نے تو شکر ادا کیا کہ اماں کو ان کی پسند کی ہوئی لڑکی کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں تھا اس لیے اس نے ردا سے بات کرنے کی بجائے اس کے اماں ابا کو پکڑا تو قدسیہ بے حد خوش ہو گئیں کہ اتنا اچھا خوبرو لڑکا اچھی پوسٹ والا داماد خود چل کر ان کے گھر آ گیا ہے۔"
"وہ تو سب ٹھیک ہے بیگم لیکن تم شاید اپنی بیٹی کی اتنی بڑی شرط بھول گئی ہو میری مانو تو ارمان کو منع کر دو کہ اپنی ماں بہن کو نہ لے کر آئے۔"
"ارے! واہ کیوں منع کر دوں ارے اللہ نے میری فریادیں سن لی ہیں میں تو ہرگز کفران نعمت نہیں کروں گی۔"
"اور تمہاری صاحب زادی نے جو منع کر دیا تو۔"
"ارے صاحب زادی کا تو دماغ خراب ہے نا سمجھ ہے یہ ساری باتیں تو ہمیں ہی دیکھنی چاہئیں اسے سمجھانا چاہیے چھ سات ماہ ہو گئے ہیں اب تو رشتے بھی نہیں آتے۔ رشتے کرانے والیاں بھی ردا کی وجہ سے بدک گئیں ہیں بس اللہ نے اپنا کرم کیا آپ اسے سمجھائیں کہ اب وہ بے وقوفی نہ کرے۔"
مگر جناب ردا تو ردا تھیں Rejection کی ڈسی ہوئی صاف انکار کر دیا۔
"دیکھیے ارمان صاحب میں واقعی آپ کو پسند کرتی ہوں اور آپ کی عزت بھی کرتی ہوں اس لیے میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ کی ماں بہنوں کو منع کروں یا کوئی ایسی بات کہہ دوں جو ان کو بری لگے تو......"
"آپ تو احمق ہیں انشاءاللہ وہ آپ کو پسند کر لیں گی۔"
"آئی نو وہ کر لیں گی کیوں کہ ان کا بیٹا جو ان کا جینا حرام کر رہا ہے اور یہ ہی چیز میں نہیں چاہتی یہ ہی میرا اختلاف ہے یہ ہی میری انسلٹ ہے کہ ایک جیتی جاگتی قابل لڑکی کی حیثیت ہی کوئی نہیں اسے

ان چیزوں کی سزا دینا جن کا اس میں کوئی اختیار ہی نہیں کہاں کا انصاف ہے بس کہہ دیا...... ناں نہیں کرنی مجھے شادی نہ آپ سے نہ کسی اور سے جو لڑکیاں شادی نہیں کرتی وہ کیا زندہ نہیں رہتی میں اس وقت تک نہیں کروں گی جب تک کوئی......''

''اوکے تو ویٹ کرو ایسی ماں بہنوں کا اور بوڑھی ہو جاؤ انتہائی فضول ضد پر اڑی بیٹھی ہو میں کل شام کو اپنی امی اور آپا کے ساتھ آرہا ہوں بغیر کسی میک اپ کے سامنے آنا اوکے بائے۔''

ارمان بھی تو پھر ارمان تھا اسے اپنے ارمان ردا کی ضد سے زیادہ عزیز تھے اسی لیے اگلی شام اپنی ماں بہن کو لے کر ردا کے گھر پہنچ گیا ماں ہے کہ ان کے ساتھ بچھی جا رہی ہے جو بیٹی ہے سامنے آنے کے لیے تیار نہیں۔

''جائیے جی آپ ردا کو لے آئیے......'' لیجیے مہمانوں کے سامنے آج قدسیہ نے شوہر کو بھی عزت دے ڈالی کیوں کہ سراج بھی یہ رشتہ مس نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے سر پر کفن باندھ کر بیٹی کے سامنے پہنچ گئے۔

''ابا! پلیز'' وہ ہارون کو دیکھتے ہی رو پڑی۔''

دیکھو بیٹا کبھی بھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا ہمیں زندگی کی ان باتوں کے ساتھ جینا ہے مانا کے تم اپنی جگہ درست ہو بار بار کی Rejection بچوں کو اندر سے مار دیتی ہے لیکن کفران نعمت کرنا بھی تو گناہ ہے۔ ارمان ایک باعزت نوجوان ہے گذشتہ دو سال سے تمہارے پیچھے ہے میرے ساتھ وہ گھنٹوں وہ باتیں کرتا ہے سلجھا ہوا ہے تم اسے ٹھکرا دو محض اپنی انا کی تسکین کے لیے تو میری بچی نقصان کسی کا نہیں ہوگا اسے تو ہو سکتا ہے تم جیسی کوئی اور مل جائے مگر تم ارمان کو ٹھکرا دو گی

بے چارگی

جاپان کا ایک پھانسی گھاٹ دریا کے قریب تھا تاکہ مجرم کو پھانسی دینے کے بعد دریا میں بہا دیا جائے۔ دو مجرموں کو پھانسی دی جارہی تھی۔ ایک کے گلے میں پھندا ڈال کر تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ مجرم کی خوش بختی کہ پھندا ڈھیلا رہ گیا۔ چنانچہ اس نے پھندا اُتار کر پھینکا اور دریا میں چھلانگ لگا کر فرار ہو گیا۔ دوسرا مجرم جسے پھانسی دی جانے والی تھی، یہ منظر دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ جلاد نے اُس کی کپکپاہٹ کا سبب پوچھا تو اُسے جواب ملا۔'' بھائی، پھندا ذرا مضبوطی سے ڈالنا۔'' مجھے تیرنا نہیں آتا۔''

مرسلہ: نازش درآب خان۔ خانیوال

تو شاید ارمان تمہیں دوبارہ نہ ملے...... اور تمہیں زندگی میں کوئی بہت بڑا کمپرومائز کرنا پڑے تو۔''

''ابا اگر اس کی ماں بہن نے بھی مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ارمان میرے پاؤں بھی پکڑے گا میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔...... ابا...... ابا آپ کو معلوم نہیں جب ایک لڑکی اتنی بار ٹھکرائی جاتی ہے تو اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔'' وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر شدت سے رو پڑی۔ تو ابا کا دل بھی رو دیا۔

''میری بچی میرے دل میں اتر کر تو دیکھو تو سہی ٹھکرائی جانے والی لڑکی کا باپ ہوں۔ میں تو تمہیں لگے گا تمہارا درد کم اور ماں باپ کا درد زیادہ ہوتا ہے تم نے آج تک جو کہا میں نے تمہارا ساتھ دیا تمہاری ماں کی ناراضگی بھی مول لی مگر آج میں درخواست کرتا ہوں کہ تم ارمان کی ماں کے سامنے آجاؤ۔'' ابا کی آواز بھی بھیگ گئی۔

''سوچ لیں ابا آج کے بعد یہ ٹرالی سین نہیں ہوگا؟''

''نہیں ہوگا میری بچی! آج کے بعد فریزنگ سین ہوگا تمہاری رخصتی کا سین۔''

ردا افسردگی سے مسکرا کر آگے بڑھی تو ابا اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا گئے۔

''یا اللہ میری بیٹی کو خوش کردے۔ آمین۔''

ردا جس حلیے میں تھی اسی حلیے میں آ گئی ارمان کو تو وہ ہر روپ میں حسین لگتی تھی بس امی اور آپا سے خوف آ رہا تھا اس نے چور نظروں سے ماں بہن کو دیکھا۔ ردا ہر قسم کی بات کے لیے تیار بیٹھی اپنے ٹوٹے ناخن کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹی مجھے کیوں لگ رہا ہے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔''

''دھکسی بڑھیا! میں وہاں کبھی نہیں گئی جہاں آپ نے مجھے دیکھا ہے''

یہ جملہ دانتوں میں دبا کر رہ گئی تو ارمان کی امی بے اختیار چونکیں۔

''ہاں تم وہی ہو ناں جسے میں نے وقار کی شادی میں دیکھا تھا تم دلہن فرح کے پاس جا رہی تھیں میں نے تمہیں روک کر بات کی تھی۔''

''لیجیے ساسو ماں کی تو یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ردا کو بھی وہ سین یاد آ گیا جب وہ فرح کو اسٹیج پر لانے کے لیے جا رہی تھی تو آنٹی نے دبوچ لیا تھا اور پھر ساری تقریب اپنی نظروں میں رکھا تھا۔''

''جی آنٹی...... یاد آ گیا ہے۔''

سب تو اس ملاپ پر حیران ہو رہے تھے ارمان کے سینے سے دل باہر آ رہا تھا۔ تو...... تو امی یہ وہی لڑکی ہے جسے آپ نے میرے لیے پسند کیا تھا۔''

ہاں بیٹا وہی ہے جو اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے تمہاری دلہن بنانے کے لیے پسند کیا تھا۔ مگر پھر شادی ختم ہوگئی تو افسوس رہا کہ اس کا اتا پتا نہیں معلوم کیا۔ فرح کی امی سے پوچھا تو وہ پہچان نہیں پائیں کہ اس قسم کی تو ڈھیروں لڑکیاں تھیں۔''

''ہوں تو ساس کو گویا اپنی بچھڑی ہوئی بہو مل گئی اسی خوشی میں اپنا وعدہ پورا کیجیے۔''

''کون! سا وعدہ بیٹا۔''

''وہی کہ جب میری پسند کی ہوئی لڑکی کو دیکھو کے تو فوراً کہو گے کہ امی آج ہی شادی کروا دیں۔''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں بیٹا میں خود بھی یہ نہیں چاہتی کہ یہ پیاری لڑکی دوبارہ کہیں نہ کھو جائے۔''

ردا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش پوری کر دی تھی کہ اسے ارمان کی ماں نے پہلے پسند کیا اور بعد میں ارمان نے۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کے حضور توبہ کر رہی تھی کہ اپنی ضد کی وجہ سے اس نے اپنے والدین کو پریشان کیا اور شکر بھی ادا کر رہی تھی کہ اللہ نے اس کی خواہش کو پورا کیا۔''

لیجیے ردا کی شادی ارمان سے ہوگئی ماں باپ بھی خوش لڑکا لڑکی بھی خوش ہو سکتا ہے ردا کی کہانی آپ کو فضول لگے کچھ کو فلمی بھی لگے ہو سکتا ہے ووٹ ردا کے حق میں...... یا مخالف میں ہوں۔ مگر یہ بات یہ ہے کہ یہ اُس ہر لڑکی کی کہانی ہے جو ردا جیسی ہوتی ہیں لڑکے والوں سے فقط یہ کہنا ہے کہ کہ کسی لڑکی کو اس کی کمی کی سزا مت دیں اس کی سیرت کو پہچانیں اس کی قابلیت ہنر کو پہچانیے ہر لڑکی میں خوبیاں موجود ہوتیں ہیں کسی بھی لڑکی کو رنگ روپ قد جسامت کی وجہ سے ٹھکراتے ہوئے ایک پل صرف ایک پل کے لیے ضرور سوچیے گا اللہ آپ کا بھلا کرے گا ہو سکتا ہے سوچ کا یہ پل کسی دوشیزہ کا گھر آباد کر جائے...... ذرا سوچیے گا۔''

☆☆......☆☆

افسانہ

عقیلہ حق

لکیر

لکیر کے اُس پار، برمودا ٹرائی اینگل میں گھومتے...... چکراتے مجھے احساس ہو رہا ہے یک طرفہ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے کہ جب وہ بجتی ہے تو کرنے والے کے منہ پر پڑتی ہے اور پھر وہ اپنا ایسا نشان چھوڑ جاتی ہے کہ کرنے والے کہ پاس کہنے کے لیے لفظ تو بڑی بات......

آگاہی کا کرب لیے، ایک خوب صورت افسانہ

ان لفظوں نے جیسے اسے پتھر کا کر دیا تھا پرخچے اڑا رہا تھا...... ان لفظوں نے اس کے آگے حرف حرف ایک بم کی طرح اس کے چہرے کے ایک لکیر کھینچ دی تھی۔ ایک ایسی لکیر جس کا کوئی

وجود ہی نہیں تھا...... لیکن لکیر تھی۔ ایک ایسی لکیر جو اس کو اس کی اوقات...... اس کی حیثیت بتا رہی تھی ایک ایسی لکیر جس نے اس کو اس کے وجود اس کی محبوں، خواہشوں، اور احساسات کو دیوار پر دے مارا تھا۔

وہ نظر نہ آنے والی لکیر سیکنڈوں سیکینڈ وں کے حساب سے گہری ہوئی چلی جا رہی تھی۔

گہری...... مزید گہری۔

لکیر جو کہ دیوار بننے لگی تھی...... ایک ایسی دیوار جس میں گارے اور سیمنٹ کے بجائے اس کا خون اس کا گوشت استعمال ہو رہا تھا۔ اپنے وجود کے چیتھڑے اس کو ان پتھروں کے درمیان سسکتے روتے...... لکھتے نظر آ رہے تھے......

لیکن وہ کیا کر سکتی تھی...... دیوار مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ، بلند بھی ہوتی جا رہی تھی دیوار چین سے زیادہ بلند......

بلند...... اور بلند...... ایسی بلند کے اس کو سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی......

وہ بلبلانے لگی۔

زندگی کے لیے تڑپنے لگی......

موت سے پہلے اپنی موت پر رونے لگی۔

اس کا دل چاہا کہ اس دیوار کو گرا دے...... اس لکیر کو مٹا دے......

یا پھر اس دیوار کے ملبے تلے دب جائے...... کسی کو نظر نہ آئے......

☆......☆......☆

آپا اور میں...... بہنیں نہیں میں اور آپا کے بچے بلکہ ہم سب......

ارے چھوڑیے میں بات یوں کروں یا ووں کروں...... مقصد ایک ہی ہے کہ ہم ایک دوسرے میں ایسے مدغم تھے جیسے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں......

ٹھہرے...... آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں آپ کو دوسرے انداز میں بتاتی ہوں......

☆......☆......☆

بتا سکتی ہیں کہ آج آپ کی سواری یا باد بہاری کہاں گئی ہوئی تھی...... میں نے جیسے ہی چادر تہہ کر کے الماری کھولی اسماء کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یا اللہ اسماء تم بھی نا......!

تم کو اپنے گھر میں کوئی کام کاج نہیں ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

جی ظاہر ہے میں صرف اپنے گھر کا کام کرتی ہوں۔ میں نے اپنے وجود کو کسی کی غلامی میں نہیں در رکھا۔

ہمارے گھر اور میری زندگی میں جمہوریت ہے......

میں کسی ڈکٹیٹر سے ڈکٹیشن نہیں لیتی...... اس لیے میرے پاس وقت بچ ہی جاتا ہے۔

”لیکن آپ بلقیس ایدھی اور عبدالستار ایدھی کی جانشیں کسی کے در جھاڑو دینے گئی ہوئی تھیں آپ بتا رہی ہیں یا تکلیف میں کروں......

اسماء کہتے کہتے رکی تو اس کے انداز پر میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

اسماء میری بچپن کی دوست تھی...... میں تو شاید اس کو صرف دوست سمجھتی تھی لیکن میری حیثیت اس کے نزدیک بہنوں سے زیادہ تھی......“

ویسے مجھے یقین ہے کہ تم یا تو بڑی آپا کے گھر ان کے پودے دھونے گئی ہوئی ہو گی یا پھر ان کی اپنی اس کمیٹی کے پیسے دینے گئی ہو گی جو تم کو کبھی ملتی ہی نہیں ہے۔

کیا ہوا جو میں نے آج ان کے قالین دھو دیے تو...... وہ میری بڑی بہن ہیں...... اگر میں ان کا کوئی کام کرتی ہوں تو کونسی بری بات ہے۔

"دراصل اسماء تمہاری کوئی بہن نہیں ہے نا تم
تمہیں اس رشتے کی خوبصورتی کا احساس نہیں
ہے۔" میں نے جلدی جلدی روٹی بیلتے ہوئے
کہا...... ابا مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھاتے تھے
اور اماں کے بعد کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ابا کو کھانے
کے لیے انتظار کرنا پڑا ہو......

ہم دو بہنیں اور پانچ بھائی تھے آپا سب سے
بڑی تھیں اور میں سب سے چھوٹی......

ایک ایک کر کے بچپن میں ہی پانچوں بھائی
اللہ کو پیارے ہو گئے...... اور رہ گئی میں اور آپا......
اور آپا اور میرے درمیان ماں بیٹی جیسی عمر کا فرق
مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا اسکول میں پہلا دن
تھا اس وقت آپا کی یونیورسٹی میں پہلی کلاس تھی۔

میرا تھا ہی کون؟

ایک ابا اور ایک میری آپا۔

میں میٹرک میں تھی تو اماں چل بسیں...... میں
جو اماں کا دوپٹہ پکڑ کر چلتی تھی غیر ارادی اور غیر
اختیاری طور پر آپا کے پیچھے پیچھے چلنے لگی......

آپا ہمیشہ مجھے اپنی ماں جیسی لگیں بلکہ یہ کہنا غلط
ہوگا کہ میری ماں جیسی......

آپا میری ماں بن گئیں اور میں آپا کے بچوں کی......

"تم نے کبھی سوچا زرین کے تم کتنی مصروف رہتی
ہو...... تمہاری آپا کو ذرا بھی خیال نہیں کہ تم کو آرام
کرنا ہوگا۔ تمہاری اپنی بھی کوئی لائف ہے یا نہیں۔"

اسماء کی آواز مجھے حقیقت میں واپس لے آئی......

اس کے لہجے میں میرے لیے محبت اور فکر تھی......

روٹی پکاتے پکاتے میرا ہاتھ ایک لمحے کے لیے
رکا اور پھر میں توے پر ڈالی ہوئی روٹی کی طرف متوجہ
ہوگئی......

"ارے چھوڑو میری جان...... وائٹل پیو اور
زندگی جیو...... میں نے برابر والے چولہے پر سے
ابلتی ہوئی چائے مگ میں انڈیل کر منہ بناتی ہوئی
اسماء کے ہاتھ میں پکڑوائی......

اور خود دسترخوان لے کر کچن سے باہر نکل
گئی......

☆......☆......☆

ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایک ماں کے پیٹ پر
پیر پھیلانے والے...... ایک دسترخوان پر کھانا
کھانے والے اور ایک ہی تکیہ پر سر رکھ کر سونے
والے بہن بھائی رشتے دار بن جاتے ہیں۔

اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ رشتہ دار کنبہ دار
بن جاتے ہیں......

اور کنبہ دار کون ہوتا ہے؟

کنبے دار وہ ہوتے ہیں جو ہماری تقریبات کی
لسٹ میں نہیں ہوتے...... لیکن وہ ہمارے لیے بس
ایک حوالہ ہوتے ہیں اور پھر وہ حوالہ نئے رشتوں کے
وجود میں آنے کے بعد کہیں گم ہو جاتا ہے...... اور
جب ہم رشتوں کی گھتیوں کو سلجھاتے سلجھاتے ان
کی حقیقتوں کو جان پاتے ہیں...... تو ہمیں احساس
ہوتا ہے کہ لاشعوری یا شعوری طور پر......

احساسات اور محبتوں کے ہاتھوں......

مستقبل کے غیروں کے لیے ہم اپنا سب کچھ
ہار چکے ہوتے ہیں...... حتی کے رونے کے لیے
ہماری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں بچتے......

☆......☆......☆

ابا ہمیشہ گھر کے معاملات سے دور ہی رہتے تھے سو
اماں کے انتقال کے بعد...... گو کہ آپا کی شادی ہو چکی
تھی پھر بھی گھر کی بادشاہت آپا کو سونپ دی گئی۔

میں آپا کے فیصلوں پر چلنے لگی......

آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ فرماں
برداری نہیں تھی...... وہ محبت نہیں تھی......
وہ غلامی تھی...... میں آپا کی غلامی میں چلی گئی

لیکن کیسے......!

☆......☆......☆

ابا اماں کو اس قدر چاہتے تھے اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب اماں کے انتقال کے چند سالوں بعد ہی وہ ان کے پہلو میں جا سوئے......

اور پھر دنیا میں میرے لیے کیا رہ گیا!

میری آپا...... میری ماں جائی...... میرا واحد خون کا رشتہ۔

☆......☆......☆

تو تم اپنی آپا کے ساتھ رہو گی...... اسماء نے مجھے پیکنگ کرتے دیکھ کر کہا...... جواب جانتے ہوئے بھی سوال کیا!

''ظاہر ہے یار اب میں اتنے بڑے گھر میں اکیلی تو نہیں رہ سکتی نا اوپر سے آپا بھی میری طرف سے بہت پریشان رہتی ہیں تو آپا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ رہوں......'' میں نے جلدی جلدی اپنی کتابیں بیگ میں بھرتے ہوئے اسماء کو بتایا......

اور یہ گھر......!

یہ گھر تو آپا نے بیچ دیا ہے نا...... میرا انداز سرسری تھا۔ بیچ دیا......

لیکن کب؟ اسماء کی تو جیسے چیخ ہی نکل گئی۔

''ابا کے چالیسویں کے فوراً بعد ہی...... آپا کہنے لگی اب گھر کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے مکان کا سارا پیسا میرے نام بینک میں رکھ دیا ہے۔''

''اچھا!'' میری وضاحت...... پر اسماء کے منہ سے طنزیہ نکلا۔

کیا مطلب؟ میں اس کے طنز پر حیران ہوئی۔

''ارے زرین...... تم کو کب عقل آئے گی...... اسماء کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرا سر پھوڑ دے...... ظاہر ہے جتنی عمر ہے اتنی تو عقل ہے لیکن تم نجانے کون سی نانی دادی والی عقل کی بات کر رہی ہو مجھے لگتا ہے تمہارے اندر دو سو سال والی بوڑھی اور جہاندیدہ عورت کی روح سمائی ہوئی ہے......

میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات کو ہوا میں اڑا دیا۔

یہ جو تم اپنا آپا نامہ پڑھتی رہتی ہو نا تو سن لو زرین یہ پیار اور محبت بس دو دن کا ہونا ہے۔ اور سامنے زندگی کی تلخ حقیقت آجاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد تمہارے بہنوئی کو کاروبار میں نقصان ہوگا اور آپا کہ منافع کی یقین دہانی پر تمہارا پیسہ ان کے کاروبار میں لگا دیا جائے گا۔ اور پھر وہ رقم تم کو کبھی نہیں ملے گی......اور پھر رہ جاؤ گی تم صرف 110 پونڈ کا بوجھ...... ذمہ داری اور مصیبت......

آج لیکر سوال کر رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا اسماء......

☆......☆......☆

بھئی بہت ہی نیک کام ہے اللہ ایسی بڑی بہن سب کو دے...... کاش تمہاری جیسی کوئی بہن ہماری بھی ہوتی...... اور آج تمہارے ماں باپ کی روحیں کس قدر خوش ہوں گی...... تم نے اپنی بہن کے لیے کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے...... اللہ ہر ایک کو تمہاری جیسی بیٹی اور بہن دے......

نجمہ خالہ نے میری کمیں آپا سے میری رخصتی کے وقت کہا...... تو میرا دل بھر آیا......

میری رخصتی...... میری شادی......

آپا کے گھر میں نجانے کیوں فٹ نہ ہو سکی......

جبکہ آپا کے بچوں میں میری اور ان کی مجھ میں جان تھی......

آپا نے مجھے کھانا پکانے اور سلائی کڑھائی طاق کر دیا تھا۔ میں نے بھی بیٹیوں کی طرح آپا کو جیسے تخت پر بٹھا دیا تھا......

میں نے بچن کے ساتھ ساتھ آپا کا پورا گھر ہی سنبھال لیا تھا۔

آپا کے اور آپا کے چاروں بچوں کے کپڑے سینے اور کاڑھنے تک میں ہی تیار کرتی......

آپا بس آرام کرتیں......

میری تعلیم مکمل نہ ہو سکی لیکن منا اور ثناء کیوں کے گھر کے کاموں اور الجھنوں سے دور رہتیں سو وہ ہمیشہ اچھے گریڈ لے کر ہی پاس ہوتیں......اور میں ان کی کامیابیوں پر خوش رہتی......ہم بہنوں کی طرح کھیلتے باتیں کرتے، اور پھر ثناء کی منگنی ایک ڈاکٹر سے ہوگئی اور میری شادی مزمل سے۔

مزمل ایک اسکول ٹیچر تھے لیکن بہت اچھے......

میں محبت کی طلبگار تھی اور مزمل مجھ سے بہت محبت کرتے تھے......

☆......☆......☆

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم لفظ زوال پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہی کہ وہ ہمارا نقطہ عروج ہے لیکن درحقیقت وہ ہمارا نقطہ انجماد ہوتا ہے اور وقت کی گرمی اس نقطہ کو مزید نیچے جانے پر مجبور کردیتی ہے۔

☆......☆......☆

آپا کے احسانات اور مہربانیوں کی گٹھڑی نے کبھی میرا سر اٹھنے نہیں دیا گو کہ اب میرے بھی چار بچے تھے...... میری فرمانبرداری...... محبت...... عزت...... آپا کے لیے روز اول کی طرح تھے۔

اگر آپا مجھ سے کسی کام کو آدھی رات کو بھی کہتی تو میں کچھ بھی کرتی اپنے وسائل اور مسائل سے لڑتی کبھی کبھی مزمل کے حلقہ محبت سے باہر نکل جاتی لیکن پھر بھی آپا کا مان رکھتی۔

میرے پاس گاڑی نہیں تھی میرے بچوں کا ننھیال ابا کا گھر تھا سو ہر ہفتے میں اپنے بچوں کو لے کر سارا دن آپا کے گھر ضرور جاتی۔

کبھی کبھی آپا ہمیں الجھی ہوئی لگتیں......

بیزار...... بیزار سی جھنجھلاتی ہوئی سی......

میرے بچوں کی محبتوں پر وہ اپنے ان کو جھڑک کر رکھ دیتیں مزمل آتے تو کبھی دل چاہتا تو اپنا کمرہ بند کر کے سو جاتیں یا اپنی وہ ذمہ داریاں بتاتی رہتیں جو انہوں نے ابا کی اٹھائیں ہیں...... نبھائیں ہیں...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا......

مجھے کچھ نظر نہیں آتا، اکثر مزمل مجھے بہت سی ایسی باتیں جتاتے جو میرے خاندان کی سیکریٹ تھیں...... میرے دل کو مزمل سے شکایت رہنے لگی۔

میں محبتوں میں سمجھوتہ نہیں کرتی......

میں محبت کرتی ہوں اور بے تحاشہ کرتی ہوں لیکن ایک بات آپا کو بتا دوں میں ہر کسی سے محبت نہیں کرسکتی لیکن مجھے آپا اور آپا سے وابستہ ہر چیز سے محبت تھی......

محبت تھی......!

☆......☆......☆

لکیر کے اس پار، برمودا ٹرائی اینگل میں گھومتے...... چکراتے مجھے احساس ہو رہا ہے یک طرفہ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے کہ جب وہ بجتی ہے تو کرنے والے کے منہ پر پڑتی ہے اور پھر وہ اپنا ایسا نشان چھوڑ جاتی ہے کہ کرنے والے کے پاس کہنے کے لیے لفظ تو بڑی بات...... سانس لینے کے لیے آکسیجن بھی نہیں بچتی......

زندگی کے اس موڑ پر کھڑے ہو کر، جب وقت، ریت کی طرح میری مٹھی سے پھسل گیا اب گزرا وقت مجھ کو کبھی نہیں مل سکتا...... میں سوچ رہی ہوں...... عشق حقیقی اور عشق مجازوں کے درمیان ہچکولے کھاتی میری زندگی......

☆......☆......☆

.....مزمل پلیز آپ اسکول سے واپسی پر آپا کے گھر سے میرا موبائل لے آیئے گا کل اس کو آپا کے پاس بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر بھول آئی ہوں موبائل نہ ہو تو لگتا ہے آپ کا دنیا سے رابطہ ہی ختم ہو گیا ہے میں نے صبح ناشتے کے وقت مزمل کو دس منٹ میں کوئی پانچ مرتبہ تاکید کی۔

آپا کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

کل جب اتفاقاً آپا کے گھر گئی تو ثناء اور مینا آئی ہوئی تھیں اور دلہن کے نکاح کا سوٹ کٹ رہا تھا......

ماشاء اللہ ایسی رونق تھی کہ واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

''ارے آپا دیکھیں اس کو کہتے ہیں محبت صبح سے ہی میرے دل کو لگی ہوئی تھی آپ کے گھر آؤں، میرے پاس پیسے نہیں تھے میں نے بچوں سے کہا چلو کوئی بات نہیں W-11 زندہ باد لیکن جانا ہے ......دراصل آپا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دلہن کا جوڑا کٹ رہا ہو اور میں نہ ہوں......''

ارے تم مجھ کو ہی فون کر دیتیں تو میں مٹھائی کا ڈبہ ہی لے آتی...... میں نے ثناء کا ویکس ہوا اور سونے کی چوڑیوں سے سجا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے شکوہ کیا......

لیکن کمرے میں موجود کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا......

''چلو بچو کو تو ہٹاؤ......اس قدر قیمتی سوٹ ہے ہاتھ لگائے جا رہے ہیں۔'' آپا نے میری طویل بات کا مختصر اور غیر متعلقہ جواب دیا۔

اور میں چپ سی ہو گئی......

آپ کا کیا خیال ہے چپ نہ ہوتی تو اور کیا کرتی......

☆......☆......☆

بھئی میں تنگ آ گئی ہوں ان ذمہ داریوں سے......اس کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ میرا بھی گھر بار ہے، بچے ہیں جب دل چاہتا ہے اپنے حواریوں کو لیے چلی آتی ہے۔

اور کیا امی آپ تو ساری زندگی ان کے مسائل میں ہی الجھی رہتی رہیں......حارث (آپا کا بیٹا) کی آواز آئی۔ وہ بول رہا تھا جس کو میرے سینے پر سر رکھے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی......

کسی جذباتی لمحے میں، میں نے ابا سے ان کی ذمہ داریاں نبھانے کا عہد کر لیا تھا مجھے کیا پتا تھا وہ ایک لمحہ میری ساری زندگی پر محیط ہو جائے گا......

تنگ آ گئی ہوں میں ان سب سے۔

اور تم لوگ......تم لوگ بھی بہت ہی قابو سے باہر ہو رہی ہو......بھئی اب پتا کا ٹو......

کیا کرتی امی......آپ یقین تو کریں، نہ فون کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا فون اٹھاتے ہیں، کس کے پاس ٹائم رکھا ہوا ہے، ان کے دکھڑے سننے اور ان محبتوں کی داستانیں کا جو بقول ان کے انہوں نے ہم سے کی ہیں، ہماری اپنی زندگی ہے......کب تک ہم آپ کے رشتوں کو نبھاتے پھریں گے۔

الفاظ تھے کہ بارود...... وہ مسلسل بول رہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش فون کی چارجنگ ختم ہو جائے کاش جتنی محبت میں نے تم لوگوں سے کی ہے اتنی میں اپنے اللہ سے کرتی۔ وہ اللہ جو کہتا ہے تم ایک قدم بڑھاؤ میں دس قدم بڑھاؤں گا۔

وہ اللہ جو اپنے بندوں سے ان کی ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔

میں بدنصیب، انسانوں سے محبت میں اتنی غرق ہو گئی میں مخلوق کی محبت میں خالق کی محبت کو فراموش کر بیٹھی......

میں نے ان انسانوں سے محبت کی جن کی حقیقت کم ظرفی ہے۔

بعض اوقات ہم کو محبتیں وہاں لا کر پھینکتی ہیں کہ ہم مارے شرمندگی کے مر بھی نہیں پاتے
ہماری عزت و نفس...... انا...... خودداری...... ہوا میں کہیں تحلیل ہو جاتی ہیں ہمارے اردگرد لفظوں کی آگ لگ جاتی ہے......
ہم برمودا ٹرائی اینگل کے بھنور میں ڈوبنے اور ابھرنے لگتے ہیں
ہم ایک اندھے کنویں میں جا گرتے ہیں اور ہمارے رشتے اس اندھے کنویں کے منہ کو اپنے لفظوں کے نوکیلے پتھروں سے بند کر دیتے ہیں......
آپا نے میرے اور اپنے بچوں کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہے...... ایک ایسی لکیر جو ان کی زندگی میں میری حیثیت اور اوقات کا تعین کرتی ہے
اب شاید آپا چاہیں بھی تو وہ کھینچی ہوئی لکیر کبھی نہیں مٹ سکتی
میں محبتوں کی ترسی...... ایک ایسی لڑکی تھی جس کے گرد کوئی رشتہ نہیں تھا......
میرا سب کچھ تھیں آپا......
آپ کے لیے میں نے ہمیشہ مزمل کی بات کو رد کیا......
آپ کے حکم اور آپ کے فیصلوں کو اپنی زندگی اور گھر میں رائج کیا...... اور نتیجہ میرا بہت محبت کرنے والا شوہر ایک روایتی مرد بن گیا......
میں نے آپ کے جوان بچوں کی خوشیوں پر اپنے معصوم بچوں کی شرارتوں کو کبھی محبت سے جواب نہیں دیا...... میرے بچے مجھ سے دور ہو گئے۔
میں صرف ان کے کام کرنے والی ایک عورت بن گئی۔
میں نے سارا خزینہ محبت لٹا دیا...... آنے والے وقتوں کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہا......
میں کیا کروں کس سے قصہ غم کہوں؟
کسی کو بتاتی ہوں تو لوگ سوال کریں گے......
میں کسی سے کیا کہوں گی کہ محبتوں میں سوال نہیں ہوتا...... محبتوں میں سودے بازی نہیں ہوتی......
میں بد نصیب محبت ہوں......
میری محبتوں کے نصیبوں میں زوال تھا......
زوال محبت......
پائمالی محبت......
تقدیر میں رقم تھی...... اور تقدیر......

☆......☆......☆

کاش میرا موبائل چھن جاتا...... چوری ہو جاتا......
کاش مجھے نہ ملتا......
جب مزمل نے بتایا کہ موبائل آپا کے کمرے میں نہیں ہے میں آپا کی سیڑھیوں پر گرا آئی تھی......
جو آپا کے بچوں کو مل گیا تھا......
اس بات کو سن کر کئی کاش میرے آئندہ زندگی کا حصہ بن گئے......

☆......☆......☆

لکیر...... دیوار...... بن گئی تھی۔
گارے اور سیمنٹ کی جگہ میرے خون اور گوشت کے چیتھڑے جھانک رہے تھے۔
میرا دم گھٹ رہا تھا......
میرا دل دھاڑے مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا......
لیکن روایتوں کی رشتوں میں گھری
میکہ اور سسرال کی چکی میں پستی
میں ایک مشرقی عورت......
میں نے آنکھیں بند کر کے...... مصلحتوں کے ہاتھ کانوں پر رکھ کر......
کرب کی چادر میں اپنے آپ کو چھپا لیا......
اور اب مجھے اسی طرح
ان ہی حقیقتوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے جینا تھا......
اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

☆☆......☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

گود تو میری بھی خالی تھی ناں عبدالہادی! نامراد تو میں بھی تھی۔ پھر لاریب نے یہ سخاوت اور فیاضی صرف عمیر کے لیے کیوں دکھائی؟ کیا اس کے لیے یہ گھر کی بات تھی......؟ یا ان کا دکھ سانجھا تھا۔ اور میں...... میں جو لاریب کی گہری سہیلی تھی۔ رازداں تھی۔ اس سے سب سے......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا تیرہواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر

اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سردمہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جو اب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر ہراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنور لی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس گھٹیا حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اس بارے میں کوئی ذکر تو کُجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اِس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں بیٹے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور عبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

اے میرے کُن فیکون
میں تیری حد سے کہاں دور نکل سکتا ہوں
تیری مرضی ہے مجھے توڑ دے یا پھر سے بنا
پھر مجھے خاک کر کے یونہی جینا سکھا
میرے اندر جو خلا ہے میرے مالک بھر دے
تُونے جو خاص توجہ سے بنایا ہے یہ دل
اس کو مٹی میں ملا دے یا پھر پورا کر دے
میرے خالق! میں تیرے کُن کی طلب میں زندہ
ہر گھڑی ایک قیامت سے گزر جاتا ہوں
اتنی شدت سے میرا پہلو سنگ اٹھتا ہے
ضبط کی ہر حد سے گزر جاتا ہوں
مر جاتا ہوں
اے مرے کُن فیکون
اے میرے کُن فیکون!

دعا کو پھیلے ہاتھوں میں آنسو پلکوں کی جھالروں سے ٹوٹ کر بے تابانہ بکھر جاتے تھے۔ بے قراری کا عجب عالم تھا۔ سوز و گداز روح پگھلائے جاتا تھا۔ وہ جب بھی بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتی انکساری و عاجزی کے ساتھ گڑگڑاہٹ کا انداز ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ عبدالہادی نے بارہا مرتبہ اب تک اس کی کیفیت دیکھ رکھی تھی۔ مگر آج انداز میں عجیب سی وحشت بھی پائی تو خود مضطرب ہونے لگا۔ بہت بار چاہا، آگے بڑھے اور دلاسہ دے مگر ہر بار رک گیا وہ جس دربار میں حاضر تھی وہاں خالق و مخلوق کے بیچ حائل ہونے کی جرات کسی تیسرے کو نہیں ہو سکتی۔ وہاں ضرورت بھی نہیں ہوا کرتی کسی تیسرے کی......

خالق سے بڑھ کر مخلوق کو سمجھنے سمجھانے اور دلاسہ دینے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ بھی خاموش بت بنا بیٹھا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود منہ پر ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جائے نماز تہہ کر کے اس

کی نگاہ عبدالہادی پر اٹھی، اسے موجود اور متوجہ پا کر نجانے کس احساس سے اس کا چہرہ سرخ پڑا تھا۔ جب ہی ہونٹوں کو باہم بھینچتے ہوئے رخ موڑ لیا۔ عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا اور خود اٹھ کے اس کے مقابل آ گیا۔

گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک تر ہونٹ شدت جذب کے باوجود کپکپاتے تھے۔ صبح کی تمام تازگی اور روشنی سمیٹے چہرہ حزن کے باوجود جکڑ لینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔

''آج کچھ زیادہ اداس ہیں لیزے......؟''

عبدالہادی نے ہاتھ بڑھایا اور اسے بازو کے حلق میں لے لیا۔ وہ چپ رہی البتہ سسکیاں پھر سے بکھرنے لگی تھیں۔ عبدالہادی نے اسے سمیٹ کر خود کے اور قریب کیا۔

''اگر اس خیال سے کہ یہاں سے جانے پر آمادہ نہیں ہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا آپ......''

''یہ بات نہیں ہے......'' وہ بے اختیار ٹوک گئی۔ عبدالہادی نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔ گویا وجہ جاننا چاہی۔ وہ محض ہونٹ کچلتی ہاتھ کی انگلیاں مروڑتی رہی۔

''لیزے......! عبدالہادی کے لہجے میں اصرار نہیں تھا۔ التجا آمیز عاجزی تھی۔ گویا اسے یقین سونپ رہا ہو۔ اس کی یہ بے قراری، یہ اضطراب اس کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔

''آپ کہتے ہیں ناں عبدالہادی! اللہ نے مجھے معاف فرما دیا ہوگا......''

اس کی آواز بھیگی ہوئی اور بہت دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عبدالہادی نے انگشت شہادت سے اس کا نم گال تھپکا۔

''کیا شک......'' وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ گھپ اندھیری رات میں گویا صبح امید جیسی حوصلہ افزا اور دل نشیں ہوا کرتی تھی یا علیزے کو ہمیشہ لگتی تھی

مگر آج اس کا دل بہلانے کا باعث نہ بن سکی۔ وہ اتنی ہی زود رنج ہو رہی تھی۔

''ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے عبدالہادی! آج پورے دو سال...... ان دو سالوں میں سب پہ اللہ کی ہر نعمت و عنایت ہوئی سوائے ہمارے...... بھائی کے ہاں عبدالعلی اور احد کے بعد بیٹی چلی آئی۔ دو دن کی ہو گئی ہے وہ بھی۔ عبیر کو بھی اللہ نے بیٹے سے نوازا یہ الگ بات کہ وہ جی نہیں سکا۔ بجو بھی پھر امید سے ہیں اور میں......''

''وہ بات مکمل کیے بنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عبدالہادی جو بہت دھیان سے سن رہا تھا، گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

''کیوں پریشان ہوتی ہیں علیزے! صرف دو سال گزرے ہیں، ہماری زندگی تو نہیں اللہ سے ہمیشہ پر امید رہتے ہیں سویٹ ہارٹ!'' وہ اسے صوفے پر بٹھا کر خود اس کے لیے پانی لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو زبردستی دو گھونٹ پلا سکا تھا۔ وہ اسی اضطرابی کیفیت کے زیر اثر سر کو نفی میں جنبش دیتی رہی اور اسی تسلسل سے آنسو بہاتی تھی۔

''آپ سمجھ نہیں رہے عبدالہادی! یہ بھی میری غلطی، میرے گناہ کے باعث ہو رہا ہے۔ میں نے...... میں نے اس کی نعمت کو ٹھکرایا تھا۔ قتل کیا تھا، خود اپنی اولاد کو یہ گناہ چھوٹا تو نہ تھا۔''

وہ جائز تھا، یا ناجائز تھا۔ مگر تھا۔ تو اولاد ہی نا...... عبدالہادی مجھے اس گناہ کی پاداش میں اولاد نہیں مل رہی ہے۔''

اس کی آہ و بکا میں تاسف و ملال کا رنگ تھا۔ عبدالہادی نے بے ساختہ و بے اختیار اسے بازوؤں کے حصار میں مقید کر کے سینے سے لگا لیا۔

''میری جان......! میری جان رو مت پلیز دیکھو وہ گناہ، وہ غلطیاں تمہاری تب کی تھی جب تم

ڈیئر قارئین !السلام علیکم!

اللہ پاک ہمیشہ آپ پر مہربان ہو۔آپ خوش رہیں (آمین)۔

پچھلے ماہ رحمٰن رحیم سدا سائیں کی جو مستوط آپ نے پڑھیں، حالات جس طرح تیزی سے سدھرے، واقعات جس انداز میں سمٹے زندگی جس میں طمانیت سے مسکرائی۔آپ نے سمجھ لیا اس کہانی کا اختتام بھی ہو گیا۔عموماً کہانیوں کے اختتام اسی انداز میں ہوا کرتے ہیں مگر یہ کہانی اس طرح ختم نہیں ہوتی۔میں اللہ سے اسے مزید لکھنے اور بہتر اور بھرپور لکھنے کی درخواست گزار ہوں۔ مجھے لکھتے ہوئے اب آٹھ سال ہونے والے ہیں۔اس عرصے میں اس انوکھی کیفیت سے میں کبھی ہم کنار نہیں ہوئی جو رحمٰن سدا سائیں کے دوران مجھ پر آشکار ہوتی رہی ہیں۔ میں حیران ہوں اس ناول کو جتنے گریز، ڈر، خوف اور ہچکچاتے ہوئے آغاز کیا تھا، وہ مجھ سے اختتام پذیر کیوں نہیں ہو رہا؟ پہلے میں نے خود لکھا۔پھر مجھ سے یہ لکھوایا گیا۔اس کے بعد میں خود اس کو لکھنا چاہتی ہوں۔ مکمل آمادگی، خوشی اور رضا کے ساتھ۔یہ تین حصے ہو گئے ناول کے۔ان میں میری کیفیات اگر الگ تھیں تو ناول کے رنگ بھی اتنے ہی بدلے ہوں گے یہ لازمی بات ہے۔ایک بات میں نے جانی ہے اس دوران...... کہ اس کائنات میں سب سے مشکل اور دلچسپ مطالعہ انسان ہے۔ بے حد پرت در پرت شخصیت ہوتی ہے انسان کی...... یہاں انسانی نفسیات و احساسات کی ہی اہمیت ہے۔یہاں جینز (عادت و فطرت جو قدرتی طور پر نسل در نسل منتقل ہوتی ہے) کا خصوصی ذکر ہے۔اس میں بھی شک شبہ نہیں ہے کہ زندگی ازل سے اپنے واقعات حالات اور کہانی کو دہرا رہی ہے۔وہ مکافات عمل بھی ہو سکتے ہیں۔آزمائش بھی۔یہ کہانی حال کی کہانی ہے یہاں تک...... ماضی کا حصہ نہیں بنی مگر ہم مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں ظاہری بات ہے تصور ہی ہوتا ہے اور تصور انسان شعوری یا لاشعوری طور پر ہمیشہ حسین ہی باندھتا ہے میں نے بھی حسین تصور باندھا ہے۔جس میں کھونا گم ہونے کے متمنی ہوں گے تو آپ اپنے اس ناول کی کہانی کے کرداروں کے ہمراہ ہوتے ہیں اس خواہش دعا اور امید کے ساتھ کہ واقعی ہمارا مستقبل ایسا ہو۔امن و شانتی سے بھرپور آمین۔دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔اللہ پاک ہم سب کا حامی ناصر ہو۔اللہ پاک میرے والدین بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کو اپنی پناہ اپنی عافیت میں رکھے، عمریں دراز فرمائے۔نیکی کی ہمت و توفیق کے ساتھ۔

والسلام اُم مریم

پوری طرح شیطان کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ معافی ضرور مانگو۔توبہ کرو مگر یہ نہ سوچا کرو کہ اللہ معاف نہ کرے گا اور یہ بھی نہ سوچا کرو کہ اللہ سزا دے رہا ہے اس کے برعکس یہ خیال پختہ اور یقین کامل کرو کہ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔اللہ دے کر بھی آزماتا ہے اور نہ دے کر بھی آزماتا ہے، جیسے عمیر بھائی کو، جیسے تمہیں...... جیسے بریرہ بجو کو، جیسے

لاریب بھائی کو۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔وہ اسے بہلا رہا تھا۔اس کی وحشت دھیرے دھیرے قرار پانے لگی اس کا اضطراب ڈھلنے لگا۔سسکیاں ہچکیوں میں بدلیں پھر ہچکیاں بھی دم توڑنے لگیں وہ یونہی اس کے ساتھ لگی نیم دراز ہو گئی۔

عبدالہادی نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوما، تب اس نے نڈھال انداز میں آنکھیں کھول کر

اسے لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔ اسے عبدالہادی کی مسکان حوصلہ افزا لگی، امید دلاتی ہوئی اسے وہ رب کا سب سے خوبصورت انعام محسوس ہوا۔ ایسا انعام جس کے ذریعے وہ اس سے سارے کام کروا رہا تھا۔ اس کا دل انوکھے سکون سے لبریز ہو گیا دوبارہ آنکھیں موندنے سے قبل وہ آسودگی سے مسکرائی تھی اور عبدالہادی کے اندر جنموں کا قرار اترتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''بیٹی مبارک ہو۔ اللہ ہمیشہ خوشیوں سے نوازے ہماری بچی کا نصیب اچھا کرے آمین۔''

لاریب نے جیسے ہی عبدالغنی کا سہارا لیے گھر کے اندر قدم رکھا ان کی کیپ سے بے قراری سے منتظر عبیر لپک کر آگے آئی تھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاب اور گیندے کے پھولوں سے گندھا مالا نما ہار بے حد محبت سے لاریب کے گلے میں ڈال کر اسے دوسری جانب سے خود سہارا دیا تو مما جو ساتھ ہی کھڑی تھیں مسکراتے ہوئے سائیڈ پر ہو گئیں۔

لاریب نے جواب میں مسکرا کر محبت آمیز شکر بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اور یونہی سہارا لیے اندر کمرے میں آ گئی عبدالغنی نے اسے آہستگی سے بستر پر لٹایا تو عبیر نے پشت پر تکیے رکھ دیے تھے۔۔

بچی کو عبیر نے پیار کرنے کے بعد اس کے پہلو میں لٹا دیا جو سکون آمیز نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے۔ بالکل آپ جیسی......''

عبیر کے لہجے میں محبت کا سمندر جیسے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لاریب کے چہرے پر نقاہت بھری تھکی تھکی مسکان تھی۔ رنگت زردی کی جانب مائل۔

''آپ بیٹھیے آنٹی......! میں چائے بنا کر لاتی ہوں لاریب سوپ لاؤں آپ کے لیے......'' وہ رک کر مستفسرانہ نگاہوں سے لاریب کو تکنے لگی

لاریب نے سر کو نفی میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں! ابھی دل نہیں کر رہا۔'' اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ عبیر پلٹ گئی تو لاریب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''عبدالعلی اور عبدالغنی نظر نہیں آ رہے ہیں......؟'' اُم جان اس سوال پر مسکرا رہی تھیں پھر نرمی سے گویا ہوئیں۔

عبدالعلی ٹیوشن گیا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے بھیجا ہے چھوٹی دلہن نے ہزار منت کے بعد۔ کہہ رہا تھا۔ اج والدہ ہماری ڈول کو گھر لے کر آئیں گی میں گھر پہ رک کر انتظار کروں گا۔ عبدالواحد کچھ دیر پہلے ہی سویا ہے۔''

''کیوں فکر کرتی ہو بیٹے! یہ بچی بہت نیک ہے تم سے زیادہ ہی محبت کرتی ہے بچوں سے۔ سچ پوچھو تو تم......''

ممی نے مسکراتے ہوئے کھلے دل سے عبیر کو سراہا تھا۔ جو چائے کے لوازمات سمیت اندر آئی اور جھینپ کر مسکرا دی۔

''نہیں آنٹی! لاریب اس لیے پوچھ رہی ہیں بچوں سے یوں کبھی الگ نہیں ہوئیں۔ اب تین چار دنوں بعد گھر آئی ہیں تو......'' وہ نرمی سے وضاحت دے رہی تھی۔ لاریب نے بے ساختہ تفاخر آمیز مسکان سے اسے دیکھا تھا۔

''بالکل ٹھیک...... ممی اس سے قبل کبھی ایک آدمی کی دو بیویوں کی ایسی انڈر اسٹینڈنگ دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔ کیوں عبدالغنی!'' وہ شرارتاً پوچھ رہی تھی عبدالغنی نرمی سے مسکرا دیا۔

''یہ رب سوہنے کا کرم ہے مجھ پر۔'' اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

''مجھ پر بھی رب سوہنے کی عنایات اتنی زیادہ ہیں عبدالغنی کہ اکثر شرمندہ ہونے لگتی ہوں۔ میں اس قابل کہاں تھی جتنا وہ مجھے نواز رہا ہے۔ سب سے بڑا کرم آپ، پھر

ہماری اولاد...... ایک کے بعد ایک نعمت اور رحمت......''
جب وہ کمرے میں عبدالغنی کے ہمراہ تنہا ہوئی اس کے ہاتھ تھام کر آبدیدہ ہوگئی تھی۔ عبدالغنی کچھ نہیں بولا بس اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔
عبدالغنی اس بچی کا نام رکھ دیں ناں اب......''
وہ جھک کر بچی کو پیار کر رہی تھی اسے سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔
''تم بتاؤ جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔'' عبدالغنی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
''پھر وہ رکھ دیں گے......؟'' لاریب کے سوال نے عبدالغنی کو متحیر کر ڈالا۔
''کیوں نہیں میری جان آپ بتاؤ تو......''
''اتباع......!!!'' نام اس کی زبان سے نکلا تھا۔ اور عبدالغنی اپنی جگہ ساکت ہوکر اسے تکتا رہ گیا۔ حیرانی...... تحیر...... استعجاب کیا کچھ نہ تھا۔ اس کی نظروں میں۔
''میں جانتی ہوں اگر عبیر کی بیٹی زندہ جنم لیتی تو وہ یہی نام رکھتی اس کا۔ خدا کے کاموں میں مداخلت کی مجال نہیں ہے عبدالغنی! مگر میں عبیر کو یہ مان، یہ خوشی دینا چاہتی ہوں۔ آپ منع نہیں کریں گے پلیز!''
اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ بے حد ملتجی ہوکر کہہ رہی تھی۔ آنکھیں جانے کس احساس کے تحت بے تحاشا نم تھیں۔ عبدالغنی کچھ نہیں بولا بس مسکرا دیا گزرنے والے ماہ وسال نے لاریب میں جو تبدیلیاں کی تھیں ان میں سب سے قابل تحسین اور تفاخر آمیز تبدیلی نہ صرف عبیر کو اس کی حیثیت اور اہمیت قبول کرنا بلکہ اس کی محبت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ عبدالغنی کے ایکسیڈنٹ اور پھر بعد میں صحت یابی کے بعد جس دن اس نے خود عبیر کو دلہن کا روپ دے کر عبدالغنی کو پوری آمادگی کے ساتھ اس کے حوالے کیا تھا۔ اُس روز عبدالغنی یہی سمجھ رہا تھا۔ وہ خود پہ ضبط کر رہی تھی۔ اسے کھونے سے خائف اور اللہ کے ڈر کے باعث انصاف کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ مگر گزرتے وقت نے قدم قدم پہ عبدالغنی کو یہ احساس بخشا تھا کہ ان سارے احساسات کے ہمراہ اک احساس محبت کا بھی ہے۔ وہ محبت اللہ کی ہے یا پھر عبیر کی...... بس وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں رہا تھا۔ کہ لاریب کا دل بہت وسعت سمیٹ لایا۔ وہ جو اس کی جانب کسی کا دیکھنا بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ عبیر کی پریگنینسی کے دوران پھر جب دونوں بار اس کے ہاں مردہ بچوں کی ولادت ہوئی تو اس نے عبیر کی دلجوئی کے خیال سے عبدالغنی کو مستقلاً عبیر کے ساتھ کر دیا تھا کئی کئی مہینوں تک۔ خود اپنی رضا و مرضی سے عبدالغنی اگر خود اس کے کمرے میں کبھی آتا تو وہ اس سے اتنا اصرار کرتی اور عبیر کے خیال رکھنے کی اتنی نصیحت کرتی کہ بس وہ اسے دیکھتا رہ جاتا۔
''کیا ہوا عبدالغنی! میری بات بری لگی یا......''
اس کی مہیب خاموشی کو پاکر وہ ہراساں ہوگئی۔
''لاریب...... میری جان!'' عبدالغنی نے نرمی و عاجزی سے کہا اور اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر عقیدت مندانہ نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔
''مجھے برا لگ سکتا ہے؟ میں تو بس شکر سے لبریز ہوگیا ہوں۔ دکھ بھی ہوا اپنی سوچ پر کبھی یہ خیال میرے دل میں تھا تمہاری شدت پسندی کے باعث کہ دو شادیاں کر کے برا پھنسا ہوں۔ سکون کو ترسوں گا۔ عمر بھر...... اور پھر عنایت فرمانے والے رب نے اتنا کرم کیا۔ ایسی عنایت کی بارش برسائی کہ آج تک اس سوچ پہ نادم ہونے سے فرصت نہیں۔ اس وقت بھی ایسے ہی احساسات تھے۔''
بچی کسمسا کر روئی تو عبدالغنی یکدم خاموش ہوکر متوجہ ہوا اور اسے تھپکنے لگا مگر وہ چپ ہونے کے

بجائے رونے کی رفتار بڑھانے لگی۔ عبدالغنی نے گھبرا کر لاریب کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنی والدہ کے پاس آنا چاہ رہی ہے۔ شاید بھوک بھی لگی ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے تو پھر برائے کرم اس کی والدہ ماجدہ کو بلا دیجیے۔ یہاں سے تو شاید ہی ان تک آواز پہنچ جائے۔ اب کے اس کا لہجہ و انداز شگفتہ و متبسم تھا۔ مگر عبدالغنی کے لیے پوری طرح نا فہم جبھی اس نے الجھن آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ جو مسکرا رہی تھی اطمینانیت اور آسودگی کے ساتھ۔

"میں سمجھا نہیں......" وہ پریشان کھڑا تھا۔ لاریب دھیرے سے ہنس دی تھی۔

"عبیر کو بلائیں بھئی وہی فیڈ کروائے گی اسے اس لیے اس کی ماں میں نہیں عبیر ہے۔ ویسے تو اس گھر میں ہمارا کچھ بھی بانٹنا ہوا نہیں ہے عبدالغنی! مگر یہ بچی......! یہ صرف عبیر کی ہے اور سن لیں یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ میں آپ سے بھی اجازت نہیں لے رہی پھر مشاورے کی کیا گنجائش......" اس کا مدھم لہجہ دو ٹوک اور حتمی تھا۔ عبدالغنی گنگ ہونے لگا جب کہ وہ اسی قدر پرسکون تھی۔

"لاریب تم......"

"عبدالغنی......! مجھے معلوم ہے میں جذباتی نہیں ہو رہی ہوں۔ یہ فیصلہ صرف دل کا فیصلہ بھی نہیں ہے، میں نے یہ فیصلہ سال پہلے کیا تھا۔ جب عبیر نے بچے کو جنم دیا اور محروم رہ گئی۔ اس کا دکھ صرف اس کا نہیں تھا۔ آپ گواہ ہیں میں ہر لمحہ اس کے دکھ میں شریک رہی ہوں۔ تب میں نے چند ماہ کے عبدالواحد کو اسے دینا چاہا مگر ایسا نہیں کر پائی۔ ہاں میں نے خدا سے تب ہمت اور حوصلہ ضرور مانگا تھا۔ اور دعا بھی...... کہ وہ مجھے اولاد دے نوازے تو میں وہ اولاد عبیر کو دے دوں گی مگر اس سے پہلے ہی اللہ نے عبیر کو پھر امید دے دی۔ دوسری بار بھی وہی دکھ دے دیا تو میں نے جانا عبدالغنی! وہ مجھ سے کہیں اللہ کے نزدیک ہے جبھی تو اسے آزما رہا ہے۔" وہ اب رو رہی تھی۔ عبدالغنی گم صم بیٹھا تھا۔ معاً وہ سنبھلا اور اس کے نم گال تھپکے۔

"تم پریشان مت ہو اللہ بہتر نوازنے والا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں عطا فرمانے والا۔ عبدالغنی کا لہجہ و انداز بوجھل تھا۔ لاریب نے ہچکی بھری اور نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں عبدالغنی! اللہ بہتر نوازنے والا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے عطا فرمانے والا...... عبدالغنی مگر اللہ وہ ہے جو کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر۔ عبیر کی آزمائش دے کر واپس ہوئی ہے مجھے وہ اپنی نعمتوں سے اتنی فراخدلی سے نواز رہا ہے، تو مجھ سے سوال بھی کرے گا ان نعمتوں کے متعلق عبدالغنی! اللہ نے حکم دیا ہے مسکین کو کھانا کھلانے کا یہ کھانا وہ خود بھی چاہتا تو کھلا سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ کام اپنے بندوں کے سپرد کر دیا کیوں......؟ مقصد ان سے نیکی کروانا ہے۔ وہ قربانی کا حکم دیتا ہے۔ ایثار کرنے کو کہتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے غنی ہے۔ جسے چاہے بانٹ دے نعمتیں، جسے چاہے دے، جسے چاہے بھوکا رکھ دے، روز قیامت وہ بھوکے سے سوال نہیں کرے گا وہ پیٹ بھرنے والوں سے ضرور پوچھے گا۔ تیرے پاس گنجائش سے زیادہ تھا۔ تُو نے میرے بندے کا خیال کیوں نہ رکھا۔ آپ سمجھیں عبدالغنی......! یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔"

وہ مسلسل بولتے ہانپ گئی تو چپ کر گئی۔ عبدالغنی ہنوز چپ تھا۔ اس کی خاموشی کے ساتھ پہلے تحیر تھا۔ پھر غیر یقینی اس کے بعد اس کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی، پھر آسودگی اور سکون کے ساتھ تشکر بھی اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔ کچھ کہے بغیر اس نے جھک کر لاریب کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔

"تمہارا جذبہ قابل قدر ہے لاریب! جزاک

اللہ سما حسن جزا۔"
اور لاریب اس کی رضامندی پا کر کھل کر مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

"ہم کہاں جا رہے ہیں اماں! ماموں کے گھر؟" بریرہ اسے موزے پہنا رہی تھی جب چھ سالہ عبداللہ نے اچانک سوال کیا تھا۔ بریرہ نرمی سے مسکرا دی۔

"جی میری جان میرے پسر! ماموں کے گھر جا رہے ہیں۔ چلیں جا کر اپنے بابا جانی سے کہیں وہ بھی آ جائیں۔" بریرہ نے اسے جوتے پہنا کر بیڈ سے اتارنا چاہا تو وہ خود ہی چھلانگ لگا کر نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔

"وہاں بھی اک اور ڈول آئی ہے۔ ہماری امن جیسی؟ مجھے دادو نے بتایا ہے۔" اس کی آنکھیں اس پل اشتیاق آمیز احساس نے کتنی روشن کر دی تھیں۔ وہ ہارون اسرار اور بریرہ دونوں کا عکس تھا۔ جب ہی اس کی خوبصورتی ایسی تھی کہ راہ چلتے لوگ بھی اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ البتہ مزاج بہت نازک تھا۔ بہت زیادہ جیسا کبھی بریرہ کا تھا، جیسے بعد میں ہارون کا ہو گیا تھا۔

"جی بیٹے! دادو نے بالکل ٹھیک بتایا ہے آپ کو۔" بریرہ اب امن کی جانب متوجہ ہوئی جو سو رہی تھی۔ وہ اسے سوتے سے جگائے بغیر ہی کپڑے بدلوانے میں مصروف ہو گئی۔

"دادو یہ بھی بتا رہی تھیں وہ والی ڈول کچھ زیادہ ہی انوسینٹ اور فیسی ٹیک ہے اماں...... اگر وہ امن سے زیادہ کیوٹ ہوئی تو ہم امن سے چینج کر لیں گے۔ وہ والی لے آئیں گے خود۔ امن ویسے بھی مجھے زیادہ اچھی نہیں لگتی۔ ہر وقت چیختی ہے۔" جوش و خروش سے کہتا اس کا لہجہ آخر میں کچھ بے زاری سمیٹ لایا تھا۔ جسے اندر داخل ہوتے ہی ہارون نے سنا اور بے اختیار ہنسنے لگا۔

"حد ہو گئی ہے برخوردار آپ سے بھی۔ آپ کی اس فرمائش کو اور بھی کسی احسن طریقے سے پورا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے جھک کر عبداللہ کو اٹھا کر اس کا ماتھا۔ چوما اور پھر گلا کھنکار کر بریرہ کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

"کیا خیال ہے بیگم صاحبہ! شہزادۂ ولی عہد کی خواہش پوری کر دیں۔ اس طرح تاریخ بھی دہرائی جائے گی، بڑے خوبصورت انداز میں؟" بریرہ نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا پھر جھینپ کر مسکرا دی تھی۔

"سچ پوچھیں تو میرے دل کی بات کہہ دی آپ نے۔ میرا ابھی بڑا دل کر رہا تھا۔ ابھی سے بھائی اور لاریب کے کانوں میں بات ڈالنے کو۔ آپ ممی سے بات کریں۔ میرا نہیں خیال وہ منع کریں گی۔ رنگ جو ہم پہنا رہے تھے۔ بچی کو وہ نسبت کی بھی رنگ ہو جائے گی۔" اس کو جوش و خروش یکا یک دیکھنے کے لائق ہو گیا۔ گلابی گال دہکنے لگے۔ آنکھوں میں موجود روشنیاں بے تحاشا بڑھ گئیں۔ ہارون اسے دیکھتا رہ گیا مبہوت ہو کر۔

"یہ میرے نہیں آپ کے بیٹے کی دل کی خواہش ہے محترمہ! جو بہر حال ہمیں عزیز ہے۔ وہ متبسم انداز میں گویا ہوا تھا۔ بریرہ کا جوش و خروش مزید بڑھ گیا۔ ممی سے بات ہونے کی صورت۔ ممی اس خیال پر مسکرانے لگی تھیں البتہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ صاف لگتا تھا۔ انہیں یہ بات پسند آئی ہے۔

"بس تو پھر آپ چلیے ہمارے ساتھ۔ سمجھیں عبداللہ کی نسبت طے کرنے جا رہے ہیں۔" ہارون کے فیصلے پر ممی اسامہ کو نا پا کر قدرے ملول ہوئی تھیں، جو ارسل احمد کی علاج کی خاطر مستقل انگلینڈ میں قیام پذیر تھا۔ ارسل احمد بہتری کی جانب مائل تھا۔ بہتری بہت آئی تھی الحمدللہ! مگر اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔

جس وقت وہ لوگ ڈھیروں مٹھائی فروٹس کے ساتھ عبدالغنی کے گھر پہنچے تھوڑی دیر قبل ہی علیزے اور عبدالہادی بھی وہاں آئے تھے اور اتباع کو گود میں لیے لاریب فیصلے میں گم بیٹھی تھی۔ اس کے احساسات عجیب ہو چکے تھے۔ دل بھرا رہا تھا۔ اور شاکی بھی ہوا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی کو عبدالہادی نے ہی محسوس کیا تھا۔ اور اس کے احساسات کو سمجھ کر غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور نم نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ کتنے شکوے اس پل مچل رہے تھے۔ اسے کی آنکھوں میں۔

"گود تو میری بھی خالی تھی ناں عبدالہادی! نامراد تو میں بھی تھی۔ پھر لاریب نے یہ سخاوت اور فیاضی صرف عبیر کے لیے کیوں دکھائی؟ کیا اس کے لیے یہ گھر کی بات تھی......؟ یا ان کا دکھ سانجھا تھا۔ اور میں...... میں جو لاریب کی گہری سہیلی تھی۔ راز داں تھی اس سے سب سے قریب تھی۔ اسے میرا خیال کیوں نہ آیا۔ وہ جیسے کسی بھی پل رونے کو تیار تھی۔ عبدالہادی عجیب مشکل میں گرفتار نظر آنے لگا۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ اس پل ایسا کیا کرے کہ علیزے نہ صرف سنبھل جائے بلکہ اسے صبر بھی آجائے۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگنا شروع کی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ علیزے میں ہنوز جذباتیت تھی۔ وہ ابھی بھی کسی بھی حد تک بے وقوفانہ حرکتیں کر جاتی تھی اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ یہاں سب کی خوشیوں کے موقع پر علیزے کوئی بدمزگی نہ کر دے۔ اس نے پوری شدتوں سے رب کو دل ہی دل میں پکارنا شروع کر دیا۔

"اتنا تکلف...... بھائی حد ہو گئی۔ آپ تو قرض پہ قرض چڑھاتے جا رہے ہیں ہم پر۔" لاریب ان کے ساتھ آنے والے لوازمات کو دیکھتی احتجاج میں مصروف ہو گئی جب ہارون نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"کوئی قرض نہیں ہے۔ محبتیں قرض نہیں ہوتی پگلی!" اور لاریب ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔

"اف اماں......! یہ ڈول تو ہماری امن سے کہیں زیادہ فینسی عیتک ہے دیکھیں اس کی رنگت بالکل پنک ہے۔ باربی ڈول جیسے بال ہیں اماں مجھے یہی ڈول چاہیے۔ آپ امن ماموں کو دے دیں بس۔" عبداللہ کی اپنی الگ رٹ تھی۔ پہلے تو وہ بچی کو گود میں لینے پہ بضد تھا۔ جس سے بڑی مشکل سے اسے روکا گیا۔ جب بریرہ نے بچی کو گود میں لیا وہ تب سے ساتھ چپک کر بیٹھا اس کے ننھے ننھے ہاتھ گال اور آنکھیں چھو چھو کر دیکھتا ہوا چیک کر رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ بھی دے دیا بریرہ مسکرا مسکرا کر وہ ساری باتیں دہرانے لگی جو گھر سے آنے سے قبل کرتا رہا تھا۔ جسے سنتے سب کے لبوں پر بے ساختہ مسکان اتر آئی تھی۔

"بھئی لاریب اور بھائی......! دونوں سن لیں یہ اتباع زبانی کلامی نہیں واقعی عبداللہ کی ہونی چاہیے۔ ہم جھولی پھیلا کے آگئے ہیں باقاعدہ تیاری کے ساتھ۔" اس نے اپنا پاؤچ کھول کر ڈائمنڈ رنگ نکالی جو وہ اس ارادے سے ساتھ لائی تھی۔ یکدم ہر جانب خاموشی چھا گئی اُم جان بابا جان اور ممی کے ساتھ صرف بریرہ اور ہارون ہی مسکرا رہے تھے۔ لاریب نے حیران ہو کر عبدالغنی کو دیکھا جو ہچکچاہٹ کا شکار نظر آرہا تھا۔

"پلیز بھائی انکار نہیں۔ میرے بیٹے نے بہت چاہ نے مانگا ہے۔ ہم انشاء اللہ بہت محبت سے رکھیں گے ہمیشہ۔" بریرہ اس خاموشی پہ گھبرا کر بولی اور لاریب کا ہاتھ ملتجی انداز میں تھا۔ ما۔

"بیٹے بچپن کے طے کیے رشتے ناتے بڑے ہونے پہ بچوں میں......"

''اُم جان ہم سب ہی اللہ سے دعا مانگیں گے کہ اللہ ہمارے بچوں کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے۔آپ سمجھ لیں یہ میری شدید خواہش ہے۔ہم بڑی آس لے کر آئے ہیں۔یہ صرف عبداللہ کی ہی نہیں ہارون اور ممی کی بھی خواہش ہے۔''اُم جان کے سمجھانے پر وہ تیزی اور بے حد لجاحت سے کہتی آس مندانہ نظروں سے انہیں تکنے لگی تو اُم جان کے ساتھ بابا جان بھی مسکرا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے بچے! ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔بسم اللہ کر لیں مگر باپ سے پوچھ لیں پہلے۔''

بابا جان نے رضا مندی دی تو جیسے ہر جانب سکون بکھر گیا۔عبدالغنی کاندھے اچکا رہے تھے۔

اگر بابا جان اور اُم جان کو اعتراض نہیں تو پھر میرا اعتراض کہاں سے نکلے گا۔یہ والدائیں تشریف رکھتی ہیں،ان کی اصلاح بھی لے لیں۔''

عبدالغنی نے مسکراتے ہوئے بیڈ پہ بیٹھی لاریب اور صوفے پہ بچی کو گود میں لیے عبیر کو دیکھا۔جس کا چہرہ کل بے حد منور و تابندہ نظر آ رہا تھا،جب لاریب نے اُم جان اور بابا جان کی موجودگی میں میں بچی اس کی گود میں دی تھی۔اس کے گلے لگ کر روتی بچی کو چومتی اس کے ہر انداز،ہر احساس سے شکر ٹپکتا تھا۔

''آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لاریب! مگر یہ ایسا احسان ہے،جس کا اجر آپ کو میرا رب دے سکتا ہے۔''اس کا گلا بھر اتا رہا مگر وہ بولتی ہی رہی تھی۔

''خیریت کا وسیلہ ہو اللہ میری بچیوں کے اتفاق و سلوک اور محبت میں برکت عطا فرمائے،آمین۔''

اُم جان نے دونوں کو لپٹا کر پیار کرتے کہا۔اس فیصلے کو بریرہ نے بھی سراہا تھا۔اور ہارون نے بھی،اسامہ نے بھی ممی نے بھی......بس علیزے رہ گئی تھی جو بے حد خاموش تھی اور لاریب اس کی خاموشی سے لے کر افسردگی تک کو محسوس کر چکی تھی۔

''والدائیں نہیں والدہ......وہ تشریف رکھتی ہیں محترمہ!ان سے پوچھیں۔انہیں یہ رشتہ منظور ہے؟''

لاریب جو علیزے کو تک رہی تھی ماحول میں واپس آ کر برجستگی سے بولی۔سب ہی ہنس پڑے تھے۔''ہاں جی والدہ صاحبہ!دوبارہ سے دست بدستہ گزارش کریں کیا......؟'' بریرہ نے رُخ عبیر کی جانب پھیر لیا عبیر جو پہلے ہی شرما رہی تھی اِس بات پہ خفت سے سے سرخ پڑ گئی۔

''بجو......پلیز شرمندہ نہ کریں۔میں کچھ کہنے کی جرات کیسے کر سکتی ہوں جب بابا جان اور اُم جان اور انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے'' وہ خفیف سی مسکان کے ساتھ بولی تھی پھر جھک کر اتباع کو چوما اور بے حد محبت سے بولی۔

''بلکہ سچ پوچھیں تو میں اپنے رب کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ آج سے بیس سال بعد پیش آنے والا مرحلہ بھی اس نے ابھی نپٹا دیا۔مجھے اپنی بیٹی کی خوش بختی پہ ذرا سا بھی شبہ نہیں رہا۔''اس کے لہجے کا اطمنان اور اسکون ایسا تھا۔کہ جس پر فخر کیا جا سکتا علیزے کو اس پہ رشک آنے لگا۔

''بے شک!مگر کیا پتا تم بھی میرے بیٹے کا پرو پوزل رد کر دیتیں۔یا میں اپنے بیٹیوں کے لیے شہزادے ہی تو ڈھونڈتی ہیں۔'' بریرہ نے ہنستے ہوئے شگفتہ انداز میں کہا اور انگوٹھی کا کیس ممی کو تھما دیا کہ وہ بچی کو پہنا دیں۔ممی مسکراتے ہوئے آئی تھیں۔

''اس میں کیا شک کہ ہمارا عبداللہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں ہے۔'' عبیر نے بے حد محبت سے کہتے عبداللہ کو پیار کیا جو اتباع اس کی گود میں ہونے کی وجہ سے اب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ تو ابھی سے دیوانہ ہو رہا ہے،بڑا ہو کر پتا نہیں کیا کرے گا۔'' ممی نے عبداللہ کو ہنوز اتباع میں مگن پا کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔جو ضد کر رہا تھا۔کہ انگوٹھی ممی

نہیں وہ پہنائے گا۔ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔
''دیکھ لیں، یہ ابھی سے اپنا کام خود انجام دے رہا ہے۔ اس کی محبت پر شک نہیں ہونا چاہیے۔'' ہارون کے فقرے نے محفل کو کچھ اور زعفران زار کردیا۔
''اللہ نصیب اچھے کرے، آمین۔'' ممی نے دعا دی تھی۔ سب نے یک زبان آمین کہا۔
''والدہ کیا یہ عبداللہ لے جائے گا، ہماری اتباع گڑیا کو......؟'' عبدالعلی جو کب سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ تشویش میں مبتلا ہو کر بولا۔ اس میں شک نہیں تھا۔ اس کو عبداللہ کا اپنی بہن پر اتنا التفات ظاہر کرنا، توجہ دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
''ابھی نہیں بیٹے! ڈونٹ وری!'' لاریب نے اسے پچکارا مگر وہ پیر پٹخنے لگا۔
''میں کبھی بھی نہیں دوں گا اپنی گڑیا! اس کی بھی تو ہے نا بہن! ہم نے تھوڑا مانگی۔'' وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔ سب حیران ہو کر مسکراہٹ دباتے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
''لو بھئی عبداللہ صاحب! اتنا آسان نہیں ہے یہاں سے دلہن لے جانا۔ جی دار اور اکھڑ بھائی بھی ہے ایک اس کا......'' ہارون شگوفہ چھوڑ کر خود ہی ہنسنے لگا۔
''بھئی آپ سب لوگ اتنی جلدی آمادہ ہوگئے۔ رشتہ دیا تھا۔ تو لینے کی بات بھی کرلیتے۔ لڑکا تو ہمارے پاس بھی تھا۔ آپ کے لڑکے سے ماشاء اللہ بڑا ہی ہے۔ پھر یہ تو زیادتی ہے ناں۔'' لاریب نے اس مذاق کو طول دیا تھا۔ مگر تب سے بامشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے علیزے مزید خاموش نہیں رہ سکی۔ جبھی بھڑک اٹھی تھی۔
''فار گاڈ سیک! ختم کریں یہ سارا سلسلہ، اور خبردار...... اب کوئی عبدالعلی کی بانٹ شروع نہیں کرے گا۔ اس پر کسی اور کا بہرحال کوئی حق نہیں ہے۔ بجو کا تو بالکل نہیں۔'' وہ اتنی تختی، اتنی سفاکی اور تلخی سے بولی تھی کہ سب کے مسکراتے خوش باش چہرے یکدم تاریک پڑ گئے۔
''لیزے......!'' عبدالہادی نے بے اختیار اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔
''علیزے بیٹے!''
''گڑیا!'' اُم جان عبدالغنی بے ساختہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی جانب آئے مگر وہ کسی کی بھی طرف متوجہ نہ تھی۔ اس نے جھپٹنے کے انداز میں کچھ فاصلے پر موجود عبدالعلی کو کھینچ کر سینے سے لگا کر بانہوں میں بھینچ لیا۔
''یہ میرا ہے، صرف میرا۔ اس سے سب سے زیادہ میں محبت کرتی ہوں۔ اس ...... اس پر سب سے زیادہ حق بھی میرا ہے۔'' آنسو گالوں پر اترتے عبدالعلی کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ ہچکیوں سے روتی تھی اور اس دیوانگی میں عبدالعلی کو بار بار چومتی تھی۔ جو حراساں و بیکل نظر آنے لگا تھا۔ عبدالہادی گہرا سانس بھر کے رہ گیا جبکہ عبدالغنی اور بابا جان کے ساتھ باقی سب بھی حیران پریشان اور ششدر تھے۔ معاً عبدالغنی سنبھلا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔
''ہاں...... یہ عبدالعلی تمہارا ہے، صرف تمہارا حق ہے اس پر۔'' علیزے نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں اٹھا کر غیر یقینی سے اسے دیکھا پھر یونہی روتے روتے ہنسی تھی۔
''آ آ آپ سچ کہہ رہے ہیں بھائی! کبھی مکریں گے تو نہیں ناں؟''
عبدالغنی نے نم آنکھوں کے ساتھ سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ اطراف میں ابھی بھی سوگوار جامد سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

دکھ کی گنتی جانتا ہوں میں

سکھ نہ گننا آوے

میں ناشکرا میرے مالک!

ایک توفیق دلادے

سکھ گننا سکھلادے

بستر پر وہ داہنی کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ گال کے نیچے داہنا ہاتھ تھا۔ جو آنکھوں سے پھسلتی نمی کے باعث بھیگتا جارہا تھا۔ اس نے کچھ دیر قبل ہی عشاء کی نماز ادا کی تھی۔ دوپٹہ ایسے ہی نماز کے انداز میں لپٹا ہوا تھا۔ گلابی دوپٹے میں وہ خود بھی بے تحاشا گلابی ہورہی تھی۔ کھانا اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ عبدالغنی اور اُم جان کے بے تحاشا اصرار کے باوجود گلے میں اٹکا آنسوؤں کا گولہ کچھ اور حلق سے اترنے ہی نہ دیتا تھا۔ پھر دل بھی تو آمادہ ہو۔ وہ تو بس بھرایا ہوا تھا۔ بے تحاشا رونا چاہتا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی مگر اس نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ عبدالہادی ہاتھ میں موجود ٹرے چھوٹی میز پر رکھتا سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کی سنجیدگی کی مظہر نظریں علیزے پر ٹھہر گئی تھیں۔ مگر کچھ بولا نہیں تھا۔ علیزے نے خود پر قابو پانا چاہا مگر دل کا بوجھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ جب اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں باقاعدہ ہچکیوں میں ڈھلنے لگیں تب عبدالہادی خود پر ضبط کھو کر اس کے قریب آگیا تھا۔

''لیزے...... ! لیزے! کیوں کررہی ہیں ایسا؟'' وہ بے حد عاجز ہوا تھا۔ جیسے۔ اس کے اس دکھ کا کیا علاج تھا۔ بھلا اس کے پاس۔

''میں جانتی ہوں بہت خفا ہیں آپ! جبھی تو بات بھی نہیں کررہے مجھ سے۔'' اس نے اک اور دکھ سامنے رکھا۔ عبدالہادی کچھ اور عاجز ہوا۔ بہت توجہ سے۔ بہت لگاوٹ سے اس کے گال پونچھے۔

''میں خفا نہیں ہوں لیزے! مجھے تو بس یہ دکھ ہے، میری بہادر لیزے کو کیا ہوگیا تھا۔؟'' وہ دکھ سے جیسے ٹوٹنے لگا۔ علیزے اور شدتوں سے رو پڑی۔

''بس...... میں ضبط نہیں کرسکی عبدالہادی! میں برداشت نہیں کرپائی! عبدالعلی سب سے زیادہ مجھ سے قریب تھا۔ میں نے بجو سے کہیں بڑھ کے لاڈ اٹھائے اس کے۔ جب سے شادی ہوئی تھی میری...... میں تب سے ایک بیٹی کی خواہش مند تھی۔ میں اس طرح عبدالعلی کو اپنا بیٹا بنانا چاہتی تھی عبدالہادی! مگر بجو......''

''وہ محض ایک مذاق کی بات تھی لیزے! وہاں کوئی یہ رشتہ طے نہیں کررہا تھا۔ کم آن۔'' عبدالہادی نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

''اتباع کا بھی تو عبداللہ سے ہوگیا ناں۔ عبدالعلی کا بھی ہوجاتا۔ بس مجھے ڈر لگا تھا۔ اور ذرا سوچیں...... اگر ہمارا بیٹا یا بیٹی ہوتی تو ہم......''

لیزے! لیزے میری جان! صبر سے کام لو، اللہ بہتر ہی کرے گا۔'' عبدالہادی نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ وہ گھٹ گھٹ کر روئے گئی۔

''نہیں ہوتا، اب نہیں ہوتا ہے عبدالہادی! مجھے کیوں یہ لگتا ہے کہ اللہ کو میرا وہ عمل پسند نہیں آیا۔ عبدالہادی اگر...... اگر میں اس وقت اپنے بچے کو نہ مارتی تو...... تو اب وہ کتنا بڑا ہوتا؟ عبدالعلی جتنا ہی ناں؟'' وہ سسکی، عبدالہادی سناٹے میں گھر گیا۔

''عبدالعلی میں اپنے اسی بچے کو دیکھتی رہی ہوں میں ہمیشہ عبدالہادی! جسے میں نے خود مار ڈالا۔ اس کی آہ وبکاہ میں شدت آنے لگی۔ عبدالہادی کے آس پاس سرد ہوائیں سنسنا رہی تھیں۔

''مجھے بتائیں عبدالہادی! میں کیسی ماں تھی؟ جس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی جان لے ڈالی؟ ماں تو ایسی نہیں ہوسکتی ناں؟'' اس کی آنسوؤں سے دھندلاتی آنکھوں میں غضب کی سرخیاں اور وحشتیں اُتر رہی تھیں۔ عبدالہادی کے

پاس الفاظ ختم ہوگئے۔ وہ کیسے اسے حوصلہ بندھاتا۔

''اُم جان کہا کرتی تھیں عبدالہادی! اپنے بچے تو ڈائن بھی نہیں کھاتی۔ میں کیسی ماں تھی جس نے خود......''

''لیزے!'' عبدالہادی تڑپ اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھا مگر اس کی وحشتوں میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہونے لگا۔

''خدا مجھے اگر معاف کر بھی دے گا عبدالہادی تو مجھے وہ معصوم ننھی جان کبھی معاف نہیں کرے گی جسے......''

''لیزے! چپ ہو جاؤ پلیز! ایسے مت سوچو۔'' عبدالہادی نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ سرتاپا کانپتی اور سسکتی رہی۔

''یہ سب جب ہوا تمہارے حواس سلامت نہیں تھے۔ تمہاری سوچوں پر تمہارا اختیار نہیں تھا۔ پھر یہ بھی تو سوچو...... اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ یہ راستی جواب تمہارے ذہن و دل کو حاصل ہوئی۔ وہ نہیں ہو سکتی تھی کبھی۔ جو شدتیں عاجزی و انکساری کی رب سے توبہ کی طلب کی تمہیں اب عنایت ہوئیں اس گناہ، اس لغزش کے بغیر نہیں مل سکتی تھیں۔ لیزے ایسا گناہ جس سے توبہ اور نیکی کی توفیق مل جائے باعث رحمت ہو سکتا ہے۔ تم مثبت سوچو۔ اللہ سے اچھی توقع باندھو۔ اللہ سے توبہ کرو مگر ناامیدی کو پاس نہ پھٹکنے دو کہ وہ تمہاری توبہ کو قبول نہیں فرمائے گا۔ پلیز، میری جان میری بات کو سمجھو۔''

وہ کتنی دیر اسے نرمی سے آہستگی سے سمجھاتا، قائل کرتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دھیرے دھیرے قرار پانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''علیزے بہت بدل گئی ہے۔ ہے ناں عبدالغنی!'' عبدالغنی نے سوئے ہوئے عبدالعلی اور عبدالاحد کو کروٹ بدلوا کر لحاف درست کیا اور جھک کر دونوں کی پیشانیاں باری باری چوم رہا تھا۔ جب لاریب کے سوال پر گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا تھا۔ اور کچھ کہے بغیر ہونٹ بھینچ لیے۔

''اس کی زندگی میں جو بحران آیا تھا، وہ شاید ساری عمر ساتھ چلنے والا ہے۔ بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اس پر۔'' خاصی تاخیر سے دلگیری سمیت بولا تھا۔ اس کا انداز بتاتا تھا۔ وہ علیزے کے ہر اضطراب سے آگاہ رہا ہے، لاریب کی اسے تکتی نظروں میں عقیدت سمٹنے لگی۔

''مجھے آج اس کی آنکھوں کا شکوہ بھی نظر آیا ہے لاریب! جب وہ بہت گم صم ہو رہی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ ہم اسے بروقت نہیں سمجھ سکے۔ ہم یہ بچی علیزے کو بھی دے سکتے تھے۔ ناں۔'' وہ متاسف تھا۔ ملول تھا۔ بے پناہ رنجیدہ، لاریب بے اختیار اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''عبدالغنی!'' وہ مضطرب ہوئی۔

''اگر ایسا آپ کا کوئی خیال تھا۔ تو آپ حکم کرتے۔ ایسی بات تو میں نے سوچی بھی نہیں کہ آپ کو انکار کر دوں۔ عبدالغنی...... ویسے بھی...... عبیر تو دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔ خدانخواستہ علیزے کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔ اُمید کا در کھلا ہے۔ اللہ بہتر عطا فرمانے والا ہے۔'' اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رسان سے رکھے وہ کتنے پیارے، من موہنے انداز میں سمجھا رہی تھی۔ عبدالغنی آہستگی سے مسکرا دیا۔

''بیشک اللہ عطا فرمانے والا ہے سب سے بہتر۔ میں اور شدت سے دعا کروں گا اب اس کے لیے۔''

''اور میں بھی۔'' لاریب نے ہنستے ہوئے کہا، پھر اس کا سہارا لے کر لیٹتے ہوئے اسے محبت سے تکتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

''ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے اپنی خوش بختی کا یقین سوا تر ہو رہا ہے۔ آپ کا ہر روپ پہلے سے زیادہ پیارا اور دلنشین ہے۔ سب سے پہلے میں نے آپ کو ایک بیٹے اور بھائی کے روپ میں دیکھا۔ جو قابلِ رشک تھا۔ پھر آپ میرے محبوب بن گئے۔ جو

بہت کٹھور ثابت ہو۔ اقدم قدم پر رُلاتا تھا۔ مگر تھا۔ بھی عزیز...... اس کے بعد شوہر کے روپ میں آئے تو ہر شکوہ مٹا ڈالا۔ باپ بنے تو شفقت و محبت کا لازوال سمندر ثابت ہوئے۔ دو بیویوں میں اعتدال اور انصاف ...... اللہ اللہ! یہ محبت، عقیدت اور عشق میں کیوں تبدیل نہ ہوتی۔ مجھے اپنا آپ سب سے خوش نصیب لگتا ہے۔ عبدالغنی مجھے فخر ہے کہ آپ جیسا شریکِ حیات میرا نصیب ٹھہرا ہے۔''

''الحمد اللہ! ثم الحمد اللہ!'' عبدالغنی کے چہرے کے ہر نقش سے ہر انداز سے انکساری چھلکنے لگی۔

''ایسے نہ کیا کرو لاریب!'' وہ عاجز تھا۔ سراپا عاجز۔

''کیوں......؟ میرا دل کرتا ہے تو کہتی ہوں۔'' لاریب ٹھنکی تھی۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا۔

''چلو پھر ایسے کیا کرو۔ اللہ کی تعریف ہے کہ اللہ نے بعد الغنی کو نیکی کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ کی تعریف ہے کہ اللہ نے یہ احسان فرمایا۔ اے اللہ تو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنا، آمین۔'' اس نے تصیح کی تو لاریب مسکرا مسکرا کر سر اثبات میں ہلانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''آج میرا بیٹا بہت خوش تھا۔ ماشاء اللہ! اللہ اسے ہمیشہ یونہی شاد و آباد رکھے۔'' ہارون نے سوتے ہوئے عبداللہ کو لا کر بستر پر لٹایا اور پیشانی پر بکھرے بال سمیٹ کر بوسہ دیا۔ پھر جھک کر امن کو پیار کرنے لگا۔

''آپ خوش نہیں ہیں؟'' بریرہ وضو کرنے جا رہی تھی۔ آستین اوپر کرتے تھم کر اسے تکنے لگی۔ انداز میں خفیف سی شرارت تھی۔ ہارون سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گہرا طمانیت بھرا سانس اندر کھینچا پھر آہستگی سے ہنس دیا۔

''میرا مت پوچھیں۔ مجھے لگا وقت کچھ سال پیچھے چلا گیا ہے۔ ہم نے آج ہی بریرہ صاحبہ کو فتح کیا ہے۔ اب میرے بیٹے نے کارنامہ انجام دیا ہے۔'' بریرہ نے چونک کر اور بہت دھیان سے اسے دیکھا۔

ہارون کی مسکراہٹ تر و تازہ تھی۔ وہ ہر لحاظ سے آسودہ نظر آتا تھا۔ مگر جیسے بریرہ کی تشفی پھر بھی نہ ہو سکی۔

''اک بات بتائیں گے ہارون!'' وہ خاص سے زیادہ جھجکی، ہارون کا حیران ہونا فطری تھا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال میں اس نے اتنا مان بریرہ کو دیا تھا۔ اتنی محبت دی تھی کہ ہر رنج و غم گویا بھلا دیا تھا۔ ہر تشنگی مٹا دی تھی، ہر ازالہ کر دیا تھا۔

''آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں ہارون؟ میرے دل میں یہ سوال کانٹا بن کر چبھتا ہے ہر وقت؟'' اس کی آنکھوں کی سطح نم ہو رہی تھی۔ ہارون آہستگی سے مسکرایا۔ بچوں پر کمبل درست کیا تھا۔ پھر اس کی جانب پلٹ کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر نرمی سے اپنے مقابل کر لیا۔

''کتنی بار پوچھو گی یہ سوال آخر بریرہ!'' اس کی مسکان میں نرمی کے ساتھ ملامت کا بھی رنگ تھا۔ یہ ملامت خود ملامتی کی تھی۔ بریرہ نے لانبی پلکیں اُٹھا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور سرد آہ بھری۔

''بات یہ نہیں ہے ہارون صاحب کہ مجھے یقین نہیں آپ کی بات کا...... مسئلہ یہ ہے کہ دل کا ملال نہیں جاتا میری وجہ سے۔''

''جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا ہے بریرہ! ہو جانے والے عمل پر پچھتاوا رہنا چاہیے کہ آئندہ غلطی سے روکتا ہے۔ مگر یہ ملال آنے والے وقت کی خوشیاں نگل لے...... یہ ٹھیک نہیں ہے اور وہ خیال، وہ بات جو باعثِ رنج و ملال ہو اسے فراموش کر دینا بہتر...... تم جانتی ہو بریرہ! تب اگر غلط تم تھیں تو ٹھیک میں بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں میں سے اگر کوئی ایک بھی اعتدال پر رہتا تو بگاڑ اتنا کبھی نہ بڑھتا۔ خیر...... یہ سوچ کر پریشان نہ ہوا کرو کہ میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔ اللہ گواہ ہے بریرہ! تم سے علاوہ زندگی میں کسی اور سے اتنی محبت ہی نہیں ہو سکی۔ تمہاری دوری،

تمہاری لاتعلقی و بے نیازی نے ہی پاگل کر دیا تھا۔
مجھے کہ ایک غلط قدم اٹھالیا...... پھر اس کا پچھتاوا لے
ڈوبا مجھے، لیکن الحمدللہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں
چاہتا ہوں، اب ہم خوشگوار بھرپور زندگی گزاریں۔
ایسی زندگی جس میں کوئی تشنگی نہ ہو۔

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' بریرہ جو بہت
دھیان سے اسے سُن رہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔
ہارون ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا پھر گہرا سانس بھرا تھا۔

''میں نماز پڑھ لوں۔''

''شیور، مگر ڈیئرسٹ وائف! آج میری اک
خواہش پوری ہوئی۔ اک پھر ادھوری رہ گئی۔'' اس
کے گھمبیر لہجے میں موجود کسک کا احساس بریرہ کو چونکا
کے پھر سے اس کی جانب متوجہ کر گیا تھا۔

''میں سمجھی نہیں ہارون!'' اس کی استفہامی
نگاہوں میں اضطراب بھی اترنے لگا۔

''عبدالعلی...... ! بلاشبہ عبدالغنی کا دوسرا عکس
ہے۔ ماشاء اللہ! اتنا پیارا بچہ ہے اور تمہیں پتا ہے میں
اول روز سے ہی عبدالغنی کا اسیر ہو چکا تھا۔ لاریب کا
سب سے بڑا حامی بھی میں بنا تھا۔ یہ بات آج تک
صغیہ راز ہے کہ ممی کو اس کے حق میں ہموار کرنے والا
میں تھا۔'' وہ مسکرایا تھا۔ بریرہ بے ساختہ مسکرادی۔ اس
مسکان میں بھائی کے لیے فخر بھی تھا۔ انبساط بھی۔

''آپ تو عبدالعلی کی بات کر رہے تھے۔۔''
اس نے بغور ہارون کے تاثرات جانچے۔ گویا بات
کا سرا جوڑنا چاہا۔ ہارون نے سرد آہ بھرلی تھی۔

''سچ پوچھو تو عبدالعلی کی نسبت میں اپنی بیٹی امن
کے ساتھ چاہتا تھا۔ میری خواہش ہے بریرہ! ماضی کو
دہرایا جائے۔ ہماری بیٹی وہاں اور ان کی بیٹی یہاں
آجائے۔ عبدالعلی سے حقیقتاً مجھے بہت انسیت محسوس
ہوتی ہے۔'' ہارون نے بلاجھجک دل کی بات کہہ دی
تھی۔ بریرہ کے صبیح چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''اللہ ہماری بیٹی کے لیے بہتر کرے گا ہارون!
عبدالعلی کے متعلق ہم ایسا نہ ہی سوچیں تو مناسب
ہے۔ اس کا مدہم لہجہ غیر مبہم تھا۔ ہارون نے بڑی
طرح سے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور یونہی تکتا رہا۔ انداز
ایسا تھا۔ جیسے بات کی تہہ تک پہنچنے کا متمنی ہو۔

''مگر کیوں بریرہ! ہماری بیٹی کیا کسی سے کم ہے؟
ہمیں پورا حق حاصل ہے اس کے لیے اچھا سوچنے
اور انتخاب کرنے کا۔'' اس کا انداز نہ چاہتے ہوئے
بھی احتجاجی ہو گیا تھا۔ بریرہ خاموش رہی اور
اضطراری کیفیت میں ہونٹ کچلتی دوسری جانب
دیکھتی بڑی دقتوں سے مسکرائی۔

''پلیز اب یہ نہ کہنا ادلے بدلے کی شادیوں
کے مسائل......'' ''یہ نہیں ہے معاملہ ہارون!'' وہ
سخت عاجز ہوئی۔ ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے
اپنے برابر صوفے پر بٹھا دیا۔

''تو جانِ ہارون! وہ وجہ بتا دو پھر جس کی بنا پر
آپ منع کر رہی ہیں۔ یقین رکھو اگر معقول ہوئی تو
کبھی دوبارہ ذکر نہیں کروں گا اس بات کا۔'' اس کے
لہجے میں اصرار تھا۔ اقرار تھا۔ بریرہ نے یوں گہرا
سانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جیسے شکست تسلیم
کر لی ہو۔ وہ ہارون کو جانتی تھی۔ وہ ابھی بھی ضد کا پکا
تھا۔ ہاں قول و فعل میں تضاد نہیں رکھتا تھا۔ جو زبان
پر وہی عملاً ظاہر کرتا۔ بناوٹ و تصنع اور دکھاوا نہیں تھا۔

''علیزے کو دیکھا تھا۔ آپ نے......؟ ہارون
وہ کرائسس جو کچھ سالوں پہلے ہمارے آشیانوں کو
طوفان کی زد پر بکھیر کے رکھ گیا تھا۔ وہ دیکھنے میں
بظاہر پھر سے ٹھیک ہوا لگتا ہے۔ آشیانے آباد ہو گئے
ہیں۔ معمولات درست ہیں، لیکن ہارون......!
علیزے بالکل ٹھیک نہیں ہو پائی......'' اس کی آواز
بوجھل ہوئی گلا بھرانے لگا۔ ہارون کے چہرے پر تغیر
پھیلا تھا۔ وہ ساکن بیٹھا رہ گیا۔

''میرا دل گواہی دیتا ہے ہارون! علیزے پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں ابھی بھی غلط ہے۔ وہ اپنی ہر کمی، ہر ناخوشی میں اپنے ساتھ ساتھ ابھی بھی مجھے موردِ الزام ٹھہراتی ہے اور ایسا غلط بھی نہیں کرتی۔ ہارون......! وہ کسی اور پہ بھی نہیں چلاتی، مجھ پر برہم ہوتی ہے۔ عبدالعلی...... مجھے جتنا بھی عزیز ہو۔ جتنا بھی پیارا ہو مگر میں اس پر حق نہیں جتلانا چاہتی تو اس کی وجہ وہ ازالہ سمجھ لیں، جو میں کرنے میں مصروف ہوں۔ لیزے کی اولاد نہیں ہے۔ مگر وہ خواہش مند تو ہے۔ عبدالعلی کو وہ جس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں وہ نظر پہچانتی ہوں۔ میری خواہش ہے، میری دعا بھی...... اللہ اسے جلد صاحبِ اولاد کرے۔ بیٹی کی رحمت سے نوازے، ہارون عبدالعلی ہمارا نہیں...... لیزے کا بیٹا بننا چاہیے۔'' بات مکمل ہونے سے قبل اس کی آنکھیں ٹپ ٹپ آنسو برسانے لگی تھیں۔ ہارون جو ساکن بیٹھا تھا۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے اس کے شانے پر اپنا بازو دراز کر کے اس کا سر اپنے کاندھے سے ٹکا کر تھپکنے لگا۔

''بس اتنی سی بات؟ کم آن بریرہ! دل پر بوجھ نہ لو۔ علیزے صرف تمہاری بہن نہیں ہے۔ وہ میری بھی بہن ہے۔ اللہ گواہ ہے اس میں اور لاریب میں مجھے کبھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اچھا کیا تم نے میرا دھیان اس جانب دلایا۔ ورنہ حقیقتاً میں ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔ ڈونٹ یو وری سویٹ ہارٹ! تمہارے ساتھ میری بھی دعائیں شامل ہو گئی ہیں۔ علیزے کی اس خواہش کی تکمیل میں۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ بریرہ نے نم آنکھیں ہاتھ سے رگڑتے ممنون و مشکور نظروں سے دیکھا اور بوجھل دل سے مسکرادی تھی۔ ہارون نے اس کا گال سہلا کر نماز پڑھنے کا اشارہ کیا۔ بریرہ جائے نماز اُٹھا کر بچھا رہی تھی۔ ہارون بستر کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

''السلام وعلیکم! صبح بخیر زندگی!'' بستر پر ڈھیلے سے انداز میں دراز آنکھیں موندے پڑی تھی۔ جب عبدالہادی نے اس کے چہرے پر پڑا کمبل سرکا کر زندگی سے بھرپور آواز میں اس پر سلامتی بھیجی تھی۔ علیزے نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کی شدتِ گریہ اور شب بیداری کی گواہ تھی۔ عبدالہادی کے دل پر گرا بوجھ بڑھنے لگا۔

''وعلیکم السلام!'' اس کی آواز بھی اس کی آنکھوں اور ذہن کی مانند بوجھل تھی۔ کہنیوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر اس نے اٹھنا چاہا تو عبدالہادی نے مقصد سمجھتے ہوئے خود اسے سہارا دیا تھا۔ ہاتھ کمر میں ڈال کر اسے بیٹھنے میں مدد دی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' اس کی نگاہوں میں تشویش کے ساتھ اضطراب بھی پھیل رہا تھا۔

''میں بیمار تھوڑی ہوں عبدالہادی!'' وہ دکھ سے ٹوٹنے لگی۔ عبدالہادی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ وہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر کچر کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی جب عبدالہادی نے بیڈ کراؤن پر پڑا اس کا سرخ نگینے جڑا، بے حد اسٹائلش سا کچر اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ یونہی غیر محسوس انداز میں اس کی کیئر کا عادی تھا۔ اس کی محبت اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی جنبش سے بھی علیزے کے لیے آشکار ہوا کرتی تھی۔

''لیزے! اپنے گھر چلتے ہیں۔'' بیڈ پر وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ علیزے نے لانبی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور سر کو نفی میں جنبش دینے لگی۔

''میں کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہوں عبدالہادی! پلیز منع نہیں کیجیے گا۔ پھر تو آپ مجھے اتنی دور لے جائیں گے کہ یہاں کسی کی شکل دیکھنے کو بھی ترسوں گی۔'' وہ جیسے پھر سے رونے کو تیار تھی۔ عبدالہادی بوکھلا کر رہ گیا۔

''لیزے...... لیزے میری جان! ایسا سمجھتی ہو مجھے؟ میں نے تمہیں کہا بھی ہے۔ اگر تم نہیں جانا چاہتی ہو تو نہیں لے کر جاؤں گا تمہیں۔ یقین کیوں نہیں میری بات کا؟'' وہ عاجز ہو کر پوچھ رہا تھا۔ علیزے اسے بغور تکتی رہی۔

''مگر میں آپ کو وہاں تنہا بھی نہیں بھیجوں گی۔ وہ وہیں ہے نا چڑیل!'' اس کا انداز یکدم تبدیل ہوا۔ اب چتون تیکھے تھے۔ عبدالہادی ایک لمحے کو حیران ہوا پھر بے ساختہ و بے اختیار ہنستا چلا گیا تھا۔

''واؤ...... امیزنگ! اب لگی ہو میری بیوی! میری لیزے!'' وہ اسی طرح ہنس رہا تھا۔ علیزے نے اسے گھورا۔ پھر خفگی سے منہ پھلا لیا۔

''خبردار جو میرا مذاق اُڑایا ہو۔''

''یار...... توبہ کرو۔ مذاق کہاں اُڑا رہا ہوں۔ تعریف کر رہا ہوں۔'' بامشکل ہنسی روک کر وہ شرارت سے بولا۔ علیزے کو مزید غصہ آیا۔

''ایسے کرتے ہیں تعریف!'' وہ خفگی سے تڑخ کر بولی تھی۔

''اوہ...... بھول گیا۔ تعریف کا انداز تو اپنا دوسرا ہے۔ ٹھہرو ابھی کرتا ہوں۔'' وہ اس کے چہرے پر سر جھکا انداز بے باکی کا تھا۔ علیزے نے سٹپٹا کر اسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

''تمیز سے زیادہ رومینٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بوکھلائی ہوئی نظر آنے لگی۔ رنگت دہک کر گلابی ہو رہی تھی۔ عبدالہادی نے لطف لیا تھا۔ گویا۔

''تم کبھی نہیں بدل سکتیں لیزے! ابھی تک اتنا ہی شرماتی ہو مجھ سے، جیسے......''

''اچھا بس، ذرا عبیر بھابی سے ناشتے کا تو کہیں، بھوک لگ رہی ہے مجھے۔'' وہ اس کی شرارت و شوخی سے چمکتی آنکھوں سے نگاہیں چراتی گریزاں سی بات بدل رہی تھی۔ عبدالہادی کی نظروں میں ہلکی سی خفگی لہرائی اور معدوم ہو گئی۔

''اب تو ذرا جلدی لے جانا پڑے گا تمہیں وہاں۔ اپنے والدین کے گھر آ کے محترمہ نے پابندیاں بڑھا دی ہے۔ وہاں کچھ نہ کچھ تو ہماری مرضی چلے گی ناں۔'' وہ صاف چھیڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود علیزے کو تپ چڑھ گئی تھی۔

''ہاں...... بہت خوب! جیسے اس سے پہلے تو آپ ہمیشہ بہت شریف رہے ہیں۔ مرضی کبھی چلائی ہی نہیں۔''

عبدالہادی کا قہقہہ بے ساختہ اور بلند تھا۔ علیزے کو اپنی حماقت کا احساس ہوا تو صرف چڑا ہی نہیں، جل اٹھا تھا، وہ خود بھی خفت سے دوہری ہونے لگی تھی۔

''ہٹیں...... میں خود ناشتا لاتی ہوں، حد ہے۔ اتنا ہی احساس ہے آپ کو میرا۔'' وہ صاف راہِ فرار ڈھونڈ رہی تھی۔ عبدالہادی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔

''نہ...... نہ یارِ من! یہ تکلف نہ کرو۔ یہ خادم کس لیے ہے۔ خود پیش کرے گا ناشتا ٹرے میں سجا کر۔'' وہ سراپا عاجز تھا۔ مگر شرارت ہر ہر انداز سے ٹپکتی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں اس خدمت خلق کی۔ سب یہی سمجھیں گے اتنے ہی فرمانبردار ہیں آپ میرے۔'' منہ پھلا کر وہ نروٹھے پن سے بولی اور پیر بیڈ سے لٹکا کر اپنے جوتے تلاش کرنے لگی۔

''کیا حرج ہے سمجھنے میں......؟ کیا میں نہیں ہوں آپ کا خیال رکھتا؟'' وہ ہنوز اسی شریر انداز میں گویا ہوا تھا۔ علیزے نے اب کی بار اسے عاجزانہ انداز میں دیکھا۔

''عبدالہادی پلیز! تنگ نہ کریں مجھے۔'' وہ بے بس نظر آ رہی تھی۔

''او کے مادام! جو حکم۔'' وہ مسکرایا اور اس کا راستہ چھوڑا۔

''تم منہ ہاتھ دھوؤ میں عبیر بھابی سے کہتا ہوں ناشتے کا۔'' عبدالہادی کو اس کی طبیعت کا خیال آیا تو پھر ٹوکا۔

''ان کی چھوٹی سی بچی ہے عبدالہادی! وقت

بے وقت زحمت دینا مناسب نہیں لگتا۔ دوبارہ پوچھ گئی ہیں ناشتے کا مجھ سے، میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔'' وہ نرمی سے وجہ بتا رہی تھی۔

'' ٹھیک ہے، پھر میں مدد کرا دیتا ہوں۔''

عبدالہادی اس کے ساتھ ہی دروازے کی جانب بڑھا تو وہ جھجک کر رُک گئی۔

''نہیں عبدالہادی! یہ ہمارا گھر نہیں ہے ناں! یہاں بابا جان اور اُم جان اور باقی سب کیا سوچیں گے۔'' وہ متذبذب تھی۔ عبدالہادی آہستگی سے مسکرانے لگا۔

''اچھا ہی سوچیں گے۔ مطمئن ہوں گے کہ ان کی بیٹی کو بہت اچھا بہت خیال رکھنے والا شوہر ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، وغیرہ وغیرہ۔'' اس کا شوخ و شنگ انداز بے حد شرارتی تھا۔ علیزے سرتاپا دہک سی گئی۔

''شرم کریں کچھ، پھر تو بالکل نہیں لوں گی آپ کی مدد۔'' وہ جس طرح چلبلا کر بولی عبدالہادی کو اور بھی ہنسنے کا موقع مل گیا تھا۔ علیزے جھلا کر باہر نکل گئی تھی۔

☆......☆......☆

'' عبدالہادی چلے گئے؟'' آنگن میں اتری دھوپ میں وہ اُم جان کے پاس تخت پر بیٹھی تھی۔ کچھ فاصلے پر عبیر بیٹھی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف سبزی بنا رہی تھی۔ اُم جان تسبیح پڑھتے اونگھ رہی تھیں جبکہ لاریب تکیے کے سہارے نیم دراز اپنے پاس بیٹھے پزلز کے ٹکڑے جوڑتے عبدالاحد کو دیکھتی تھی۔ وہ کھیل میں پوری طرح گم تھا۔ کبھی جب ٹکڑا صحیح نہ جڑتا تو جھنجلا کر سارے ٹکڑے پٹخ دیتا۔ لاریب مسکراتی اور اس کی ہیلپ کرنے لگتی۔ کچھ فاصلے پر اتباع کی کاٹ تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی عبیر نے اسے فیڈ کرا کے سلایا تھا۔ لاریب نے عبیر سے سبزی بنانے کا کہا تھا۔ مگر وہ مانی نہیں تھی۔

''نہیں...... بھئی! ابھی آپ کے لیے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں۔ بس آرام کریں۔ ساری زندگی انسان کو کام ہی کرنا ہوتا ہے۔'' اس کے لہجے و انداز میں محبت تھی۔ پیار تھا۔ اُم جان دونوں کی یگانگت کا یہ مظاہرہ دیکھ دیکھ کر ڈھیروں خون بڑھتا محسوس کرتیں مسکرائے جاتی تھیں۔ وقت نے کیا کیا کچھ نہ دکھلایا تھا۔ مگر اب طمانیت ہی طمانیت تھی الحمد اللہ، سوائے علیزے کی ایک کمی کے۔ جس کے لیے وہ شدتوں سے دعا گو رہا کرتیں۔ لاریب کے سوال پر علیزے جو خود بھی غنودگی میں جا رہی تھی۔ آنکھیں کھول کر اُسے تکنے لگی۔

'' ہاں۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔ جس سے لاریب کی تشفی نہیں ہوئی۔ اسے صاف لگ رہا تھا۔ علیزے خفا ہے اس سے۔''

''کہاں......؟ مطلب وادی......؟''

''نہیں، ابھی کچھ دنوں میں جائیں گے۔ میں ساتھ جا رہی ہوں ان کے۔'' علیزے کا انداز مدہم تھا۔

'' اچھا فیصلہ ہے۔'' لاریب نے سراہا تھا۔ وہ خالی نظروں سے اسے تکنے گئی۔

'' مگر میں سب سے بہت دور ہو جاؤں گی۔ یہ سوچ کر دل بہت گھبراتا ہے۔''

'' بہت پیسہ ہے ماشاء اللہ! عبدالہادی بھائی کے پاس۔ چاہنا تو ہفتہ بھر بعد بھی چکر لگا لینا۔ نو پرابلم میری جان!'' لاریب نے تسلی دی تھی۔ عبیر تائیدی انداز میں مسکرانے لگی۔ علیزے نے گہرا سانس بھرا۔'' وہ بھی یہی کہتے ہیں۔''

'' ٹھیک کہتے ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' لاریب مسکرائی اور اسے دیکھا۔ وہ خاموش رہی۔

'' اتنا بڑا محل نما گھر، ڈھیروں ملازم۔ علیزے بالکل ملکہ بن کر رہو گی تم۔'' لاریب نے پھر اسے بہلانا چاہا۔ علیزے اب کے خفا نظر آنے لگی۔

'' مال و دولت، جاہ و حشم سب کچھ نہیں ہوتا ہے لاریب! تم تو جانتی ہو گی اس بات کو۔ دل آباد رکھنے کو ہمیں حقیقی خوشیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس کا

انداز خفیف سی چبھن لیے ہوئے تھا۔ لاریب کو یقین ہوا وہ واقعی بہت خفا ہے اس سے۔ جبھی خاموش کی خاموش رہ گئی۔ پھر اسی شام جب وہ لاریب کے ہی کہنے پر اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں چھوڑنے آئی تو لاریب نے واپس پلٹتی علیزے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔'' اس کے چونک اٹھنے پر لاریب نے نرمی سے مسکرا کر کہا تھا۔ علیزے کچھ نہیں بولی۔ البتہ اس کے بستر کے کنارے ٹک گئی تھی اور ہونٹ بھینچے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اللہ گواہ ہے علیزے! اس گھر میں میرا پہلا قلبی تعلق عبدالغنی سے استوار ہوا تو اگلا بندھنے والا تعلق تم سے تھا۔ تم نہیں جانتی مگر رب جانتا ہے۔ تمہارا ہر دکھ، ہر اضطراب میں نے اپنے دل پر سہا اور محسوس کیا ہے۔ جن دنوں تم لاپتا ہو گئی تھیں۔ عبدالغنی راتوں کو سو نہیں پاتے تھے۔۔۔ اور میں...... مجھے لگتا تھا۔ یہ دکھ صرف ان کا نہیں ہے۔ میں بھی اتنی ہی بے قرار رہا کرتی تھی۔ ہماری دعاؤں کا مرکز صرف تم قرار پا گئی تھیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے لیزے جن سے محبت کی جاتی ہے ان سے غفلت نہیں برتی جاتی۔ ہمیشہ اس دل نے تمہارا بھلا چاہا ہے۔ کل جو کچھ ہوا۔ اس نے تم سے زیادہ مجھے اضطراب بخشا ہے، یہ یقین کر لو تم۔ میں یہ بات قبل از وقت کہنا نہیں چاہتی تھی، مگر مجھے لگ رہا ہے تم بدگمان اور خفا ہو رہی ہو مجھ سے۔ لیزے...... عبدالعلی ہمیشہ سے تمہارا تھا۔ تمہارا ہی رہے گا۔ یہ تو بس ایک فارمیلٹی سمجھ لو کہ میں اسے نبھا رہی ہوں۔ اللہ ہم سب کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ تم بیٹی کی ماں بنو اللہ کرے۔ آمین۔ علیزے تو میں عبدالعلی کی دلہن بنانا چاہوں گی اسے۔ بتاؤ انکار تو نہیں کرو گی تم؟ آخر اتنی لینڈ لارڈ ہو گئی ہو اور ہم بیچارے عام سے رہن سہن والے، عام لوگ۔'' لاریب کا انداز شگفتہ تھا، متبسم تھا۔ اس کے باوجود علیزے کے چہرے پر خوشی کی کوئی کلی نہیں چٹکا سکا۔ لاریب نے بے حد حیران ہو کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب اور بے بسی کو پا کر بے چین ہونے لگی۔

''کیا ہوا علیزے! کیا میری کوئی بات بری لگی تمہیں؟'' وہ سہم رہی تھی۔ خائف ہوئی جاتی تھی۔ اپنے تئیں تو اس نے اسے خوش کرنا چاہا تھا۔ مگر۔

''کون جانے لاریب...... قسمت میں کیا لکھا ہے۔ عبدالعلی ماشاء اللہ سے سات سال کا ہو گیا ہے۔ اِدھر ہمارے ہاں ابھی تک کوئی امید نہیں۔ عمروں کا اتنا فرق بچوں میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہونے دیتا۔ مجھے لگتا ہے میری یہ خواہش......''

''افوہ! علیزے اللہ کے گھر سے ناامید نہیں ہوتے۔ اللہ ضرور نوازے گا تمہیں تم دیکھ لینا۔ ہماری سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور عمروں کے فرق کی کیا بات کی تم نے...... اپنے بھائی اور میری عمروں کے تفاوت کو کیوں بھلا دیا؟ پورے دس سال بڑے ہیں محترم مجھ سے اور جہاں تک بات عبدالعلی کی ہے۔ تو پندرہ سال کا بھی فرق پڑ جائے۔ میں اسے جرأت نہیں دوں گی ہمارے فیصلے سے انحراف کرنے کی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟'' اس کی بات کاٹ کر لاریب نے اسے اپنے گلے سے لگا کر اتنی محبت سے، اتنے پیار سے عہد باندھا تھا۔ کہ علیزے کی آنکھیں اس محبت پر نم ہونے لگی تھیں۔

''مگر لاریب! بچوں پر زبردستی نہیں ہونی چاہیے جو بندھن دلوں کی خوشی کا باعث نہ ہو۔ اس کا......''

''ایسا کیوں سوچتی ہو علیزے تم؟'' ہم مثبت کیوں نہ سوچیں۔ اللہ مہربانی فرمائے گا۔ بس اب ہر فکر جھٹک دو۔ خوش رہا کرو۔'' لاریب نے محبت سے اس کا گال تھپکا تھا۔ وہ بوجھل انداز میں مسکرا دی۔

''پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگا، بجو عبدالعلی سے امن کا......''

''بھابی ایسا نہیں کریں گی علیزے! جہاں تک میں سمجھی ہوں۔ وہ بھی تمہاری خواہش پہچانتی ہیں۔ وہ کبھی تمہاری خواہش کے راستے میں نہیں آئیں گی۔'' لاریب کا لہجہ اتنا پُریقین تھا۔ کہ علیزے کا دل خفت و ملال سے بھر گیا۔ اس نے ایکدم سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے! کل کتنی بدتمیزی کر دی ان سے۔ کس قدر ہرٹ ہوئی ہوں گی وہ......'' اس کا انداز خود کلامی کا تھا۔ چہرے پر گہرا تاسف و تفکر در آیا تھا۔ لاریب ایکدم سے ہنس دی۔

''تو تم انہیں منالو، انہیں بتادو تم سے غلطی ہوگئی ہے۔ لیزے بات دل میں رکھنے سے رشتوں میں دوریاں اور دراڑیں پڑتی ہیں۔ کلیئر کر لینے سے رشتے نہ صرف پختہ ہوتے ہیں بلکہ ان کا مان بڑھتا اور سلامت رہتا ہے۔ اور مان سلامت رہنے چاہیے۔ ورنہ دوریوں کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ جب مان ختم ہوتے ہیں تو رشتوں میں موجود محبت دھیرے دھیرے دم توڑنے لگتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جس طرح جڑے ہیں، ہمیں جڑے رہنا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے میں اتباع اور عبدالعلی کے بعد عبدالاحد کا بھی رشتہ طے کرنے کا سوچ رہی ہوں اور اس کے لیے میرا خیال اسامہ بھائی کی بیٹی کا ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟'' وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ علیزے ایکدم ہنسنے لگی۔

''حد ہوگئی ہے، مجھے لگ رہا ہے میرے سامنے چھبیس سالہ لاریب نہیں پچاس سالہ خاتون بیٹھی ہے۔ جو رشتوں کے جوڑ توڑ میں لگی ہے اولاد کے۔'' لاریب نے اس کا ہنسی میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر بھرپور آسودگی کے ساتھ بولی تھی۔

''اگر یہ کام ابھی نبٹ جاتے اللہ کے حکم سے تو ہم بچوں کے جوان ہونے پر اس ذہنی آزمائش سے نہ صرف خود بچ جائیں گے بلکہ بچوں کی جلدی شادیاں کر کے ان کی خوشیاں دیکھ سکیں گے انشاء اللہ! خاص کر عبدالعلی کی شادی تو میں جلدی کرنا چاہوں گی۔ آخر وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ تم ہرگز بھی تب بہانے نہیں بناؤ گی کہ ابھی بیٹی چھوٹی ہے تمہاری یا تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔'' وہ آرام سے بات کرتے یکدم تیکھی ہوگئی تھی۔ علیزے پہلے تو ہونق ہوئی تھی پھر اس کی شرارت سمجھ کر خود بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگی۔

☆......☆......☆

ان کے جانے کی سب تیاری مکمل تھی۔ سب کچھ معمول پر تھا۔ کہ ایک دم سب کا سب دھرا رہ گیا۔ عبدالہادی عین وقت پر کسی ضروری کام سے نکلا تھا۔ علیزے کو اپنا انتظار کرنے کا کہہ کر...... واپس لوٹا تو علیزے کو عین صحن کے درمیان بے ہوشی کی حالت میں پا کر زمین آسمان اس کی نظروں میں گھوم گئے تھے۔ علیزے اچھی بھلی تھی جب وہ گھر سے گیا گیا، ایک دم سے اسے کیا ہوا یا اس پر کیا بیتی یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے اُٹھا کر بستر پر منتقل کرتے عبدالہادی نے گھر پر ہی اسے ہوش میں لانے کی ہر ترکیب آزما کر دیکھ لی مگر کوئی فائدہ نہ ہوتے پا کر زمین اس کے قدموں تلے سے سرکنے لگی تھی۔ علیزے کو گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہوئے اس نے بہت گھبراہٹ زدہ انداز میں یہ بات عبدالغنی کو فون پر بتا دی تھی۔ عبدالغنی تب کالج میں تھا۔ اسے بھی جیسے زمان و مکان بھول گئے تھے۔۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ خود بھی ہاسپٹل کی جانب بھاگا تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ عبدالعلی کو اسکول سے لینے کا وقت ہوا چاہتا ہے اور بچہ اس انتظار میں پریشان بیٹھا ہوگا۔

(لفظ لفظ مہکتے اس ناول کی اگلی قسط ماہِ مئی میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

نادیہ جہانگیر خان

مہکوا اپنے آنگن میں

''مسکون میں نے نہیں آپ نے میرا برباد کیا ہوا ہے بھابی۔ میں اپنے گھر سے لٹی پٹی نکلی تو آپ کو چاہیے تھا مجھے اپنا ہونے کا احساس دیتیں۔ مجھے رونے سے منع کرتیں، ٹوٹنے بکھرنے سے بچاتیں..... مگر آپ نے تو ایسے ری ایکٹ کیا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور......

زندگی کی حقیقتوں کو عیاں کرتا ایک مہکتا افسانہ

کیا بنا رہی ہو؟ مومنہ کچن میں کھڑی رائتہ بنا رہی تھی جب پیچھے سے کلثوم بھابی آ ٹپکی۔ وہ ابھی ابھی بازار سے لوٹی تھی ابھی ہاتھوں سے سامان اتار بھی نہیں تھا کہ کچن سے آتی خوشبوؤں نے اسے کھٹکا کے رکھ دیا جو وہ ادھر دوڑی چلی آئی۔

بریانی بنا رہی ہوں۔ ساتھ رائتہ بھی۔ فریج سے دہی نکالتے ہوئے مومنہ نے آرام سے جواب دیا تو کلثوم اپنی جگہ سے اچھل کر رہ گئی۔

''کیا؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' مومنہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''کارنر والے ڈبے میں چاول پڑے تھے تم نے وہ نکال لیے؟ کلثوم کی حیرت میں عجیب طرح کی تختی آنے لگی۔

ظاہر ہے۔ اس ڈبے کے سوا اور کہیں بھی تو چاول نہیں تھے، پھر وہی سے نکالنے تھے نا۔'' مومنہ نے اپنی دانست میں بالکل صحیح جواب دیا۔

اور جو صبح میں نے گوشت منگوایا تھا وہ بھی ڈال لیا؟''

''کیا ہو گیا ہے بھابی آپ نے بھی تو وہ گوشت پکانے کے لیے منگوایا تھا نا۔''

مگر میں نے وہ تمہارے لیے نہیں منگوایا تھا بے حد غصے سے کلثوم کی آواز پھٹ کر رہ گئی۔ جواباً مومنہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''بھابی میں نے بریانی صرف اپنے لیے نہیں بنائی۔''

''ہاں میں جانتی ہوں تم نے وہ بریانی اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ساتھ جو دو سپوت لائی ہو ان کے لیے بنائی ہو گی۔'' کلثوم کا بس نہ چل رہا تھا کہ بریانی سمیت مومنہ کو بھی باہر اٹھا کر پھینک دے۔ اس کا غصہ عروج پر پہنچ رہا تھا۔

''میرے خیال میں بی بی انسان جہاں رہتا ہے کھانے پینے کا انتظام بھی وہیں سے کرتا ہے۔'' اس نے آرام سے کہہ کر ڈونگے میں دہی ڈال دیا۔

''ہاں مگر دوسروں کی چیزیں چوری کر کے

نہیں کھاتا۔ کلثوم کا لہجہ آگ برساتا ہوا تھا۔
''واٹ ڈو یو مین۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''
مومنہ جیسے کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی تھی۔
''میں نے یہ چاول تمہارے لیے نہیں اویس کے دوستوں کی جو کل دعوت ہے اس کے لیے رکھے ہوئے تھے اور یہ گوشت آج رات کے کھانے کے لیے تھا۔ تم نے انہیں ہاتھ کیسے لگایا؟'' کلثوم کو اتنا غصہ آرہا تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا کہ بریانی کا دیگچہ اٹھا کر اس پر الٹ دے۔
''مجھے بھوک لگی ہے جب ہی بریانی کا پروگرام بنالیا۔'' بالکل ٹھنڈے ٹھار انداز میں اس نے کہا اور ساتھ ہی چاولوں کا دم اتار دیا۔ چاولوں کی خوشبو سارے کچن میں پھیل گئی تھی مگر کلثوم غصے سے اتنی حواس یافتہ ہو رہی تھی کہ خوشبو بھی اسے زہر سے کم نہ لگی۔
''تم اچھا نہیں کر رہی مومنہ۔''
''میرے خیال میں بریانی بنا کر میں نے کچھ برا نہیں کیا۔'' اس نے تنک کر جواب دیا تو کلثوم کو آگ لگ گئی۔
''اگر تم یہی بریانی افتخار کے گھر بناتی تو میں بھی دیکھتی کہ وہ تمہیں کیسے کھانے دیتا۔'' لب ولہجہ ہی نہیں کلثوم کی آنکھیں بھی شرارے اگل رہی تھیں۔
''وہ حساب کتاب رہنے دیں بھابی، ابھی تو میں نے یہ بریانی اپنے جیتے جاگتے باپ کے گھر بنائی ہے...... مجھے کھالینے دیں۔'' بے حد سہولت سے کہہ کر وہ کھانے کے برتن لگانے لگی۔

"اور ہاں آپ بھی ہاتھ منہ دھو کر ٹیبل پہ آجائیں میں کھانے لگانے لگی ہوں۔ اپنے لہجے مین زمانے بھر کی نرمی بھر کے اس نے کہا تو شرارے اگلتی آنکھوں کے ساتھ کلثوم نفی میں گردن ہلانے لگی۔

یہ تم اور تمہارے بچے کھاؤ جو اپنے گھر سے بھوکے ننگے آئے ہیں مجھے ضرورت نہیں ان کھانوں کی۔ بے حد مشتعل سی وہ پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی...... مومنہ کے چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ آکر معدوم ہوگئی۔

☆......☆......☆

وہ جب سے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر آئی تھی۔ گھر کی فضا میں تبدیلی سی آنے لگی تھی وہ سب محسوس کر رہی تھی۔

بھائی باپ کا رویہ ویسا ہی تھا مگر کلثوم بھابی کا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا اسے لگا وہ اس کے آنے پر خوش نہیں ہیں لیکن جب بھائی اور باپ خوش تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ تو بھلا کلثوم کے رویے کی اسے پرواہ کیوں ہوتی اور اس کی یہی لاپرواہی ادھر کلثوم کو بہت کھٹکا کرتی تھی جس کا اظہار وہ گاہے بگاہے کرنے سے نہ چوکتی آخر بیٹھے بٹھائے یہ نند صاحبہ ان کا سکون برباد کرنے جو آگئی تھی۔

کلثوم کو تو وہ تیز طرار اور کافی ہوشیار اور چالاک نند پہلے ہی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر جب سے وہ مسلسل اس کے سر پر سوار ہونے کے لیے بوریا بستر باندھ کر لبے اور غیر متعین وقت کے لیے آن ٹپکی تو کلثوم کو اپنی راتوں کی نیند حرام ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔

اپنے شوہر اور سسر کا ہر وقت مومو، مومو کا راگ الاپنا، مومو کے آگے پیچھے پھرنا، اس کی جی حضوریاں کرنا، اسے تسلیاں دلاسے دینا، اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ بجٹ متاثر کر کے خواہ مخواہ اسے اور اس کے بچوں کو شاپنگ کرانا، ہوٹلز میں کھانا کھلانا اور راتوں کو اسپیشلی اس کے لیے آئسکریم لانا، یہ سب دیکھ کر کلثوم کا بی پی ہائی ہو جاتا، دل بند ہونے لگتا...... ایسے میں اسے مومنہ کا یہاں آنا زہر سے بھی برا لگتا اور دوسری طرف مومنہ جو اپنے شوہر سے لڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے آئی تھی اب باپ اور بھائی کی محبتوں کے سائے میں خوب عیش و آرام سے رہ رہی تھی۔ وہ اور اویس دو ہی بہن بھائی تھے امی کی وفات کے بعد ابو نے ان کا ماؤں کی طرح خیال رکھا تھا اور ایک ماں کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کو بہت نازوں سے پالا تھا انہوں نے دونوں کو کسی بھی چیز کی کمی ہونے نہیں دی تھی۔ دنیا کی ہر چیز ان کے سامنے لا کر ڈھیر کر دی۔ دونوں میں کبھی فرق محسوس نہیں کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہی، انہوں نے بنا کسی اعتراض کے خاموشی سے ان کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور اب بھی جتنی پنشن لاتے دونوں میں برابر تقسیم کرتے ایسے میں مومنہ اس گھر، اس گھر کی چیزوں اور گھر کے افراد پر رعب نہ جماتی تو اور کیا کرتی۔

یہ گھر اس کے باپ کا ہے۔ یہی مان اس کے لیے کافی تھا۔ وہ جو چاہے کرے، جو چاہے بھرے، کوئی دوسرا کیوں پوچھے۔

افتخار یعنی اس کے شوہر کے ہاں اس کی ماں کی چخ چخ تھی۔ نندوں کے الگ رونے پیٹنے تھے اور ابھی دو بیاہنے کو بیٹھی تھیں...... افتخار کی عازم سی جاب تھی۔ جس سے گھر کا خرچہ چلانا ہی اتنا مشکل تھا کجا کے کچھ سنبھال کر رکھنا۔

چار سال شادی ہو گئے تھے مگر ابھی تک وہ

وہاں ایڈجسٹ نہ ہو پائی تھی وہ افتخار سے اکثر الگ رہنے کی فرمائش کرتی تھی مگر افتخار اس کی بات سے کنی کتراتا تھا جب ہی وہ اسے اور اس کے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے چلی آئی کہ باپ کے گھر اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی...... کھانا پینا سونا جاگنا کہیں روک ٹوک نہ تھی...... ساتھ اپنے دونوں بچے بھی لے آئی کہ ابو اچھے سے اسکول میں پڑھوائیں گے ان کی پڑھائی لکھائی کا خرچہ وہ باآسانی اٹھالیں گے ۔ جب ہی ادھر آ کر وہ بے حد پرسکون ہوگئی تھی۔ مگر کلثوم بھابی کا رویہ اسے ذرا ذرا سا بے سکون کرنے لگا کیوں کہ وہ خواہ مخواہ اس کے ابو اور بھائی اور اس کی زندگی میں مخل ہو رہی تھی۔

''تم کلثوم کو بھی بلاؤ پھر اکھٹے کھانا کھاتے ہیں۔ وہ بچوں کو لے کر ٹیبل پر آئی تو سب سے پہلے ابو کے منہ سے یہ سننے کو ملا۔ ''چھوڑیں ابو میں نے انہیں کہا ہے مگر انہیں بھوک نہیں۔'' اس نے فوراً برا سا منہ بنا کر جواب دیا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''کیوں بھوک نہیں ہے؟''

''مجھے کیا پتا۔'' ویسے بھی وہ ابھی بازار سے لوٹی ہیں تو یقیناً وہاں سے کچھ کھا کر ہی آئی ہوں گی۔

''نہیں، وہ باہر کی چیزیں نہیں کھاتی۔''

''چھوڑیں ابو، انہیں کھانا ہوا تو وہ آجائیں گی۔ آپ آرام سے کھائیں۔ وہ تپی۔

''مگر بیٹا۔ کلثوم......''

''ابو کیا آپ چاہتے ہیں میں بھی کھانا نہ کھاؤں؟'' اس نے گھور کر اپنے باپ کو دیکھا تو وہ چپ سے ہوگئے اور وہ سر جھٹک کر کھانا نکالنے لگی۔

☆......☆......☆

''بھابی میرے لیے بھی چائے بنا دیجیے گا۔ رات کو وہ ڈرامہ دیکھ کر پانی پینے کی غرض سے کچن میں آئی تو وہاں کلثوم کو چائے بناتے پایا۔

''آئی ایم سوری۔ دودھ بہت کم ہے، صرف اویس کے لیے ایک کپ چائے بن سکے گی۔ کلثوم نے سہولت سے معذرت کرنا چاہی تو اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

''میں نے بھی صرف ایک ہی کپ پینا ہے۔''

''ایک کپ چائے کے لیے بھی دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' کلثوم کا لہجہ ترش ہوا تھا۔

''آپ بھائی کی چائے مجھے دے دیں۔''

''آئی ایم سوری ان کے سر میں درد ہے میں ان کے لیے ٹیبلیٹ بھی لینے جا رہی ہوں۔'' کلثوم کپ میں چائے نکالنے لگی۔

اس چائے میں دودھ کچھ زیادہ ہی ہے۔ آپ ایسا کریں اس میں ایک کپ پانی ڈال کر اسے دو کپ بنا دیں۔

''مشورے کا شکریہ۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اور ویسے بھی اگر تمہیں اس وقت کچھ پینے کا دل چاہ رہا ہے تو پانی پی لو۔

''مجھے چائے پینی ہے۔'' وہ ذرا سا بگڑی۔

''تو پھر ایسا کرو یہ دیگچی یہ چینی یہ پتی سب حاضر ہیں تم اپنے لیے قہوہ بنا لو۔ اس کے پاس بھی مشوروں کی لائن تھی۔

''میں نے قہوہ نہیں چائے پینی ہے۔''

''پھر اپنے باپ سے کہو کہ تمہیں دودھ لا کر دے اس وقت۔''

''میرے خیال میں، میں اگر انہیں اس وقت بھی کہوں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ آرام سے اٹھ کر دودھ لا کر دیں گے۔ مگر میں ایسا نہیں کروں

گی کیوں کہ مجھے یقین ہے یہ جو آپ کہ ہاتھ میں
چائے کا کپ ہے یہ با آسانی میں پی سکتی ہوں۔''
اس نے اتنے آرام سے کہا کہ ایک پل کے لیے
کلثوم کو ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ
واقعی مومنہ کے ہاتھ میں چلا گیا ہو مگر اگلے ہی لمحے
اس نے سر جھٹکا اور کپ پہ گرفت اور مضبوط کر لی۔
''خوش فہمیوں سے نکل آؤ بی بی اور یاد رکھو اب
یہاں تمہاری وہ حیثیت نہیں ہے جو شادی سے
پہلے تھی۔
''یہ آپ کی غلط فہمی ہے بھابی۔ آپ بھول
رہی ہیں کہ میرے باپ اور میرے بھائی کو مجھ
سے کس قدر محبت ہے۔''
''تو تم اس محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی
کوشس نہ کیا کرو۔ کلثوم نے سختی سے اسے
ڈپٹا۔''میرے باپ بھائی میرے جو بھی نخرے
اٹھائیں میرے لیے وہ جائز ہیں......'' کلثوم کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے بے حد ترشی
سے کہا تب ہی کچن میں اویس آ گیا۔
''کلثم میں نے تمہیں پانی کے لیے بھیجا تھا
یار۔''
''لا رہی ہوں دراصل میں آپ کے لیے
چائے بھی بنانے لگ گئی تھی۔ کلثوم نے فوراً چائے کا
کپ اس کے سامنے کرتے ہوئے کن انکھیوں سے
مومنہ کی طرف دیکھا۔
''اویس بھائی میرے سر میں بھی درد ہے آدھی
چائے مجھے بھی مل سکتی ہے؟'' مومنہ کن پٹی
دباتے ہوئے بہت اذیت سے بولی تو کلثوم مڑ کر
اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اُف کتنی ڈرامہ باز لڑکی
ہے یہ۔ ابھی تو ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اس سے تو تو
میں میں کر رہی تھی۔ اور ابھی فوراً سر درد کا بہانہ بنا
لیا۔ اس نے تجلس کر سوچا۔ ارے آدھا کیوں
پورا کپ لے لو اور ساتھ میں ٹیبلیٹ لینا نہ بھولنا۔
اویس اُس سے کہتے ہوئے فریج سے پانی نکالنے
لگا۔
اوہ تھینک یو بھائی چائے پی کر شاید درد میں کچھ
کمی آ جائے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کلثوم سے
چائے کا کپ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔
اویس میں نے یہ آپ کے لیے بنائی ہے۔۔
کلثوم نے بے بسی سے اویس کو دیکھا تو اویس نے
ملامت سے اسے گھورا۔
''اگر مومنہ نے پی لی تو سمجھ لو میں نے پی
لی۔''
''جی۔'' جی دل نہ چاہتے ہوئے بھی کلثوم نے
مومنہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مومنہ فاتحانہ نظروں
سے اسے دیکھتی کپ پکڑنے ہی لگی تھی کہ کپ
وہیں درمیان میں گر گیا۔
''اندھی ہو کیا دیکھ کر نہیں پکڑ سکتی۔'' کلثوم بگڑ
تو پڑی تھی۔
''ایکسیوزمی یہ کپ آپ کے ہاتھ سے چھوٹا
ہے میرے ہاتھ سے نہیں۔
اس نے بھی بنا لحاظ کیے ترکی بہ ترکی جواب دیا
تو کلثوم کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے
لگی۔
''اچھا لڑ کس بات پر رہی ہو تم لوگ، تم نئی
چائے بھی تو بنا سکتی ہو۔ کلثوم ایسا کرو ابھی مومنہ
کے لیے ایک کپ چائے کا اور بنا دو۔''
''میرے اپنے سر میں درد ہو رہا ہے اویس
مومو پلیز اپنے لیے کچھ بنانے لگو تو ایک کپ
میرے لیے بھی بنا دینا۔ میں اپنے کمرے میں ہی
ہوں۔'' کلثوم کے بھی اسی وقت سر میں درد جاگ
اٹھا وہ پیشانی مسلتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
''دیکھا دیکھا اویس بھیا کس قدر چالاک ہے

آپ کی بیوی۔ ابھی تو مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ دودھ ختم ہوگیا اب بھلا میں کیسے چائے بناؤں۔''
اگر تمہارے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے تو میں ابھی جا کر دودھ لے آؤں۔
''رہنے دیں بھائی۔ اب صبح ہی چائے پی لوں گی۔ اور ٹیبلیٹس میرے پاس ہیں ابھی جا کے لیتی ہوں۔ وہ بظاہر بڑی ملامت سے بولی تھی۔
ویسے بھی وہ چائے پینے یا لینے تھوڑی آئی تھی۔ بس پانی کی غرض سے آئی تھی۔ کلثوم کو وہاں پا کر اپنی اہمیت جتانا آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن افتخار اسے لینے آیا تھا۔ مگر اس نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا باپ بھائی نے اسے ذرا سا سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بگڑ ہی اٹھی۔
''میں آپ پر بوجھ ہوں نا، جب ہی آپ مجھے اتار پھینکنا چاہ رہے ہیں''
''ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔''
''ایسی ہی بات ہے ابو۔ ورنہ آپ مجھے کیوں افتخار کے ساتھ جانے کو کہتے''
وہ اپنی جگہ بے حد روہانسی ہو رہی تھی۔۔
تم اس کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو مومو۔ ایک طرح سے وہ بیچارہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ ابھی دو بہنیں بیاہنی ہیں، ماں کا علاج ہو رہا ہے۔ ایسے میں وہ کیسے ایک نیا گھر افورڈ کر سکتا ہے اور ماں بہنوں کو چھوڑ کر کیسے الگ ہو سکتا ہے؟''
''بہانے کرتا ہے یہ، سب بکواس ہے یہ، اصل میں وہ چاہتا ہی نہیں کہ میں بھی خوش رہوں۔
''مومنہ تم حالات سمجھنے کی کوشش کرو، کچھ ہی عرصے میں افتخار اپنی بہنوں کو بیاہ دے گا، پھر جو بھی کمائے گا تم لوگوں کے لیے ہی ہوگا پھر نیا

گھر بھی بن جائے گا اور تمہیں کوئی پرابلم بھی نہیں ہوگی۔'' مومنہ نے سمجھانا چاہا۔
''آپ تو خاموش ہی رہیں۔ میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں میں سب اچھی طرح جانتی ہوں اور ویسے بھی آپ جس مقصد کے لیے کہہ رہی ہیں اسے بھی میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ ادھر کلثوم کے بولنے کی دیر تھی ادھر وہ اس پر چڑھ دوڑی کلثوم نے خفگی سے اسے گھورا۔
''کیا مقصد ہو سکتا ہے میرا؟''
''رہنے دیں میری زبان نہ ہی کھلوائیں تو بہتر ہے۔'' اس نے سر جھٹکا تو کلثوم کو پتنگے لگ گئے۔
نہیں بہتر ہے کہ تم اپنی زبان کھول ہی دو۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ میرا کیا مقصد ہے۔
''کلثوم...... اویس نے کلثوم کو تنبیہہ نظروں سے دیکھا۔
''آپ درمیان میں نہ بولیں یہ جس دن سے آئی ہے میرا سکون برباد کر کے رکھا ہوا ہے۔'' آج کلثوم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔
''سکون میں نے نہیں آپ نے میرا برباد کیا ہوا ہے بھابی۔ میں اپنے گھر سے لٹی پٹی نکلی تو آپ کو چاہیے تھا مجھے اپنا ہونے کا احساس دیتیں۔ مجھے رونے سے منع کرتیں، ٹوٹنے بکھرنے سے بچاتیں...... مگر آپ نے تو ایسے ری ایکٹ کیا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور زبردستی اس گھر میں اٹھ آئی ہوں غیروں کی طرح ٹریٹ کیا آپ نے مجھے۔'' وہ تو پہلے ہی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ اب موقعہ ملا تو کیسے گنوا دیتی۔ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔
''ایکسیوزمی محترمہ تم لٹ پٹ کر آئی کب؟''
جان بوجھ کر تم نے اپنا گھر چھوڑا، خوانخواہ ادھر

آ کر واویلہ کیا، کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے سب غلط ہو رہا ہے۔ اور ایسے میں تم ٹوٹتی بکھرتی کیسے...... یہ سب تو تم ڈھونگ رچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ صرف اور صرف باپ اور بھائی کی ہمدردی بٹورنے کی خاطر۔'' کلثوم کہاں ادھار رکھنے والی تھی جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

''زبان سنبھال کے بات کریں بھابی......''

''مومو بیٹا کیا ہو گیا تمہیں...... کچھ تو خیال کرو۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ابو انہی کو میرے یہاں رہنے سے زیادہ تکلیف ہے۔ جب ہی تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی ہیں کہ مجھ سے الجھیں اور پل میں باہر کریں۔''

''یہ چھوٹی سوچ صرف تمہاری ہو سکتی ہے بی بی۔ ورنہ میں تو تمہیں پچھلے آٹھ سالوں سے یونہی برداشت کر رہی ہوں۔''

''دیکھا، دیکھا ابو...... بھائی دیکھ لیا آپ نے ...... یہ کیا کہہ رہی ہے۔ انکے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ سن رہے ہیں آپ......'' وہ بپھر کر باپ بھائی کو دیکھنے لگی۔

''انہیں کیا دکھانا اور سنانا چاہ رہی ہو کیا ان کی آنکھیں اور کان نہیں ہیں......؟ تمہیں کیا لگتا ہے یہ اپنی بہن بیٹی کی حرکتوں سے انجان بیٹھے ہیں نہیں جانتے سمجھتے جو آج تک تم کرتی آ رہی ہو۔

''اسٹاپ اٹ کلثوم...... کیا ہو گیا ہے؟ تم دونوں کو...... بند کرو یہ زبان درازی۔ پہلے ہی ہم کتنے پریشان بیٹھے ہیں اور اوپر سے تم دونوں لڑنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں...... تف ہے تم دونوں پر......''

''ایکسیوزمی اویس آپ کو یہ پریشانی میری وجہ سے نہیں اپنی لاڈلی بہن کی وجہ سے ہے۔ آپ اسے ہی سمجھائیں تو بہتر ہوگا۔'' کلثوم ترکی بہ ترکی جواب دیتی اٹھی اور نخوت سے سر جھٹکتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''مجھ سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بھائی جان۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔'' وہ بھی غصے سے اٹھی اور باہر نکل گئی اور وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

''کون اسے سمجھائے۔ یہ اپنا گھر خود تباہ کر رہی ہے۔ بھائی خود کو پہلے سے زیادہ کمزور محسوس کر رہا تھا۔

''بے وقوف ہے بہت......'' باپ کے چہرے سے ندامت جھلک رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد پورے ایک ماہ تک افتخار نے نہ خود کال کی اور نہ لینے آیا جہاں مومو سکون میں تھی وہاں کلثوم کا سکون مکمل برباد ہو چکا تھا۔ مومو گھر میں مہارانی بنتی پھرتی تھی اور وہ سارا دن گھر کے کام کاج نمٹانے میں لگی رہتی، جب فارغ ہوتی تو نہ نہ کرتے بھی ان دونوں کے درمیان کسی نہ کسی بات پر بدمزگی ہو جاتی جس کی وجہ سے کلثوم شدید ٹینشن میں آ کر جیسے گھر کے سب ہی افراد سے بے زاری محسوس کرنے لگی تھی۔

مومنہ جیسے اس کے حواسوں پر مسلط رہنے لگی تھی اور کلثوم کا سکون ختم ہوتا جا رہا تھا۔ مومنہ پہلے کی طرح اب بھی گھر پہ حاوی ہی تھی۔ باپ بھائی پہلے ہی اس کی آنکھ کا دیا تھے مگر اب تو جیسے مومنہ کا تسلط ان پر کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا تھا اور یہ دیکھ کر کلثوم کے پاس سوائے کڑھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اس دن بھی کلثوم کو بازار جانا تھا جب ہی وہ

کمرے میں آرام کرتے اویس کے پاس چلی گئی مگر اویس پہلے سے بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''یار آج کا پروگرام رہنے دو کل لے چلوں گا۔''

''پلیز اویس آپ پچھلے ایک ہفتے سے یونہی کہہ رہے ہیں مگر پھر ہر روز ہی کل کا کہہ دیتے ہیں آج تو آپ چلے چلیں۔''

''سوری یار قسم سے آج تو بہت تھکن ہو رہی ہے پر اس کل ضرور لے چلوں گا۔''

''ذرا سی کنپٹی دباتا وہ بولا تو کلثوم چپ سی ہو گئی تب ہی ایک طرف سے مومنہ چلی آئی۔

''بھائی، بھائی کہاں ہیں آپ؟''

''جی بیٹا کیا بات ہے؟'' اویس فوراً سیدھا ہوا۔

''بھائی دیکھیں ناں میرے بچے کتنا تنگ کر رہے ہیں مجھے۔ پلیز آپ انہیں آئس کریم تو کھلا لائیں۔''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مومو۔''

''میں نے آپ کو نہیں بھائی کو کہا ہے۔'' کلثوم کے بولنے کی دیر تھی مومنہ تڑخ سے بولی۔

''مومو آپ چلو میں آتا ہوں۔ اویس فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ مومنہ نے اویس کی کلائی پکڑ لی۔

''ہاں چلو۔'' وہ کلثوم سے نظریں چراتا مومنہ کے ساتھ چل پڑا۔ کلثوم کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

''اویس یہ آپ اچھا نہیں کر رہے؟'' رات کو اس نے خفگی سے اویس سے شکایت کی۔

''کیا؟'' اویس سونے کی تیاریوں میں تھا۔

''آپ مومنہ کو مجھ پہ بہت فوقیت دیتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے کلثوم......''

بالکل ایسی ہی بات ہے اویس...... وہ جب سے یہاں آئی ہے میری تو جیسے اس گھر میں اور آپ کی نظروں میں کوئی اہمیت ہی نہیں رہی جب دیکھو مومو، مومو کرتے رہتے ہیں۔ کھانا پینا، گھومنا گھمانا سب مومو کے ساتھ ہو رہا ہے......''

اس وقت اسے ہمارے سہارے کی ضرورت ہے۔'' اویس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''غلط...... اویس بہت غلط کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے اپنی بے وقوفی اور کم عقلی کی وجہ سے کر رہی ہے اس وقت ہمیں بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے اسے سمجھانا چاہیے کہ اس کا گھر ہی اس کے لیے اہم ہے آپ لوگوں کی بے جا محبت اور ہمدردی، اس کی زندگی کو برباد کر کے رکھ دے گی اور ہو سکتا ہے افتخار بیزار ہو کر ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ دے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا......'' اویس کا لہجہ کچھ کمزور سا تھا۔

''ایسا بھی ہو سکتا ہے اویس کوئی مرد کہاں تک عورت کی بے جا ضدیں برداشت کر سکتا ہے۔ مانا کہ افتخار ابھی نیا گھر بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہے مگر یہ بھی تو ہے کہ وہ جو بھی کما رہا ہے بے جا اڑا نہیں رہا ہے اپنی گھر کی عورتوں کے تحفظ کے لیے وہ سب کچھ جمع کر رہا ہے اور یہ صرف ایک دو سال ہی کی تو بات ہے افتخار کی بہنوں کی شادیاں ہوتے ہی وہ گھر بھی تو مومنہ کا ہو جائے گا اور ویسے بھی آپ کو وہ وقت بھولا نہیں ہوگا جب میں بیاہ کر آئی تو اس گھر پر مجھے مومنہ کی اجاداری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میرے دل میں بھی علیحدہ گھر کی ہڑک جاگتی تھی اور تب میں بھی چوری چوری آپ کو اپنے گھر کا کہتی رہتی تھی مگر تب آپ نے میری کوئی بات نہیں سنی تھی کیوں کہ آپ کو بھی اپنی

بہن اور ابو عزیز تھے آپ ان کو کسی بھی صورت کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے تھے انہیں کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جب ہی تو میں سنبھل گئی اور صبر کیا اس گھر کو پالینے کی خاطر آپ کا ساتھ دیا۔ دل سے۔

مومنہ کی شادی ہونے کا انتظار کیا اور پھر جیسے ہی مومنہ کی شادی ہوگئی یہ گھر مجھے اپنا گھر لگنے لگا میری یہاں انسیت بڑھنے لگی، مجھے اسی گھر سے محبت ہونے لگی اب یہی گھر مجھے میری جنت لگتا ہے......'' کلثوم ایک جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی اور باہر کھڑی مومنہ حق دق سی کھڑی تھی کہ اک ذرا سی بات اس کے دماغ میں نہیں آپا رہی تھی کہ عورت کا گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے اور اسے ہی اپنا گھر بنانا ہوتا ہے۔

وہ تو ''صرف'' آج ہی گھر پر چھائی ہوتی ہیں۔ ''کل'' تو ان کا کسی اور کے گھر میں ہوتا ہے اس میں برا ہی کیا ہے جو تھوڑا انتظار کرلیا جائے، آخر کلثوم بھابی نے بھی تو اس کی شادی کا انتظار کیا ہے اور اگر وہ بھی کرلے تو......؟ اور پھر اس کے بعد کا سوچ کر اس کا دل دماغ ہلکا ہوتا چلا گیا۔

جب ہی تو صبح ہی صبح وہ اپنا سوٹ کیس لیے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''ارے مومنہ کدھر...... کدھر جارہی ہو......؟ کلثوم سب کے لیے چائے لیے باہر آئی تو حیرت سے پوچھنے لگی۔

''گھر...... اپنے گھر۔''

''کیا؟؟؟'' سب نے چونک کر اسے دیکھا، وہ سر ہلانے لگی۔

''ہاں مجھے اپنے ہی گھر جانا ہے، جو گھر صرف میرا ہے اور میں نے ہی جاکے اسے بنانا ہے۔ اور شکریہ بھابی رات آپ کی باتوں نے مجھے عقل دی۔''

''کون سی باتیں...... کیا تم نے میری اور اویس کی......؟ کلثوم شرمندہ ہوئی، وہ مسکرائی۔

''ہاں میں نے نہ صرف وہ سب سن لیا ہے بلکہ ان باتوں کو اپنے دل میں بھی اتار لیا ہے جو فارمولہ آپ بتارہی تھیں وہ میری زندگی سنوارنے کے لیے کافی ہے اس کے لب ولہجے میں نہیں انداز میں بھی اک اطمنانیت سی تھی۔ اویس نے مسکرا کر اپنے ابو کو دیکھا جن کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا۔

بھابی کبھی کبھی ایک بہت بڑا لیکچر سر پر سے گزر جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک دو جملے جیسے دل میں اندر اتر جاتے ہیں۔ اس نے ممنون لہجے میں کہتے ہوئے کلثوم کو دیکھا تو کلثوم نے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔

وہ شکریہ کہہ رہی تھی کلثوم نے مسکراتے ہوئے ساتھ لگالیا۔

''تم بہت سمجھدار ہو مومنہ، مجھے امید ہے تم اسی سمجھداری کے بل بوتے پر اب اپنے گھر کو ہی گھر سمجھو گی اسے ہی بناؤں گی، سنوارو گی اور وہیں خود بھی مہکو گی اور اپنے آنگن کو بھی مہکاؤ گی۔

کلثوم کے لہجے میں چھپی محبت کی خوشبو کو مومنہ نے اچھی طرح محسوس کیا اللہ بے شک ہر چیز پر قادر ہے پتا نہیں کیسے کلثوم کی باتوں کو کچھ اس طرح سے روشنی بنا کر مومنہ کے دل میں بکھرے اندھیروں کو دور کردیا کہ ہر سو جیسے خوشیاں سی بکھری محسوس ہونے لگیں تھیں اور اب افتخار مومنہ کی محبت بھری کال ریسیو کرنے کے بعد جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار کسی بھی لمحے گھر پہنچنے والا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

ناولٹ

مہینہ بھر بعد جب چچی گھر لوٹیں تو آفتاب کے پاؤں پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔ ان کا وہ اظہار تشکر اتنا اچانک تھا کہ آفتاب ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے سرعت سے چچی کو اپنے قدموں سے اٹھا کر کھڑا کیا اور بستر پر لٹاتے ہوئے سمجھانے لگا، لیکن چچی اس کے احسانوں پر اتنی......

زندگی کی الجھی ڈور کو سلجھاتا، ایک خاص ناولٹ جس کا انجام آپ کو چونکا دے گا

دل کا عارضہ چچی کو کب لاحق ہوا؟ کوئی نہیں جانتا۔ بس اس دن بیٹھے بٹھائے سینے پر ہاتھ رکھ کر جو

جھکیں تو مانو فرش ہی چھونے لگیں۔ پاس بیٹھی عفت کی دادی نے ہڑبڑا کر تھاما اور گھبرا کر صدائیں دیں تو چچی لڑھک کر تخت سے نیچے جا گریں۔ انہیں کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ آناً فاناً ڈسپنسری کا ڈاکٹر بلایا گیا جو آتے ہی ان کا مرض بھانپ گیا اور کسی پیشہ ور ڈاکٹر کے کورے سے لہجے میں بولا۔ ''خاتون کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ انہیں کسی بڑے اسپتال میں جلد از جلد داخل کروادیں۔''

محلے بھر میں یہ خبر بجلی بن کر گری، چچی اور دل کا دورہ...... بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ تو بڑے حوصلے والی عورت تھی اور باحوصلہ لوگ بھلا دل چھوڑا ہی کب کرتے ہیں۔ لیکن انہونی ہوگئی تھی۔ چچی کے دل نے مزید رنج وغم سہنے سے انکار کر دیا تھا اور اتنا اچانک کیا تھا کہ سب سکتے میں تھے۔

یہ کوئی آج کی بات نہ تھی، محلے میں بسنے والا ہر فرد، چچی کے دکھ سکھ میں شامل رہا کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس محلے کی سب سے پرانی مکین تھیں۔

جانے کب ان تین کمروں والے گھر میں آکر آباد ہوگئی تھیں۔ انہوں نے سراج چچا کی ہمراہی میں وہاں بہت سے خوشیوں بھرے دن گزارے تھے اور اب بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کر زندگی کے باقی ایام گزار رہی تھیں۔ اسی گھر کی دہلیز پر جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر، بڑی کٹھنائیوں سے طے کیا تھا اور اب تلک زندگی کی سختی کو خوش اسلوبی سے جھیل رہی تھیں۔

ان کے شوہر، سراج، پولیس کے محکمے میں عام سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ محنتی اور قابل انسان تھے، اور اسی قابلیت کے طفیل سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی پاچکے تھے۔ اپنی کم گوئی اور بردبار طبیعت کی بنا پر ان کا اپنے ڈپارٹمنٹ میں بڑا رعب و دبدبہ تھا اور وہ رعب داب چچی پر بھی تسلط جمائے رکھتا تھا۔ وہ شوہر کے سامنے یوں مؤدب رہتیں جیسے ان کے ماتحت کام کرنے والا کوئی ادنیٰ سپاہی......

چچا سراج، چچی سے بے حد محبت کرتے تھے ان کی وہ محبت آپس کے احترام وعزت کو بھی بڑھائے رکھتی تھی۔ چچا سراج بیوی کی ہر حاجت وضرورت کا خیال رکھتے اور انہیں ایک پُرآسائش زندگی دینے کے خواہشمند تھے لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ ملازمت کے چند سال بعد ہی مجرموں کے خلاف ایک پولیس مقابلے میں، کسی انجانی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ حکومت نے ان کی اس ناگہانی موت کو وطن دوست سپاہی کی موت قرار دیا اور جرم کے خلاف جہاد کرنے کے صلے میں میڈل سے بھی نوازا تھا، ساتھ کچھ نقد رقم، بطور امداد، بیوہ کے حوالے کی جو اُن دنوں اپنے معذور بچے کے ساتھ بے یارو مددگار زندگی جینے پر مجبور ہوگئی تھی۔''

چچی کی زندگی کا ایک تاریک پہلو ان کے بیٹے واجد کی پیدائش بھی تھا۔ وہ ایک معذور بچہ تھا، جس نے دنیا میں آکر والدین کی تمام خواہشات اور خوشیوں کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ دونوں اولاد کے تمنائی تھے، پر اللہ ان کی آزمائش لینے پر آمادہ تھا۔

شادی کے بعد سات سال انہوں نے اولاد کے حصول کے سلسلے میں ٹونے ٹوٹکے کرتے گزارے تھے۔ پھر طویل انتظار کے بعد جب چچی کو اپنی سونی گود بھرنے کے آثار نظر آئے تو وہ جیسے خوشی سے دیوانی ہوگئیں۔ اللہ کو بالآخر اُن پر رحم آہی گیا تھا، سو دونوں میاں بیوی آنے والے وقت کے خوش آئند تصور میں گم رہنے لگے۔ اولاد کی عظیم نعمت سے بڑھ کر انہیں اللہ سے اور بھلا کیا چاہیے تھا۔ ان کی اداس اور تنہا زندگی میں صرف یہی ایک کمی تھی جو اب پوری ہونے جارہی تھی۔

چچا سراج کی خوشی کا رنگ ڈھنگ ہی نرالا تھا۔

وہ آنے والے بچے کے لیے ابھی سے ہی تیاری و خریداری کرنے لگے تھے۔ انہوں نے صرف چند دنوں میں کھلونوں اور کپڑوں سے الماری بھر ڈالی تھی۔

کہتے ہیں مرد کو اپنی نسل کو پروان چڑھتا دیکھنے کی خوشی سب سے زیادہ ہوتی ہے اور پھر وہاں تو سات سال بعد امید بندھی تھی سو سراج چچا کے ہونٹوں پر ہمہ وقت مسکراہٹوں کے دیپ جلتے اور وہ من ہی من میں بیٹے کی چاہ میں دن گننے لگے تھے۔ اب وہ چچی کا بے حد خیال رکھتے، انہیں غذا سے لے کر پُرسکون نیند تک چچی کا بے حد دھیان رہتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا وارث صحت مند اور خوبصورت پیدا ہو۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب واجد میاں کو دنیا میں آنا تھا۔ دائی ماں کو گھر پر ہی بلوا لیا گیا تھا۔ اس نے کئی گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے بعد تھک ہار کر چچا کو ڈاکٹرنی بلا لانے کا کہا کیونکہ چچی کی حالت غیر تھی۔ کیس پیچیدگی اختیار کر گیا تھا۔ سراج چچا بے حساب گھبرائے انہوں نے ڈاکٹر بلانے کے بجائے بیوی کو اسپتال لے جانا مناسب سمجھا، جہاں فوری آپریشن کے بعد واجد پیدا ہوا۔ وہ بڑے سر اور لاغر و منحنی وجود کا حامل ایک عجیب الخلقت بچہ تھا جو آنکھ، ناک، کان رکھنے کے باوجود عام انسان سے بہت مختلف تھا۔ اس کے ہونٹ بھدے اور موٹے تھے، آنکھیں بناوٹ میں قدرے ٹیڑھی اور بھینگا پن لیے ہوئے تھیں، ناک دبی ہوئی اور دائیں بائیں کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی جبکہ بازو چھوٹے اور ٹانگیں کچھ زیادہ لمبی تھیں۔ رہی سہی کسر ان بالوں نے پوری کر دی تھی جن سے بچے کا پورا بدن ڈھکا ہوا اور سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اس پر معصومیت سے انگوٹھا چوسنے کی ادا دیکھنے والوں پر خوف ساطاری کر دیتی تھی۔

وہ بچہ مکمل طور پر ایب نارمل اور بے چارگی کی تصویر تھا۔ ایسے بچے کو پالنا اور زندگی کی دوڑ میں شامل کرنا ناممکن تھا۔ واجد جیسا بدشکل وجود اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی خود کو سنبھالنے سے قاصر تھا۔ وہ بچہ آنے والے وقت میں ناصرف مسائل میں اضافے کا سبب بنتا بلکہ لوگوں کے درمیان عبرت کا سامان بن کر رہ جاتا۔ دنیا یقیناً اس کے وجود سے خوف کھاتی اور یہی خوف بھری نظریں اور تبصرہ کرتی زبانیں بچے کے والدین کا کلیجہ چھلنی کرنے کا سبب بھی بنتیں۔ وہ ان حالات کا سامنا نہ کر پاتے اور ذہنی اذیت کا شکار ہو جانے والے تھے۔

اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر نے سراج چچا کو اپنے کمرے میں بلوا کر ساری صورتِ حال سمجھائی اور آنے والے وقت کی نزاکت کا احساس دلا کر اس امر پر مجبور کیا کہ بچے کو موت کا انجکشن دے کر اس دنیا سے نجات کا اجازت نامہ سائن کر دیں کیونکہ ان کا بچہ زندگی جیسے کے لائق نہیں تھا۔''

ڈاکٹر کے منہ سے اتنی سفاکانہ باتیں سن کر سراج چچا کی روح کانپ اٹھی۔ بنیادی طور پر وہ ایک دین دار آدمی تھے۔ اللہ کے کام میں ایسی دخل اندازی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ پھر جو بچہ قدرت کی دی ہوئی مہلت پوری کر کے جیتا جاگتا اس دنیا میں آیا تھا اسے ایک موت بھرے انجکشن سے واپس کیسے بھیج سکتے تھے؟ وہ جیسا بھی تھا، اب اُن کی اولاد اور ان کا نصیب تھا، پھر وہ اُسے کیسے ٹھکراتے۔؟

انہوں نے ڈاکٹر کی تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بچے کو پالیں گے اور علاج بھی کرائیں گے۔ ڈاکٹرز کے بورڈ نے انہیں سمجھانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی اور صاف الفاظ

میں بتایا کہ ایسے پیدائشی معذور کا علاج بے سود رہے گا۔ کیونکہ بچہ جسمانی ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی مکمل طور پر اپاہج تھا اور آئندہ زندگی میں بھی اس کے صحت مند ہونے کا چانس زیرو فی صد تھا۔ ایسی زندگی کو کانٹوں پر گھسیٹنا عقل مندی نہیں تھا۔ اللہ نے گوشت کے ایک بے ترتیب لوتھڑے میں جان ڈال دی تھی لیکن دنیا میں اسے زندہ رکھ کر تماشا بنانا کسی طور مناسب نہ تھا کجا یہ کہ پالا پوسا بھی جاتا۔

ڈاکٹرز کے مجبور کرنے پر بھی چچا رضا مند نہ ہوئے۔ انہوں نے بیوی سے مشورہ کرنے کی اجازت مانگ لی۔ وہ جانتے تھے ان کی بیوی سات سال بعد ملنے والی اس اولادِ نرینہ کے لیے از حد جذباتی تھی۔ نو ماہ اپنی کوکھ میں پلتے وجود کو محسوس کر کے آنے والے خوش آئند وقت کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اس نے وہ دن گن گن کر کاٹے تھے۔ آپریشن کے بعد ہوش میں آنے پر چچی کو بیٹا ہونے کی خوشخبری سنا دی گئی تھی لیکن یہ نہ بتایا گیا تھا کہ بچہ عجوبہ روزگار تھا۔

صورتِ حال بے حد حیرت انگیز اور دل شکن تھی۔ سراج چچا کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے بیوی کو اعتماد میں لینا چاہتے تھے۔ چچا کی ضد پر ڈاکٹرز نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ حیران تھے کہ آخر سامنے کی بات اس شخص کو پلے کیوں نہ پڑ رہی تھی۔ وہ ایک معذور اور عجیب مخلوق کو زندگی دینے پر بضد کیوں تھا؟ لیکن ڈاکٹرز یہ ہرگز نہ جانتے تھے کہ اولاد کا ہونا، نہ ہونے کے غم کو ختم کر کے ایک بے اولاد شخص کو جو سکون دیتا ہے وہ سکون دنیا کی دولت اور ہر آسائش سے بڑھ کر انمول ہوتا ہے۔

شاید سراج چچا بھی اس انمول احساس کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ بچہ بے ترتیب لوتھڑا سہی، مگر ایک خوش کن احساس ضرور تھا۔ اس نے اپنی آمد سے ان کے دل کی دھڑکن کو باپ بننے کی نوید سنا کر بے ترتیب ضرور کیا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد اس کی معصوم سی روتی بلکتی آواز نے کانوں میں جلترنگ کے جو سُر اتارے تھے وہ روح کو بہت اندر تک سرشار کر گئے تھے اور وہی سرشاری انہیں اس کے قتل سے روک رہی تھی۔

چچا سراج صدیوں کی تھکن لیے بیوی کے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے بڑے سبھاؤ سے انہیں اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی لیکن چچی کے اوسان خطا ہو گئے۔ بچے کی حقیقت جان کر وہ جیسے سکتے کی کیفیت کا شکار ہو گئیں۔ ان کے سندر سپنے اتنی بھیانک تعبیر لائیں گے!؟ ایسا انہوں نے سوچا تک نہ تھا۔ وہ دل تھام کر رہ گئیں۔ آنکھیں اشکوں سے دھندلا گئیں اور لب پر فریاد مچل اٹھی۔

''خدایا، ہم سے یہ کیسا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا میں تُو نے ہمیں یہ بچہ عطا کیا۔ اس سے بہتر بے اولادی کا دکھ تھا۔ کم از کم میں دکھیاری کسی کنارے پر تو تھی۔ اب میری سونی گود بھر کے کیا پھر اجاڑے گا میرے اللہ، کیا یہ ظلم نہ ہو گا؟ کیا میں اس بچے کے بغیر رہ سکوں گی۔ جسے میں نے سات سال کی منت مرادوں کے بعد پایا۔ وہ بچہ جس کے لیے ہر لمحہ خواب دیکھے، وہ عجوبہ روزگار ہے تو کیا ہوا...... وہ ہے تو میرا، میری روح، میرے جسم کا ٹکڑا۔ پھر اسے کیسے مار ڈالوں...... کیسے ماروں یا اللہ......''

''نہیں''...... وہ چیخ اٹھیں۔ نہیں سراج صاحب، میرے بچے کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا، وہ جیسا بھی ہے ہمارا ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے، اسے تحفظ دیں گے، اگر میرے اللہ نے اسے زندہ پیدا کیا ہے تو اسے زندہ رہنا چاہیے...... ہم کون ہیں ایک زندہ روح کو موت کا پیام دینے والے...... ارے یہ صرف اس کا کام ہے، وہ جب تک چاہے گا،

اسے زندہ رکھے گا۔ ڈاکٹرز کو سمجھایئے سراج صاحب! کیا والدین اپنی ہی اولاد کا خون کر سکتے ہیں......؟ نہیں، انہیں بتایئے دنیا میں آنے والا ہر انسان کسی نہ کسی مقصد کے تحت پیدا کیا جاتا ہے اور اپنے مقصد کے پورا ہونے تک اسے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ اپنے فرض کی انجام دہی کے بعد ہی اسے دنیا سے رخصت ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ کیا ہوا اگر میرا بچہ عام بچوں سے مختلف ہے، ارے وہ زندہ ہے تو یہ خدا کی مرضی ہے، وہ کب تک سانس لے گا...... یہ بھی اللہ کی مرضی ہے۔ اس کی موت کا ذمہ دار صرف اللہ ہے۔ جب وہ اسے موت دینا چاہے گا، دے دے گا پھر ہم ڈاکٹرز کی بات کیوں مانیں......؟

''نہیں سراج صاحب! ہم اپنے بچے کو موت کا ٹیکہ نہیں لگوائیں گے۔ یہ گناہ ہے...... گناہِ عظیم ہے......'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں، ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا، سو سراج چچا نے بیوی کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔

یوں واجد میاں، والدین کی محبت میں پرورش پانے لگے تھے۔ چچی نے دن رات ایک کر دیا۔ اپنی ساری توانائی اور مہربانیاں نچھاور کر دیں، وہ واجد جیسے ناکارہ وجود کو یوں سنبھالتیں، جیسے کسی بیش بہا خزانے کو سنبھالا جاتا ہے۔ واجد اُن کی عمر بھر کی پونجی تھا۔ کیا تھا اگر دنیا کی نظر میں بے مول تھا۔ ان کے لیے وہ ہر چیز سے بڑھ کر تھا کیونکہ وہ انہیں ''بے اولادی'' کی تہمت سے دور لے گیا تھا۔

لیکن حقیقت جھٹلانے والی چیز نہ تھی۔ یہ سچ تھا واجد ذہنی اور جسمانی معذور اور خوفناک وجود کا حامل تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک تماشے کے طور دیکھا کرتے تھے، دور کھڑے رہ کر وہ چچی کی ہمت و محنت کو داد دیتے، پاس جانے میں خوف مانع تھا جو کسی عفریت کو دیکھ کر دل میں ایک کراہیت کے ساتھ ابلتا تھا حالانکہ چچی اسی ڈراؤنے وجود کو بڑی محبت سے بانہوں میں سمیٹا کرتی تھیں۔ ان کی محبت کا انداز سچ مچ حیرت انگیز تھا۔ چچی واجد کو نہلاتی دھلاتی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھیں، یہ ان کی محنت توجہ و لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ واجد ہنوز زندہ اور صحت مند تھا، وہ اپنی ماں کو خوب پہچانتا تھا۔ چچی کی صورت دیکھتے ہی قلقاریاں مارنے لگتا لیکن وہ قلقاریاں باریک آواز میں گونجتی چیخوں کی صورت در و دیوار ہلانے لگتیں، وہ ہنستا یا روتا تو سننے والے کانوں میں انگلی ڈال لیا کرتے کہ اس کی آواز کان کے پردے کو نیزے کی اَنی بن کر چبھتی محسوس ہوتی تھی۔

چچی اپنے بچے میں اس طرح مگن ہوتیں جیسے وہ ایک خوبصورت تندرست بچہ ہو۔ جانے ممتا کا وہ کون سا روپ تھا کہ انہیں واجد کا بالوں بھرا بھیانک وجود بھی گلاب کے پھول سا نوخیز اور خوبصورت لگتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ چچی ہار مانے بنا واجد کو پالتی پوستی رہیں اور یوں پندرہ سال کی طویل مدت گزر گئی۔ پندرہ سال بعد بھی واجد ایک ڈھیلا ڈھالا لٹکا ہوا وجود تھا۔ لمبی ٹانگیں بے جان اور سوکھی لکڑی جیسی سخت تھیں۔ ان اکڑی ٹانگوں پر چھوٹا موٹا سا دھڑ بے حد عجیب لگتا۔ بدن پر اگتا کالا رُواں اسے جانور ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتا، پھر بھی وہ لولے اور مرگھلے وجود کی طرح کبھی اپنے بستر اور کبھی کرسی پر ڈھلکا رہتا۔ ایسے میں اس کا بڑا سا بے ہنگم سر شانوں پر گرا ہوتا اور موٹے بھدے ہونٹوں سے بہتی رال دیکھنے والے کو ابکائی لینے پر مجبور کرتی تھی۔ واجد قد میں خاصا اونچا ہو گیا تھا۔ اس کا لاغر وجود چچی کے سامنے سر اٹھاتا دکھائی دیتا لیکن وہ عورت صبر و ایثار کی مورت بنی بیٹے کی خدمت کیے جا رہی تھی اور واجد ماں کی ساری توانائی جیسے اپنے اندر جذب

کر رہا تھا۔

☆.......☆.......☆

گزرتے وقت نے چچی کو بوڑھا اور کمزور بنا ڈالا تھا۔ ایسے میں سراج چچا کی ناگہانی موت نے غم کا ایسا پہاڑ توڑا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھوکھلی ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی مشکلوں سے عبارت تھی۔ شوہر کی معمولی سی پینشن میں گزر اوقات ممکن نہ رہی تو چچی نے سلائی مشین سنبھال لی اور محلے بھر کے کپڑے سینے لگیں۔ حالانکہ واجد جیسے معذور کو سنبھالنا کل وقتی کام تھا۔ وہ پندرہ سال کا ہو کر بھی کسی نومولود سے کم نہ تھا۔ چچی کی زندگی حوادث کا شکار تھی پھر بھی وہ زندگی کی گاڑی کو دھکیلے جا رہی تھیں۔

اس دن وہ زینت کا کُرتا پورا کر کے واجد کو کھانا کھلانے بیٹھیں تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، چکرا کر گریں اور سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ شدت کی ضرب نے لہو کو بہنے کا بہانہ دے دیا۔ ایسے میں اچانک آفتاب اُدھر چلا آیا تھا۔ وہ بھی اسی محلے کا رہائشی تھا اور چچی کی بہت عزت کرتا تھا۔ چھوٹی بہن کا جوڑا جلدی سی دینے کا سندیسہ لانے والا آفتاب انہیں زخمی دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر چچی کو سنبھالا تو اچانک واجد آفتاب پر پل پڑا۔ وہ بچہ جو ہمہ وقت ساکت اور بے جان مورت کی طرح پڑا رہتا تھا، آج نہ جانے کس احساس کے تحت اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے کمزور بازوؤں میں آفتاب کی گردن جکڑ لی تھی۔

حملہ بے حد اچانک تھا۔ آفتاب بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے واجد کے مڑے تڑے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس بار وہ آفتاب کی گردن میں بالوں بھری بانہوں کا گھیرا مزید تنگ کر چکا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آفتاب اس کی ماں کو شاید کوئی نقصان پہنچانے کی سعی کر رہا تھا۔ ایسے میں واجد کی نفرت کا انداز حد سے تجاوز کر رہا تھا اور وہ اظہار آفتاب کی گردن توڑنے کے در پر تھا۔

خوف اور گھبراہٹ آفتاب کے سر پر سوار ہو گئے۔ لمحہ بھر کو اسے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ پھر جانے کس احساس کے تحت اس نے خود کو سنبھالا اور پوری قوت سے واجد کی سوکھی بانہوں کا گھیرا توڑ کر اس کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ کوشش خاصی مہنگی ثابت ہوئی۔ واجد ایک جھٹکے سے اچھل کر کرسی سے فرش پر گرا اور بُری طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آہیں کراہیں پل بھر میں جیسے آسمان چھونے لگیں تھیں۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ اسے تڑپتا پا کر چچی نے اپنی دریدہ حالت کو پس پشت ڈالا اور تیزی سے اٹھ کر واجد کو سنبھالنے لگیں، جو کسی زخمی پرندے کی طرح اچھل رہا تھا، کو در رہا تھا۔

آفتاب اس افتاد پر اب تلک پریشان و ہراساں کھڑا تھا جب چچی کی باآواز بلند رونے کی صدا کانوں میں پڑی تو گھبرا کر آگے بڑھ آیا اور بوکھلاہٹ سے بولا۔

''کک...... کیا ہوا چچی، آپ کیوں رونے لگیں......؟ پلیز...... دیکھیے میں نے اسے دھکا نہیں دیا، صرف خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن لیکن لگتا ہے شاید وہ......وہ مر رہا ہے۔''

''ارے تیرے منہ میں خاک نامراد! میرے بچے کے لیے کیسی بدفالیں بول رہا ہے۔ مریں اس کے دشمن۔'' چچی نے بلک کر آفتاب کو کوسا اور پھر سینے پر دوہتڑ مار کر رونے لگیں۔ آفتاب کے حواس مزید اڑ گئے، وہ کچھ اور قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

''آخر آپ...... چچی آپ رو کیوں رہی ہیں......؟''

''ارے تو کیا روؤں بھی نہیں...... دیکھ تو کیسے

دہرا ہوتا جا رہا ہے میرا بچہ، نہ جانے کہاں چوٹ پڑی ہے بے چارے کو جو اس سے سہی نہیں جا رہی۔''
انہوں نے واجد کا لٹکا وجود اس کے آگے کیا تو آفتاب خوف سے یکدم پرے کھسک گیا۔
''مم...... میں کیسے دیکھوں چچی؟ واجد...... بہت خوفناک ہے، مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔''
''آئے ہائے...... چچی نے ممتاز کے غلبے سے چور ہو کر واجد کو سینے میں بھینچ لیا۔ ایسا نہ کہو آفتاب! کم سے کم ایک ماں کا دل تو نہ توڑو۔''
''نہیں، میرا وہ مطلب نہیں تھا چچی...... میں، میں کیا کروں، دراصل مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ جیسے اپنی صفائی دینے کی کوشش میں تھا......
''ہائے میرے اللہ، کیسے تڑپ رہا ہے بے چارہ، ضرور میرے بچے کو کوئی گہری چوٹ لگی ہے۔''
وہ بے قراری سے واجد کا بدن ٹٹولنے لگیں جواب بھی ایک سانس میں ہائے ہائے کیے جا رہا تھا۔ بولنا اس کو آتا نہ تھا، بس حلق سے آوازیں نکالے جا رہا تھا اور وہ آوازیں اتنی بے ربط اور دلدوز تھیں کہ کانوں کو ناگواری کا احساس دینے کے باوجود سیدھی دل میں اتر رہی تھیں۔
''ارے صبر کر میرے بچے...... ذرا سا صبر کر لے، پہلے دیکھ تو لوں تجھے کہاں چوٹ لگی ہے......'' چچی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے جیسے واجد کو تسلی دی۔ لیکن وہ چلائے جا رہا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت ڈھلک رہے تھے۔
''چچی، بہتر یہی ہے ہم اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں......'' آفتاب نے خود کو سنبھال کر اس بار کوئی معقول بات کہی تھی۔
''نہیں...... ڈاکٹر کیا کرے گا موا؟ وہ آپ ڈر کے واجد سے دس قدم دور کھڑا ہو جائے گا، علاج کہاں کرے گا، میں آپ ہی دیکھ لوں گی اپنے بچے کو۔ پتا نہیں ایسا کیا ہوا ہے جو آج اس قدر واویلا مچائے ہوئے ہے۔ ان کی پریشانی چہرے سے عیاں تھی۔
وہ واجد کے بالوں بھرے بدن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ جلد ہی انہیں اس سوجن کا احساس ہو گیا جو اس کی پسلیوں پر ابھار کی صورت نمودار ہو چکی تھی۔ آفتاب کے دھکیلنے پر واجد الٹ کر کرسی کے ہتھے پر گرا تھا۔ غالباً وہیں سے اس کی پسلیوں پر گہری چوٹ آئی تھی اور وہی چوٹ اسے بے اوسان کر رہی تھی۔ چچی نے بہ مشکل اسے ٹھنڈا کیا اور واجد کے شانت ہوتے ہی چوٹ پر ہلکی سی سکائی کر کے دوا لگا دی۔ پھر کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگا کر تھپکتی رہیں۔ اب اسے قرار تھا لیکن وہ ماں سے جدا ہونے پر قطعاً آمادہ نہ تھا۔ سو چچی بدستور اس کا سر گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ واجد کسی شیر خوار بچے کی طرح انگوٹھا منہ میں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ہی مرکز پر نگاہ ٹکائے پڑا تھا۔
آفتاب کے دل میں پہلی بار ہمدردی اور رحم کے جذبات جاگے تھے۔ دل ترحم سے بھرا تو آنکھیں خودبخود نم ہو گئی تھیں۔ کتنا قابلِ رحم تھا واجد اور اس سے کہیں زیادہ اس کی بوڑھی ماں، جو دن میں جانے کتنی بار اس کی خاطر خود کو اذیت کے سمندر سے گزارتی تھی۔ وہ خود بھی زخمی تھی...... چکرا کر جو گری تھیں تو دیوار لگنے سے سر پھوٹ گیا تھا۔ آفتاب نے دیکھا ان کے ماتھے پر خون نکل کر اب کالی لکیر کی صورت جم گیا تھا۔ وہ اپنی حالت بھلا کر کیسے اپنے بچے کی فکر میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ واجد اتنا بڑا ہو جانے کے باوجود اب بھی خود کو سنبھالنے سے قاصر تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ماں کی آزمائش بھی بنتا جا رہا تھا۔

آفتاب خاموشی سے پلٹ گیا۔ روئی اور دوا خرید کر لایا۔ اس نے چچی کا زخم صاف کر کے دوا لگائی اور انہیں واجد کے سوجانے کا احساس دلا کر آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے گھر چلا آیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے چچی کی زندگی کی مشکلات کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ ایک ادھورے اور ذہنی پس ماندہ انسان کے ساتھ زندگی کو کس انداز میں جینے پر مجبور تھیں، کیسی مشقت بھری دکھی زندگی تھی ان کی۔ کڑی دھوپ کی تمازت اور بدلتے حالات و وقت کی تندی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ شوہر کا ساتھ کیا چھوٹا، زندگی بوجھ بن کر رہ گئی تھی ان کی بھی اور واجد کی بھی۔ سو تنہا زندگی کا اذیت ناک دکھ واجد کے ادھورے اور ناکارہ وجود سے جڑا تھا جہاں نہ خوشی کی امید تھی اور نہ ہی بہتر اور محفوظ مستقبل کی۔

☆......☆......☆

اب آفتاب کی سوچوں کا محور، چچی اور ان کی بے کس تنہائی کے گرد گھومنے لگا تھا۔ یہ احساس اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ تھا یا آفتاب کی اپنی ہمدردانہ فطرت کا نتیجہ تھا کہ وہ چچی کی مدد کرنے کی بابت غور کرنے لگا تھا۔

اس نے سوچا کہ لوگ غریب اور نادار لوگوں کی کفالت کرتے ہیں، ان کے دکھ دور کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کرتے ہیں چیریٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ ویلفیئر ٹرسٹ چلاتے ہیں اور اللہ کی نظر میں سرخروئی حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ بھی کیوں نہ ایسی ہی سرخروئی حاصل کرے۔ کسی کی امداد کرنا، بالخصوص اس عورت کی جو واقعی مستحق اور نادار ہو۔ کیا اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوگا۔؟

آفتاب کا دل ہر بار اثبات میں جواب دے رہا تھا، سو اس نے ٹھان لی کہ اب وہ چچی کی ہر ممکن مدد کرے گا اور انہیں اپنی ذات سے تحفظ کا نرم احساس فراہم کرے گا۔ یہ سوچ آفتاب کی زندگی کا رخ بدل گئی تھی۔

اب وہ اکثر چچی کے گھر پر نظر آیا کرتا تھا۔ ان کے چھوٹے موٹے کام سے لے کر ہر اس معاملے کو دیکھنے بھالنے لگا تھا، جو چچی کے لیے کسی مشکل کا باعث ہوتا۔ اللہ کو رحم آ گیا تھا جب ہی تو آفتاب ایک فرشتہ بن کر چچی کے بگڑے حالات سدھارنے چلا آیا تھا۔ وہ ان کے حالات دل کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کی اذیت محسوس کرتے ہوئے عملی مدد کا مظاہرہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ابتدا میں محلے والوں نے آفتاب پر انگلی اٹھائی، بے جا تنقید بھی کی۔ واجد کے خوفناک وجود سے دہلانے کی کوشش کی لیکن آفتاب کی ثابت قدمی دیکھ کر بالآخر اپنی اپنی راہ ہو لیے تھے۔

آفتاب خود بھی دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان تھا۔ والدین کا سایا بچپن میں ہی سر سے اٹھ چکا تھا۔ مارے باندھے تھوڑی تعلیم حاصل کی اور محنت مزدوری کرنے لگا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو گاڑیوں کی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام سیکھ لیا اور ایک بڑے ورکشاپ میں ملازمت حاصل کر لی۔ یوں حالات بدلے اور آفتاب کو دیگر مالی مسائل سے چھٹکارا مل گیا۔ وہ شروع ہی سے خودمختار انسان تھا۔ اپنی مدد آپ کرنے والا۔

ایک چھوٹی بہن تھی۔ جس کی شادی پچھلے برس خالہ کے بیٹے سے بخیر و خوبی انجام پا گئی تھی۔ ورکشاپ سے آفتاب کو اچھی تنخواہ ملتی تھی سو گزر بسر سہولت سے ہو رہی تھی۔ بھائی کی تنہا زندگی دیکھ کر بہن، آفتاب کے سر پر سہرے کے پھول سجانا چاہتی تھی۔ اس کے اصرار پر آفتاب نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن اب اس کے دل میں چچی اور

واجد کا خیال جاگزیں ہوگیا تھا، سو خدمت کرنے کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ اس نے اپنی ذات ہی بھلا ڈالی تھی۔

صبح کام پر جانے سے پہلے وہ چچی سے ملنا نہ بھولتا۔ ان کے کئی چھوٹے موٹے کام کرتا۔ دن بھر کا سودا سلف لا دیتا...... کوئی اور مشکل درپیش ہوتی تو پورے دل اور خلوص سے حل کرتا اور واپسی پر گھر آ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد رات گئے تک چچی کے گھر پر رہتا اور کسی ذمہ دار بیٹے کی طرح ان کا ہاتھ بٹایا کرتا۔ چچی اس کے ایثار پر صدقے واری جاتیں اور آنچل پھیلا کر نم آنکھوں کے ساتھ اس کی خیر مانگتی تھیں۔ کامیاب اور سکھی زندگی گزارنے کی دعا دیتے نہ تھکتی تھیں۔ بے شک اللہ کے بعد آفتاب کا سہارا بڑھاپے کی اس کٹھن زندگی میں از حد اہمیت کا حامل تھا۔

☆......☆......☆

ان ہی دنوں ورکشاپ کے مالک سیٹھ باقر کے والد کا انتقال ہوگیا۔ سوگ کے لیے دو دن تک ورکشاپ بند کردی گئی تھی۔ یہ دو دن آفتاب کے لیے فراغت لے آئے تھے سو اس نے سوچا وہ فرصت کا فائدہ اٹھا کر بہن سے ملنے اس کی سسرال جائے گا۔ راشدہ بیاہ کر حیدرآباد چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے چچی کو مطلع کرنا ضروری تھا، سو وہ اطلاع دینے ان کے گھر چلا آیا تھا۔

اس دن چچی بے حد مصروف تھیں۔ وہ باہر برآمدے کے کچے حصے میں نل کے سامنے واجد کو کرسی پر بٹھائے نہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ واجد نہانے کے موڈ میں نہ تھا شاید اسی لیے زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلتی پُرشور، بے ربط آوازیں گھر کی فضا کو بے سکون کر رہی تھیں اور اس کے سوکھے چمڑے سے ہاتھ ماں کو نہلانے سے حتیٰ الامکان روک رہے تھے۔ وہ جونہی ڈول بھر کر پانی واجد پر ڈالنے کی کوشش کرتیں...... واجد کے ہاتھ حرکت میں آتے اور ڈول الٹنے سے سارا پانی اطراف میں گر جاتا۔ وہ کرسی پر برہنہ حالت میں گرنے کے انداز میں پڑا تھا۔ اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ واجد کو بے ترتیب انداز میں یوں کرسی پر ہاتھ پاؤں مارتا دیکھ کر آفتاب کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ یہ احساس کہ ایک برہنہ نوجوان بکھری حالت کے ساتھ چچی کے سامنے موجود ہے، اسے اچھا خاصا نروس کر گیا تھا۔

''آپ یہ کیا کر رہی ہیں چچی؟'' آفتاب نے آگے ہو کر پانی سے بھرا ڈول ان کے ہاتھ سے لیا تھا۔

''ارے کیا کروں گی میں قسمت کی ماری۔ بس اللہ کی دی ہوئی ذمہ داری نبھانے کی کوشش میں ہوں۔ دیکھ آفتاب بیٹا، آج جانے کتنے دن بعد واجد کو نہلانے کا سوچا ہے مگر یہ لڑکا اب بھی نہانے پر راضی نہیں۔ بے وجہ ضد کیے جا رہا ہے، سمجھ نہیں آتی اب کیا ہوگیا ہے اس کو......؟'' وہ جیسے بےزار کھڑی تھیں، آفتاب کی سرسری نظر ایک بار پھر واجد کے برہنہ وجود پر منڈلانے لگی وہ خود کو فراموش کیے صرف ماں کا چہرہ گھور رہا تھا۔

''اگر وہ نہانا نہیں چاہتا چچی تو رہنے دیجیے نا۔ آپ کو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟''

''ارے ضرورت تو ہے بیٹا، نہلاؤں گی نہیں تو واجد کے جسم سے بو آنے لگے گی اور آج بہت دن ہوگئے ہیں اسے غسل کیے ہوئے...... لیکن دیکھو نا، آج اس کا ارادہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ مان کے نہیں دے رہا۔'' ''چچی...... پھر نہلانے کا فائدہ......؟''

''ہاں مان تو واقع نہیں رہا...... لیکن کچھ تو کرنا پڑے گا آفتاب......'' چچی اب فکرمند نظر آ رہی تھیں

آفتاب نے بہ غور انہیں دیکھا۔ پھر بولا ''چچی، واجد اب بڑا ہوگیا ہے کیا آپ کو بُرا نہیں لگتا اسے یوں نہلانا......؟''

''ارے بیٹا، بُرا کیا لگے گا، میرا بیٹا ہے وہ۔ بھلا ماں سے بچے کا کیسا پردہ......؟'' چچی نے ہنس کر انجانے میں جیسے آفتاب کے ذہن پر چھائے غبار کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید الجھ گیا۔ پھر بھی چچی، واجد اب بچہ نہیں رہا، اس طرح برہنہ حالت میں کھلے بدن آپ کا اسے نہلانا۔''

''ارے پاگل ہوگیا ہے آفتاب!'' چچی نے عجلت سے اس کی بات قطع کی۔ ''اب وہ بڑا ہوگیا ہے تو کیا ہوا، میرے لیے واجد ابھی بھی ایک ننھا بچہ ہی ہے، وہ اگر خود نہانے کے قابل ہوتا تو کیا میرے سامنے اس طرح بے لباس پڑا ہوتا۔ وہ مجبور ہے بیٹا، اسے کیا خبر ماں کے سامنے ایسی حالت میں آنا ہے یا نہیں۔''

چچی کی آنکھیں بھر آئیں، آفتاب کے دل کو کچھ ہوا تھا وہ گم سم سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''دیکھ آفتاب! واجد میری ذمہ داری ہے۔''

چچی نے اس کی خاموشی محسوس کر کے جیسے ایک بار پھر آفتاب کو سمجھایا۔ ''میں اسے صاف ستھرا نہ رکھوں گی تو اور کون رکھے گا؟ اگر وہ نہائے گا نہیں تو اس کا جسم گل سڑ جائے گا۔ تم جانتے ہو نا اس کے بدن پر بالوں کی بہتات ہے سو پسینہ بھی خوب آتا ہے۔ اس لیے واجد کو صاف ستھرا رکھنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے، اگر میں خیال نہ کروں گی تو وہ بے چارہ بیمار ہو جائے گا اور اگر واجد بیمار پڑ گیا تو بتاؤ کون سنبھالتا پھرے گا اُسے۔ اب مجھ بڑھیا سے اتنا کام نہیں ہوتا نا۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں چچی، یہ سب کچھ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔'' آفتاب منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا، ادھر چچی خاموشی سے اپنی ڈبڈبائی آنکھیں پونچھنے لگیں، پھر آفتاب کے ہاتھ سے ڈول لیتے ہوئے بولیں۔ ''لاؤ یہ مجھے دے دو، میں اسے نہلا کر فارغ ہو جاؤں، جب تک تم اندر کمرے میں بیٹھو پھر میں تمہیں بہت سے کام بتاؤں گی جو آج ہی نمٹانے ہوں گے۔''

''آپ بے فکر رہیے۔ کام بھی ہوتا رہے گا چچی لیکن یہاں سے ہٹ جائیے۔'' آفتاب نے ڈول پرے کر دیا۔ ''آج واجد کو میں نہلاؤں گا۔''

''تم؟'' وہ ہونق سی ہو کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ ''نہیں بیٹا! تم یہ کام نہ کر سکو گے، واجد ایک ضدی بچہ ہے۔ ہاتھ پاؤں مارے گا تو تم سنبھال نہ پاؤ گے، وہ ویسے بھی میرا عادی ہے۔ اگر تم نے نہلایا تو جانے کیسا ردِعمل ظاہر کرے۔''

''وہ کچھ نہیں کرے گا چچی، میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں بھی واجد کو سمجھنے لگا ہوں، آپ صرف میری مدد کرتی جائیے۔'' جیسا بتائیں گی میں ویسے ہی اسے نہلا دوں گا، اعتبار کیجیے چچی، میں آسانی سے یہ کام کر لوں گا۔''

آفتاب نے سہولت سے چچی کا بازو تھام کر دور کھڑا کر دیا اور خود واجد کو پچکارتے ہوئے نہلانے لگا۔ وہ اب بھی غسل پر آمادہ نہیں تھا لیکن آفتاب کے ہاتھ دھیرے دھیرے اپنا فعل انجام دینے لگے تھے۔ چچی، آفتاب کے اس حسنِ سلوک پر آبدیدہ ہوگئیں اور دلگیر ہو کر دعائیں دینے لگیں۔ وہ لڑکا جو اُن کے لیے مکمل طور پر غیر تھا، انسانیت کے تقاضے نبھا رہا تھا اور بار بار احسان کر کے انہیں زیر بار کر رہا تھا۔ کتنا خیال رکھتا تھا وہ ان دونوں کا۔ دنیا شاید ایسے ہی نرم دل لوگوں سے آباد ہے۔ چچی نے بے اختیار سوچا تھا اور آہستگی سے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لی تھیں۔

پھر آفتاب نے واجد کی ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ بوڑھی ناتواں عورت کو ہر ممکن سہولت فراہم کرتا تھا۔ واجد کو کھلانے پلانے سے لے کر نہلانے تک کا ہر کام خود انجام دیتا تھا۔ نتیجتاً واجد بھی آفتاب سے کھلتا جا رہا تھا۔ وہ اسے دور سے آتا دیکھ کر خوشی سے آوازیں نکالتا، اس کا ہاتھ بے قراری سے تھام کر رال بھرے چہرے سے لگاتا اور بار بار اس کا چہرہ اس انداز سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو...... تمہی ہو میرے مسیحا! میرے دکھ کا علاج کرنے والے مہربان تم فرشتہ ہو جس نے میری دکھی ماں کی زندگی میں سکھ اتار دیا ہے۔ تم نہ ہوتے تو شاید وہ بوڑھی عورت ہمت ہار جاتی۔"

آفتاب اپنی خدمات سے مطمئن تھا۔ اسے وہ سارے کام کر کے تسکین بھی ملتی تھی، اب وہ خود کو چچی کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا، اسے لگتا جیسے وہ اس کی اپنی ماں ہو اور واجد اس کا چھوٹا بھائی۔ وہ کسی صلے کی تمنا کیے بغیر اپنا کام انجام دے رہا تھا کیونکہ یہ اللہ واسطے کی بات تھی۔

☆......☆......☆

وقت ہوا بن کر اڑتا جا رہا تھا، تین سال اتنی سرعت سے گزرے مانو پر لگا کر اڑ گئے ہوں۔ آفتاب اب چچی اور واجد کی زندگی کے لیے لازم و ملزوم تھا۔ اس کا ہونا اُن ماں بیٹے کے لیے زندگی کی نوید تھا۔ دونوں مطمئن اور مسرور تھے، لیکن وہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ دکھ بھری زندگی کے بعد خوشی اور سکون کے لمحے شاید چچی کو راس نہ آئے تھے۔ انہیں بہت اچانک ہارٹ اٹیک نے آلیا تھا۔ دل کا پہلا دورہ انتہائی شدید تھا۔ پورے محلے میں ہاہاکار مچ گئی۔ چچی جیسی باہمت عورت کی تکلیف نے ہر دل کو بے سکون کر ڈالا تھا شاید۔ اسی لیے ڈاکٹر کے کہنے پر محلے والوں نے بڑی مستعدی دکھائی تھی اور چچی کو فنافٹ دل کے اسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔

ادھر چچی موت و زندگی کی کشمکش میں تھیں اور اُدھر واجد میاں کو سنبھالنے والوں میں صرف ایک آفتاب کی ذات تھی۔ ان کڑے حالات میں، اس نے جس جاں فشانی، خدمت گزاری اور انسان دوستی کی مثال قائم کی، اس کی نظیر نہ مل سکتی تھی۔ چچی کی غیر موجودگی میں واجد کو ایک ماں کی طرح سنبھالا اور اسے لحہ بھر کے لیے بھی ماں کی دوری کے احساس کے قریب جانے نہ دیا تھا۔

چچی جتنا عرصہ اسپتال میں رہیں، آفتاب نے اتنے دن ورکشاپ سے چھٹی لے لی تھی، واجد کو سنبھالنے اور اس کی نگہداشت کرنے میں اپنے ہر پل کو وقف کر ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

مہینہ بھر بعد جب چچی گھر لوٹیں تو آفتاب کے پاؤں پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔ ان کا وہ اظہارِ تشکر اتنا اچانک تھا کہ آفتاب ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے سرعت سے چچی کو اپنے قدموں سے اٹھا کر کھڑا کیا اور بستر پر لٹاتے ہوئے سمجھانے لگا، لیکن چچی اس کے احسانوں پر اتنی جذباتی ہو رہی تھیں کہ بس روتی جاتی اور دعا دیتی جاتی تھیں۔ واجد جیسے لٹکے وجود، بدشکل اور بدوضع انسان کو سنبھالنا، اس کا خیال رکھنا بہت معنی رکھتا تھا اور آفتاب نے اعلیٰ ظرفی سے ان کا وہ مشکل وقت گزار دیا تھا، آفتاب کی محبت فراموش نہ کی جا سکتی تھی۔ اپنی قربانی اور بے لوث خدمت کے طفیل اب وہ چچی کے لیے بے حد اہم تھا، وہ آفتاب کے لیے جان بھی دے سکتی تھیں۔ انہوں نے آفتاب کو واجد کی طرح اپنا سگا بیٹا مان لیا تھا۔ ان کا اعتماد پہلے سے بڑھ کر تھا، اب وہ اس کی ذاتی زندگی میں بھی عمل دخل کر لیا کرتی تھیں۔ اس کے اکثر فیصلے ماں بن کر خود سے کر دیا کرتیں جسے آفتاب بے چوں

چراں مان لیا کرتا تھا۔

وہ چچی ہی کا اصرار تھا جو آفتاب نے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔ چھوٹی بہن نے ایک اچھی سی لڑکی بھائی کے لیے ڈھونڈ رکھی تھی، جسے چچی کی منظوری کے بعد حتمی رشتہ بنا کر تاریخ طے کردی گئی تھی۔ یوں کچھ عرصے بعد ہی آفتاب کی شادی ہوگئی۔ اس کی شادی پر چچی نے ایک ماں کے دل میں، بیٹے کی شادی کے جو ارمان تھے، وہ سب نکالے اور سراج چچا کی طرف سے ملنے والا منہ دکھائی کا جڑاؤ ہار آفتاب کی دلہن کو تحفے کے طور پر دے دیا تھا۔ وہ جڑاؤ گلوبند بے حد قیمتی تھا۔ آفتاب نے ہچکچاتے ہوئے انکار کیا تھا، لیکن چچی نے اسے دلہن کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ یہ آفتاب کے احسان کی قیمت نہ تھی، لیکن خصوصی محبت کا اظہار ضرور تھا۔ وہ آفتاب کو اپنے واجد سے کسی طور کم نہ جانتی تھیں۔

☆......☆......☆

شادی کے بعد آفتاب کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی تو ذمہ داری میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اب اسے اپنی گھر گرہستی کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ اس کی بیوی بے حد سلجھی طبیعت کی ایک پُرخلوص اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ اس کی محبت اور وفاداری آفتاب کی زندگی کو سکون اور نشاط سے بھر گئی تھی۔

شادی کے بعد بھی آفتاب اسی طرح چچی اور واجد کا خیال رکھتا تھا۔ ان کا ہر کام بڑھ چڑھ کے کرتا، لیکن پھر بھی پہلے جیسی بات نہ رہی تھی۔ زندگی میں آنے والی تبدیلی کے بعد آفتاب کو چچی کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ نئی نویلی دلہن کو وہ سارا وقت گھر کی چار دیواری میں قید کرکے نہ رکھ سکتا تھا۔ سوسیر و تفریح بھی ہوتی اور سسرال آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔

گزرتے وقت نے جیسے مصروفیت کے جال پھیلائے تو آفتاب از خود چچی کے گھر بار سے کچھ دور ہوگیا۔ اپنی نئی شادی شدہ زندگی کی خوشیوں کے درمیان آفتاب کو وہ دوری اتنی محسوس نہ ہوئی جتنی کہ چچی کو...... وہ آفتاب کی عادی ہو چکی تھیں اور اس کی مدد کے بغیر گزارہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ چچی ایک جہاندیدہ عورت تھیں۔ وہ بدلتے وقت کی اس ادا سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں آفتاب اب شادی شدہ مرد تھا، وہ تنہا نہ رہا تھا۔ اب اس کا ایک گھر تھا، بیوی تھی اور روزمرہ کی مصروفیات تھیں پھر اس سے کس بات کا گلہ شکوہ کرنا...... واجد کو نہلانے کا کام اب بھی آفتاب کے ذمے تھا اور وہ اس ذمہ داری سے کوتاہی نہیں برتتا تھا۔

کچھ مہینے اور گزرے، چچی کے روز و شب ایک بار پھر کام کے بوجھ تلے گزرنے لگے تھے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ نحیف اور کمزور ہوگئی تھیں۔ دل کی بیماری کے ساتھ محنت کی زندگی گزارنا ممکن نہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ محلے بھر کی سلائی کڑھائی کرکے گزارہ کررہی تھیں۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ واجد کی فکر تھی جو اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج تھا، ہاں آفتاب کی کچھ محنت ضرور رنگ لائی تھی، واجد اپنے بڑے بڑے بے ہنگم بالوں بھرے ہاتھوں کو استعمال کرنا ضرور سیکھ گیا تھا۔ وہ چیزیں آسانی سے گرفت میں لے کر اِدھر اُدھر دھکیل دیا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت غیر معمولی تھی۔ کوئی چیز ایک بار پکڑ لیتا، تو کئی گھنٹے اسے پکڑے گھورتا رہتا۔

آفتاب نے اسے مختلف کھلونوں اور رنگوں سے بھرپور تصاویر کی جانب متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ شاید یہ اسی پُرخلوص محنت کا نتیجہ تھا کہ واجد جیسا ناکارہ بندہ بھی رنگین پوسٹرز اور بھالو، بلی ٹائپ

کے کھلونوں سے خوب کھیلتا اور ان کے خال وخد کو دیر تلک گھورتا رہتا تھا۔ وہ مشغلہ جب اس کے ہاتھ لگا تھا، چچی کو کام کرنے اور دھیان بٹانے میں بہت سہولت ہوگئی تھی۔ واجد کھلونوں کی دنیا اور ان کے شوخ رنگوں میں کھویا رہتا اور چچی اپنی روز مرہ کی گھریلو مصروفیات نمٹاتی رہتیں، یوں پورا دن کسی ہنگامے کے بغیر گزر جاتا تھا۔

☆......☆......☆

اس دن آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بدن کو سردی کا احساس دلا رہی تھی، لیکن موسم سے بے خبر چچی سلائی مشین پر جھکی زاہدہ بی کا جوڑا سینے میں مشغول تھیں۔ ایسے میں اچانک سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ چچی خود کو سنبھالتیں، درد بے قابو ہوا تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دھڑکن بڑھتی چلی گئی اور شدت کی تکلیف نے ان کے بدن کو اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔

اس بار دل کا دوسرا دورہ، پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دہری ہوگئیں پھر بھی خود کو گرنے سے بچا نہ سکیں، اگلی ہی ساعت چارپائی سے الٹ کر وہ فرش پر اوندھی جا پڑیں۔ انہیں تڑپتا دیکھ کر واجد نے گھٹی آوازوں سے چلانا شروع کر دیا۔ چچی کے گرنے سے جو زوردار آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے واجد کو ازحد خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر سارے کھلونے ہاتھ مار کے پرے پھینک دیے اور اپنی کرسی پر کسی پر کٹے پنچھی کی طرح پھڑپھڑانے لگا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے نکلتی بے ربط آوازوں کو سننے والا آج کوئی نہیں تھا۔ چچی کی حالت تشویش ناک تھی۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری تھا تاکہ ڈاکٹرز ان کی زندگی بچاتے لیکن بدقسمتی سے آج آفتاب کا سہارا بھی چچی کو میسر نہ تھا۔ وہ چند دن پیشتر بیوی کو لے کر میکے روانہ ہوا تھا۔ اس کی بیوی امید سے تھی اور آفتاب نے بیوی کو میکے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ چچی کو سسرال جانے کی باقاعدہ اطلاع دینے آیا تھا۔ بیوی کو اس کے میکے چھوڑنے کے بعد اسے بہن سے ملنے حیدرآباد بھی جانا تھا سو واپسی ہفتہ دس دن سے پہلے ممکن نہ تھی۔

آفتاب کے جانے سے چچی پر کام کا دباؤ بڑھ گیا تھا، گھر کے ساتھ واجد کی جملہ ذمہ داری ان کے سر آٹھہری تھی جس کی وجہ سے وہ خود کو تھکی ہاری سی محسوس کرنے لگی تھیں۔ چکراتے سر اور دکھتی کمر کے ساتھ اگر بستر پر جا پڑتیں تو تب بھی آرام کے لمحے نصیب میں نہ تھے۔ جلد یا بدیر واجد کی ہاہاکار انہیں اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی اور وہ بیٹے کی حاجت روائی کے لیے پھر سے سرگرم عمل ہو جایا کرتی تھیں۔ شاید یہ وہی تھکاوٹ، پریشانی اور کمزوری تھی جس نے ایک بار پھر چچی کو دردِ دل میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

دل کا دوسرا دورہ انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس دن اچانک زاہدہ بی کسی فرشتے کی صورت نمودار ہوئی تھیں۔ انہیں میلاد پر جانا تھا، سو وہ خود ہی چچی سے اپنا جوڑا لینے چلی آئی تھیں۔ لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا، وہ اوسان خطا کرنے کو کافی تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس دوڑیں اور آس پڑوس سے سبھی کو بلا لائیں۔ محلے والوں نے مل جل کر چچی کو دل کے اسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹرز کی بھرپور کوششوں کے بعد بالآخر چچی کی زندگی بچالی گئی۔ دل کا دورہ جان لیوا ہونے کے باوجود چچی کی سانس توڑنے میں ناکام رہا تھا۔

☆......☆......☆

چچی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھیں۔ ان کے اسپتال میں رہنے کی وجہ سے محلے بھر کے لیے

واجد کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ کوئی بھی اب گوریلا نما انسان کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ سب اس کے مرگھلے، لٹکے وجود سے خوف کھاتے اور قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ ان حالات میں واجد حد درجہ برانگیختہ حالت کا شکار تھا۔ ماں سے دوری اور ناآشنا تنہائی نے اس کی ذہنی حالت کو بُری طرح مجروح کیا تھا۔ اس کے واویلا مچانے پر محلے کے لوگ دور کھڑے رہ کر اس بے زبان کا تماشا دیکھتے، پھر بھی اس کی مدد کو نہ بڑھتے تھے۔

واجد دو دن تک تنہا گھر میں بھوکا پیاسا رہ کر شور مچاتا رہا۔ وہ مفلوج اور ذہنی پس ماندہ تھا تو کیا ہوا...... تھا تو بندہ بشر، جسے وقت پر بھوک لگتی تھی اور پیاس بھی۔ حوائج ضروریہ سے فراغت اس بے چارے کی مجبوری بھی تھی۔ دو دن کی تنہائی میں وہ غلاظت سے بھر گیا تھا۔ اطراف میں بو پھیل جانے پر محلے والے اس کی طرف سے کچھ اور غافل ہو گئے البتہ کچھ رحم دل ایسے بھی تھے جو دور کھڑے رہ کر روٹی کے کچھ ٹکڑے واجد کو جانور سمجھ کر اس کے آگے پھینک آتے تھے۔ واجد انہیں اٹھانے سے قاصر تھا، یہی تو اس غریب کی مجبوری تھی کہ وہ ماں کا محتاج تھا۔ وہ ممتا کی ماری نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالا کرتی تھی اور پانی سے بھرا گلاس منہ سے لگا کر واجد کی پیاس مٹایا کرتی تھی۔

تیسرے ہی دن واجد کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کی اَدھ مری حالت بھانپ کر کچھ لوگوں کو ترس آیا تو ہمت باندھ کر انہوں نے معذور افراد کے ادارے میں فون کر دیا، وہ آئے اور واجد کو بے دردی سے ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں ڈال کر کسی جانور کی طرح لے گئے اور اس بے چارے کی آہ و زاری کو بھلا کر معذوروں کے لیے بنائے گئے سلاخوں والے کمرے میں کسی قیدی کی طرح بھرتی کر دیا اور پھر بے خبر ہو گئے تھے۔ چچی کے صحت یاب ہو کر گھر لوٹنے تک واجد کی حالت بے حد ابتر ہو گئی تھی۔ غیروں کے رحم و کرم پر رہ کر وہ رہے سہے اوسان بھی کھو بیٹھا تھا۔ معذوروں کے ادارے میں اس سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا تھا، وہ سلوک، جس کا واجد قطعاً عادی نہ تھا۔ اس نے ابتداء ہی سے ماں کے ریشم لہجے اور نرم رویے کو پایا تھا۔ اس کے پیار اور لمس سے ٹھنڈک حاصل کی تھی لیکن اب انتظامیہ کے چند لوگوں نے اسے اپنی چڑچڑاہٹ نکالنے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اُن کے تھپڑ اور ٹھڈے کھا کر واجد کی حالت پتلی ہو گئی تھی، وہ ماں کی طرح دل کے دورے کا مریض نہ تھا لیکن چچی کی طرح موت کی راہ دیکھنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

پورے پندرہ دن بعد آفتاب اپنے شہر لوٹا تو اسے چچی کے علیل ہونے کی اطلاع ملی تھی، وہ بھاگم بھاگ ان کے گھر پہنچا لیکن خالی گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ واجد کہیں نہیں تھا۔ محلے داروں کی زبانی اسے واجد کے ادارے میں پہنچا دیے جانے کی خبر ملی تو وہ تڑپ اٹھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے وہ واجد کو دوبارہ گھر لے آیا تھا مگر واجد...... واجد نہ رہا تھا۔ کمزور، لاغر اور بدحال سا واجد گم سم اور بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی مخصوص کرسی پر گرا پڑا تھا۔ ظلم اور خوف کے کریہہ احساس نے اس کی حالت مُردوں سے بدتر کر دی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے لٹکے ناکارہ وجود کی طرح کسی غیر مرئی نقطے پر نظر گاڑے چپ چاپ پڑا تھا۔ آفتاب نے اسے بہلانے اور پچکارنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر وہ سہما سا وجود جانے کس اور دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر ایک جامد خموشی طاری تھی۔

ادھر چچی کے گھر آجانے کے بعد بھی اس کی

حالت میں سرِ مو کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ماں کو سامنے پا کر بھی واجد بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا اس کی بگڑی حالت اور زخمی وجود دیکھ کر بنا بتائے چچی کو جیسے ہر بات کی خبر ہو چلی تھی۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کے اسپتال جانے کے بعد محلے والے واجد کی دیکھ بھال کرنے میں ناکام رہے تھے اور اس ایسی جگہ چھوڑ آئے تھے جہاں اسے جانور سمجھ کر باندھا اور پیٹا گیا تھا۔ آفتاب کو بھی اس ناگہانی وقت ہی میں شہر سے باہر جانا تھا اگر وہی موجود ہوتا تو واجد ادارے کے ظلم کہاں سہتا...... لیکن وہ تو ہونا ہی تھا۔ ماں بیٹا اس بھری دنیا میں لاوارث تھے اور لاوارثوں کو زندگی میں ٹھوکروں کے سوا اور بھلا کیا ملتا ہے۔

واجد کی بگڑی حالت اور گم سم انداز چچی کے دل کو تڑپا گیا تھا۔ وہ من میں دہکتی بے بسی کی آگ میں جل کر پل پل سلگ رہی تھیں۔ واجد پر نگاہ پڑتے ہی آنکھیں ڈبڈبانے لگتی تھیں۔ کیا اسی دن کے لیے انہوں نے محنتوں ریاضتوں سے واجد کو سنبھالا تھا۔ ادھورا ہونے کے باوجود انہوں نے اسے اکلوتی اولاد سمجھ کر پالا تھا اور ریشم سی زندگی دینے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی ان کا دست شفقت واجد کے سر سے کیا اٹھا، دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ان کا لاڈلا بیٹا زندوں میں رہا تھا نہ مُردوں میں، اس کا سکون و اطمینان کھو گیا تھا۔

چچی پریشان رہنے لگیں، انہیں آنے والے وقت کی چاپ سنائی دے رہی تھی، اپنی اچانک آ جانے والی موت سے خوف آنے لگا تھا، وہ بہ خوبی جانتی تھیں کہ دل کا آخری دورہ انہیں اب کی بار دنیا سے اٹھا دے گا پھر اس کے بعد واجد کا کیا ہوگا......؟

یہ اندوہناک سوال دل کی دنیا ہلا ڈالتا تھا۔ کیا ان کے گزر جانے کے بعد وہ دوبارہ نادار اور معذور لوگوں کے بیچ جانوروں کی طرح رہ کر نفرت بھری زندگی گزارنے کا اہل تھا؟ کیا اس کی معذوری، مجبوری بن کر اس کی زندگی کا دائرہ تنگ کرنے والی تھی؟

چچی جتنا سوچتیں اتنا ہی الجھتی جاتی تھیں۔ روح زخمی اور من بوجھل تھا۔ انہیں وہ ڈاکٹر شدتوں سے یاد آ رہا تھا، جس نے واجد کی پیدائش پر ان کے شوہر سراج کو حقیقتِ حال سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کی تھی اور آنے والے وقت کے خطرات اور مسائل سے آگاہ کیا تھا۔ وہ وہی مسائل تھے جو آج چچی کو درپیش تھے۔

انہیں یاد تھا، ان کے شوہر سراج ڈاکٹر کے دلائل بھرے اصرار پر اپنے ایب نارمل بیٹے کو موت کا ٹیکہ لگانے پر کسی حد تک راضی ہو گئے تھے، لیکن چچی نے جی جان سے ان کی مخالفت کی تھی، انہیں آج بھی اپنے کہے الفاظ یاد تھے۔ انہوں نے گریہ زاری کرتے ہوئے کہا تھا......

''نہیں سراج صاحب! واجد جیسا بھی ہے ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے۔ جب اللہ نے اسے زندگی دی ہے تو ہم مارنے والے کون ہیں؟ اللہ نے انسان کو اس کی زندگی کے کسی مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ دنیا میں اس کی انجام دہی کیے بغیر لوٹ کر نہ جائے گا مجھے یقین ہے یہ بچہ بھی یونہی پیدا نہیں کیا گیا، اللہ قادر المطلق ہے۔ وہ چاہے تو اسے موت دے گا۔ جب موت اور زندگی اسی کے ہاتھ ہے تو ہم واجد کو موت کا ٹیکہ لگوا کر اس کے قتل کے ذمے دار کیوں بنیں؟ یہ گناہ ہوگا سراج صاحب...... یہ گناہ عظیم ہوگا......''

اور اللہ پر یقین و بھروسا رکھنے والی چچی آج واجد کی زندگی کو اپنی عظیم غلطی خیال کر رہی تھیں۔ وہ فلسفہ جو انہوں نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے بولا تھا اس فلسفے کی تعبیر و تفسیر ان کے سامنے آج تک نہ آئی

تھی۔ واجد کا ناکارہ مفلوج وجود آخر کس مقصد برآری کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا تک نہ کھا سکتا تھا پھر کسی فرض کی ادائیگی کیسے کرتا...... کیا اللہ اس جیسے لٹکے مرگھلے وجود سے بھی کوئی کام لے سکتا تھا......؟ نہیں، ایسا ممکن نہ تھا، شاید واجد دنیا کے لیے صرف عبرت بنا کر بھیجا گیا تھا۔

چچی کا دل ٹوٹ کر رہ گیا تھا، وہ جانتی تھیں ان کی عیادت کے لیے آنے والا ہر شخص واجد پر ترحم بھری نگاہ ڈالتا تھا اور اس کے مستقبل کے بارے میں چچی سے کچھ نہ کچھ ضرور پوچھتا کیوں کو کہیں نہ کہیں سبھی کے ذہن میں یہ سوال یا اندیشہ اٹکا پڑا تھا کہ چچی کی موت کے بعد واجد کا کیا ہوگا؟ بے رحم دنیا کا ایک دکھیاری ماں سے اس کے معذور بیٹے کی ادھوری زندگی کا مستقبل پوچھنا اور ناامیدی کے اندھیرے کو بڑھائے جانا عبرت کا سامان ہی تو تھا۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لیے انہوں نے واجد کو پالا تھا۔ بڑا کیا تھا......

''نہیں......'' وہ سوچوں سے الجھ کر بے اختیار اٹھ بیٹھیں، ان کی نظریں سامنے کرسی پر ڈھیر ہوئے واجد پر منڈلانے لگی تھیں۔

آفتاب نے بہت دنوں کے بعد آج اس کے سامنے کھلونوں کا انبار اکھٹا کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا واجد کوئی ردعمل ظاہر کرے اور اپنی چپ کے حصار سے نکلے۔ چچی نے دیکھا آفتاب ایک ایک کھلونا اٹھا کر واجد کو تھماتا اور اسے پچکارنے کی کوشش کرتا، لیکن وہاں وہی جامد سی خموشی تھی۔ ایک ہی مرکز پر نگاہ ٹھہرائے گم سم حالت میں منہ سے گرتی رال کے ساتھ واجد عبرت و بے کسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

چچی کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل کے اندر جیسے برچھی سی اتر گئی تھی، وہ بستر سے اٹھ کر آفتاب کے نزدیک آگئیں اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے ہوئے رندھی آواز سے بولیں۔

''کیوں اپنا وقت اس بے چارے پر ضائع کر رہے ہو بیٹا! وہ اس وقت ایک بے جان مورتی بنا بیٹھا ہے۔ تمہاری محبت کا کوئی جواب نہیں دے گا۔''

''ارے کیوں نہیں دے گا چچی! واجد پہلے بھی کھلونوں سے کھیلتا رہا ہے، یقیناً اب بھی وہ رنگ برنگے ان کھلونوں کی طرف اپنا ہاتھ ضرور بڑھائے گا۔ ہمیں مایوسی سے دور رہنا چاہیے۔''

''نہیں آفتاب، واجد ایسا نہیں کر پائے گا۔ دنیا کے ناروا سلوک نے اس معصوم کو اندر تک سے دہلا دیا ہے۔ اب بھلا ایک ڈرا سہما وجود ان بے جان کھلونوں سے کہاں بہلے گا۔ وہ اعتماد اور محبت سے محروم ہو چکا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے چچی، مایوسی کی باتیں نہ کریں، میں پُرامید ہوں۔ آپ دیکھنا واجد میری کوشش کو رائیگاں جانے نہ دے گا۔''

آفتاب نے بڑے وثوق سے انہیں آس دلائی اور رنگین گھنگھروؤں والا ایک جھنجھنا اٹھا کر ہولے سے بجایا اور واجد کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کی چھن چھن کی تیز آواز سے چونک کر واجد کی ٹھہری نظر اپنے مرکز سے ہٹ کر جھنجھنے کی طرف آئی تو آفتاب نے وہ کھلونا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ واجد کی پھٹی پھٹی آنکھیں جھنجھنے کے جھلملاتے رنگوں کو کھوجنے لگیں، اس کے ہاتھ کی گرفت اپنے کھلونے پر مضبوط ہو چکی تھی جبکہ چہرے پر پھیلے سناٹے میں دلچسپی کی ہلکی سی رمق جاگی تھی، واجد کا بدلتا تاثر اتنا واضح تھا کہ آفتاب خوشی سے دیوانہ ہو گیا، بے ساختہ پلٹ کر چچی سے بولا۔

''دیکھا، میں نا کہتا تھا واجد میری کوشش کا بھرم ضرور رکھے گا۔ دیکھیے چچی! اس نے کس طرح یہ جھنجھنا اپنے ہاتھوں میں کس کے پکڑ لیا ہے، اب دیر

تلک وہ اس کے رنگوں کو تکتا رہے گا، واجد ٹھیک ہو جائے گا...... مجھے یقین ہے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا، بس اب اسے ہماری بھرپور توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔''

چچی آبدیدہ ہوگئیں، شفقت سے آفتاب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''اللہ تمہیں اجرِ عظیم دے آفتاب! تمہیں عمرِ خضر دے۔ ایک تم ہی تو ہو جو مجھے مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر ایسی روشنی دیکھنے پر مجبور کرتے ہو، لیکن میرے بچے، ایسی کوشش بے فائدہ ٹھہری تو؟ میرا واجد اگر اپنے آپ میں لوٹ بھی آیا تو کیا ہوگا آفتاب! وہ ایک ناکارہ وجود ہی رہے گا نا۔ میرے مرنے کے بعد اس بدنصیب کو کون سہارا دے گا۔ کون سنبھالے گا؟ میری موت واجد کے لیے عذاب کھینچ لائے گی۔''

''اوہ چچی، آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ زندگی اور موت پر اختیار صرف اللہ کا ہے۔ آپ کی عمر کتنی دراز ہے، آپ کو کیا معلوم۔ آپ موت کی بات کہہ کر مایوسی کا اظہار کیوں کرتی ہیں۔''

''میں مایوس نہیں ہوں آفتاب! لیکن تم مجھے اس طرح بہلاوا مت دو۔ دل کے دوسرے شدید دورے کے بعد بھی میں زندہ ہوں تو یہ میری سخت جان ہے لیکن سچ کہوں تو اب درد کی ایک ذرا سی لہر مجھے بڑی آسانی سے موت کے منہ میں دھکیل دے گی۔ اب میری زندگی مختصر ہے آفتاب۔ موت ہر لمحہ میرے تعاقب میں ہے، لیکن میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مجھے خوف اپنے بیٹے واجد کے لیے ہے۔ میرے بعد وہ کیسے جی پائے گا۔ کاش اس کی پیدائش پر میں نے ڈاکٹر کی بات مان لی ہوتی۔ کاش واجد کو اسی وقت موت کا ٹیکہ لگا دیا جاتا تو کم سے کم آج وہ ایسے دکھ تو نہ سہتا، اس کی زندگی اس کے لیے آزار تو نہ بنتی۔ وہ دنیا کے ہاتھوں میں کھلونا تو نہ بنتا۔''

''ایسا نہ کہیے چچی!'' آفتاب نے دکھے دل سے انہیں ٹوکا۔ واجد کی زندگی آپ کی مرہونِ منت ہے۔ وہ آپ کا بیٹا ضرور ہے لیکن اس کی زندگی کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ ہے۔ واجد کو کتنا زندہ رہنا ہے اور زندگی سے کتنا دکھ سکھ پانا ہے، یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ اللہ نے آپ پر صرف واجد کی پرورش کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ آپ کے بعد کوئی نہ کوئی وسیلہ متبادل کے طور سامنے آجائے گا۔ اللہ وہ سب کرتا ہے جسے ہم ناممکن سمجھتے ہیں۔ دراصل ہم بندے اللہ کی مصلحت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔''

''کرتے ہیں کوشش، کیوں نہیں کرتے بیٹا۔'' چچی نے اک گہرا سانس لے کر جیسے خود کو سنبھالا تھا۔

''کبھی میں بھی بالکل تمہاری طرح سوچتی تھی آفتاب۔ میں بھی کہتی تھی اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی چیز بھی بے سبب پیدا نہیں کرتا۔ آنے والی روح کسی نہ کسی مقصد کے تحت دنیا میں وارد ہوتی ہے، لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں آفتاب کہ آدمی ہی آدمی کے دکھ سکھ کا سبب بنتا ہے لیکن میرا واجد...... وہ نارمل نہیں ہے۔ وہ ایک نامکمل اور مفلوج انسان ہے اور ایسا انسان کس کام کا۔ اللہ نے شاید واجد کو میری آزمائش کے لیے پیدا کیا تھا۔ میں تھک چکی ہوں آفتاب، پر میری آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب مجھ میں واجد جیسے بچے کو سنبھالنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ سوچتی ہوں میرے مرنے کے بعد اس کی زندگی کتنی عبرت ناک ہوگی۔ وہ اپنا تحفظ کیسے کر پائے گا۔ یہ سوچ مجھے اندر تک دہلا جاتی ہے۔ میں ایسا کیا کروں کہ اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ وہ سکھ سے جی سکے۔ لیکن بیٹا، یہ ممکن نہیں ہے۔ کاش میں واجد کو اپنے ہاتھ سے زہر دے سکتی، کاش میں مرنے سے

پہلے اپنے اس بچے کو مار سکتی۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کی بے کسی اور لاچاری پر آفتاب کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ چچی کو دلاسے دینے لگا لیکن اس بار اس کی ہر کوشش بے سود ٹھہری تھی۔ چچی اب کسی بہلاوے سے بہلنے والی نہ تھیں۔

دن ہوتا یا رات، چچی کے دل و دماغ سے یہ سوچ کسی آسیب کی طرح لپٹ گئی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد واجد کی زندگی عبرت سرائے دہر بن کر رہ جائے گی اور اس وقت کے آنے سے پہلے انہیں اپنے بیٹے کی زندگی کو تحفظ دینا ہوگا۔ ان کی موت کے بعد آفتاب تن تنہا واجد کو کہاں تک سنبھال سکتا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ انسان تھا۔ اس کی زندگی کے اپنے مسائل، اپنی مشکلات تھیں۔ اب کچھ ہی عرصے بعد اس کا گھر آنگن بھی ایک بچے کی قلقاریوں سے گونجنے والا تھا۔ اپنے بچے کی موجودگی میں وہ واجد کے لیے آخر کتنا وقت نکال سکتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی واجد کو پوری توجہ نہیں دے سکتا تھا۔

ان بدلتے حالات میں صرف آفتاب پر تکیہ کرنا مناسب نہ تھا۔ واجد کے مستقبل کو محفوظ بنانا از حد ضروری تھا۔ چچی کی گہری سوچیں سمندر میں پڑتے گرداب کی طرح چکراتی رہتیں، من کو بے کسی اور بے یقینی کے ہزار وسوسے ڈنک مارتے اور وہ مزید اذیت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اپنی موت سے پہلے واجد کے لیے کوئی محفوظ ٹھکانہ از حد ضروری تھا اور وہ ٹھکانا کہاں تھا، وہ نہیں جانتی تھیں۔

☆☆

ایک دن وہ انہی عذاب ناک سوچوں میں گھری بیٹھی تھیں کہ اچانک ایک اچھوتا خیال دماغ سے اٹھ کر دل میں جاگزیں ہوا تھا۔ اپنی ہی سوچ پر چچی کا وجود جیسے لرزے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیسا انوکھا خیال سوجھا تھا انہیں...... واجد سے نجات کا خیال۔

وہ گھبرا کر چارپائی پر پڑے اپنے اکلوتے مفلوج بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ جو ایک ہاتھ میں ربڑ کا بھالو اور دوسرے میں رنگین پوسٹر تھامے پڑا تھا۔ اس کی پھٹی آنکھوں میں حیرت کے رنگ تھے۔ وہ پوسٹر پر بنے سرخ دہکتے گلاب کے پھول پر نظریں گاڑھے محویت کا شکار تھا۔ اس کی سخت گرفت میں پوسٹر کاغذ کے معمولی ٹکڑے کی طرح چڑمڑا سا گیا تھا لیکن پھر بھی واجد گلاب کے سرخ رنگ میں ایک ٹک جانے کیا گھور رہا تھا۔

چچی کی بھٹکتی نگاہ اس کے ٹیڑھے ہاتھوں پر منڈلانے لگی۔ لمبی لمبی انگلیوں والے ہاتھ بالوں کی زیادتی کے سبب کالے سیاہ دکھائی دے رہے تھے ناخنوں میں میل بھری تھی اور ہاتھ کی پشت پر جا بجا ٹپکی رال کے دھبے سفیدی کی صورت نمایاں ہو رہے تھے۔

چچی بغور واجد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا واجد اپنے خیالات کی رو میں بھٹک کر جب جھٹکے کھاتا تو ہاتھ میں پکڑی چیز بھی جھٹکے لینے لگتی تھی۔ وہی جھٹکے چچی کے دل کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کرنے لگے تھے کیونکہ وہی غیر محسوس سے جھٹکے ان کی بگڑی بنا سکتے تھے۔

وہ کچھ پل پُرسوچ انداز لیے واجد کے ہاتھوں کو گھورتی رہیں پھر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اندر کمرے میں آ کر پلنگ کے نیچے سے پرانا لکڑی کا بکسا کھینچا اور اسے احتیاط سے کھول کر آگے بیٹھ گئیں، کپکپاتے ہاتھوں سے دیگر کپڑوں کے نیچے سے اپنے مرحوم شوہر کی پولیس کی وردی نکال کر زانوں پر دھر لی۔ یونیفارم آج بھی بالکل نئے کلف زدہ کالر کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اس پر

پھیرنے لگیں۔ کئی آنسو بیک وقت ان کی آنکھوں سے ڈھلک کر بوڑھے رخساروں پر لکیریں کھینچ گئے۔ دائیں جیب کے اوپر سب انسپکٹر محمد سراج نام کا کالے حروف سے لکھا بیج آج بھی آویزاں تھا۔ جانے کیا ہوا تھا کہ چچی یونیفارم پر چہرہ ٹکا کر بے اختیار رو پڑی تھیں۔

''اے اللہ! میں ہار گئی ہوں آج! میں ہاری اُس اذیت سے، جو آج مجھ سے سہی نہیں جا رہی۔ مجھے معاف کردے میرے اللہ، میں اپنے بعد اپنے معذور بیٹے کو تیری بے رحم دنیا میں اکیلا چھوڑ جانے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے اپنی دی ہوئی آزمائش سے نجات عطا کر۔ میں ہاری میری مولا! میں نے جو سوچا ہے اسے کرنے کی ہمت عطا کر۔ یہ گناہ مجھے کرنا ہوگا ورنہ واجد جی کہاں پائے گا میرے بغیر۔'' ان کے اشک وردی بھگونے لگے تھے۔ دبی دبی سسکیوں کے ساتھ چچی نے بکسے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس بار سراج صاحب کا سرکاری ریوالور نکالا تھا۔ وہ ریوالور ان کی وفات کے بعد اعزازی طور پر اس وردی کے ساتھ ان کی بیوہ کو عنایت کیا گیا تھا۔ اس ریوالور سے سراج صاحب نے کئی پولیس مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور آج...... آج اس ریوالور کو اس گھر کی کہانی کو انجام دینا تھا۔

چچی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بارہ سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ریوالور نیا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے سراج صاحب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق آہستہ آہستہ اسے لوڈ کیا تھا۔ پوری چھ گولیاں چیمبر میں بھر کر وہ کچھ دیر ریوالور کو گھورتی رہیں، یوں جیسے اپنی کھوئی ہوئی ہمت کو جگا رہی ہوں۔ دل بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھیں۔ واجد کو مار کر کیا خود ان کے لیے مرنا آسان ہوگا؟ اور کیا وہ اپنے

اکلوتے بیٹے کی جان لے سکیں گی۔ کیا ایسا کر کے ان کے مسائل حل ہو جائیں گے......؟

چچی کا رنگ زرد ہو رہا تھا جبکہ سانس کی آمد و رفت بھی بڑھ چکی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے دوپٹے سے ریوالور صاف کرنے لگیں، اب بس ایک ٹرائیگر دبانے کی دیر تھی، گولی نال سے نکل کر شکار پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھی۔ انہوں نے پولیس کی وردی بکسے میں رکھ کر اسے دوبارہ پلنگ کے نیچے دھکیل دیا تھا۔

پھر کئی خاموش لمحے تیزی سے سرک گئے، تب چچی خود کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اشکوں سے دھندلائی آنکھوں کو بڑی بے دردی سے پونچھا اور ریوالور ہاتھ میں لیے واجد کے نزدیک چلی آئیں۔ وہ اب تلک اسی پوزیشن میں پڑا ہاتھ میں دبے پھول کی دلکشی میں کھویا ہوا تھا۔ پوسٹر اس کی سخت گرفت کے باوجود ہاتھ کی لرزش سے ہل رہا تھا۔ چچی نے ریوالور چارپائی پر رکھ دی اور واجد کو بانہوں کے حصار میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ اب ان کی آنکھیں چھما چھم برس رہی تھیں۔ اپنی موت سے پہلے انہیں واجد کی موت کا دکھ دیکھنا تھا، وہ جو وقت پیدائش ڈاکٹر سے موت کا انجکشن واجد کو لگوانے کے حق میں نہ تھیں آج خود اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ واجد جیسے ایب نارمل موذور بچے کا مزید زندہ رہنا خود اس کے لیے اذیت و مصیبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس معصوم کی اذیت کو اب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک بے مصرف انسان تھا۔ ایسا انسان جو عبرت برائے دہر کی عملی تصویر بن کر دنیا میں آیا تھا۔ اس کے ذمے اللہ کے کسی فرض کی ادائیگی لازم نہیں تھی۔ ایسے انسان کا دنیا سے کوچ کر جانا، اس کی ماں کی آنے والی موت کو پُرسکون کر سکتا تھا۔ کیونکہ بیٹے کی موت کے بعد ماں کو مرنے کے لیے دل کے آخری دورے کی چنداں ضرورت نہ تھی، وہ پہلے ہی مر جاتی۔

ماں کی بے پناہ محبت اور اس درجہ امتیازی سلوک پر واجد کھلکھلانے لگا تھا۔ آج نہ جانے کتنے دن کی دم سادھی خاموشی کے بعد اس کے موٹے موٹے لبوں پر ہنسی کا رنگ جھلملایا تھا۔ دل سے اُمڈتے ماں کے پیار کو محسوس کرتے ہی اس کے تنِ مردہ میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی گلاب کی تصویر کی صورت، کھلا، کھلا دکھائی دینے لگا تھا۔

چچی نے واجد کا رال بھرا چہرہ اپنے گداز ہاتھوں میں تھام کر اک وارفتگی سے اس کا ماتھا چوما۔ پھر اس کے لمبی انگلیوں والے ہاتھ سے بھالو اور گلاب والی تصویر کا پوسٹر آہستگی سے کھینچ لیا۔ واجد نے ماں کی محبت پا کر کسی اعتراض کے بغیر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔

چچی نے دونوں چیزیں پرے پھینک دیں پھر چارپائی پر پڑے پستول کو اٹھا کر واجد کے ہاتھوں میں زبردستی پکڑایا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے ریوالور کی نال کا رخ انہوں نے دانستہ واجد کی طرف رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی شہادت کی انگلی ٹرائیگر پر رکھنے کے بعد جیسے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ ایک دکھی ماں کے کمزور دل کی صدا تھی جسے واجد کسی دشواری کے بغیر از خود سمجھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ماں کی کوشش کو رائیگاں نہ جانے دیا اور ریوالور کو اپنے لمبی انگلیوں والے استخوانی ہاتھ میں لے کر غائب الدماغی سے دیکھنے لگا۔ اب اس کی پھٹی وحشت زدہ آنکھیں پستول کی ساخت اور رنگت کا بغور معائنہ کر رہی تھیں۔ چچی کچھ دیر بیٹے کو گھورتی رہیں پھر اک گہری سانس لے کر انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ ان کا مجروح دل پارا پارا تھا لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھیں۔ انہوں نے اپنے معذور بیٹے کو اس بے درد دنیا کے ہاتھوں

اذیت کا نشانہ بننے سے بچانے کی خاطر ہی ایسا فعل انجام دیا تھا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتیں تو ان کے بعد واجد کسی جانور سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور رہتا اور عمر بھر غلاظت میں لتھڑ کر اسی گندگی میں جان دے دیتا۔

چچی اپنا کام پورا کر چکی تھیں۔ ریوالور اب واجد کے ہاتھوں میں تھا۔ اب باقی کا سارا کام اس کے آڑھے ٹیڑے ہاتھوں کی سخت گرفت اور ان غیر محسوس جھٹکوں کا تھا جس کے طفیل کسی بھی لمحے ٹرائیگر دب سکتا تھا۔ ریوالور کی نال اپنے نشانے یعنی واجد کی طرف تھی، گولی چلتی تو براہِ راست واجد کو لگتی اور وہ چند سیکنڈز میں اذیت کے حصار سے نکل جاتا، جس سے بچانے کے لیے بھی ڈاکٹرز نے موت کے ٹیکے کی صلاح دی تھی......

آج بھی ایسی ہی موت واجد کا مقدر تھا لیکن اب وہ ایک ماں کی مجبوری تھی، اپنی زندگی ہارنے سے پہلے وہ اپنے اپاہج اکلوتے بیٹے کو زندگی کے آزار سے بچانا چاہتی تھی۔ چچی نے کچھ قدم چلنے کے بعد پلٹ کر اس کا جائزہ لیا، وہ اب بھی ریوالور ہاتھ میں لیے ایک ٹک اسے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت جیسے زور پکڑ رہی تھی۔ وہ ریوالور جو پہلے اس کے ہاتھوں میں لڑکھڑا رہا تھا، اب واجد کے کنٹرول میں تھا۔ گزرتے وقت نے واجد کے ہاتھوں کی طاقت دھیرے دھیرے بحال کردی تھی۔ چچی نے رخ موڑ لیا تھا، ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اپنے لختِ جگر کو موت کے منہ میں چھوڑ کر وہ دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں تاکہ گولی چلنے کا انتظار کرتیں جو کسی بھی پل ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ جانے پر فائر ہونے والی تھی اور واجد کو ہمیشہ کی نیند سلانے والی تھی۔

چچی نے دروازے تک کا فاصلہ بڑی مشکلوں سے طے کیا تھا۔ ان کا دل پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ کمرے کے دروازے پر ٹھہر کے انہوں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا۔ واجد کی نگاہ اس بار ان ہی کی جانب لگی تھی، ہاتھ میں پکڑے ریوالور کے ساتھ وہ ماں کو اندر کمرے میں جاتا دیکھ رہا تھا۔ چچی کا دل لرزنے لگا کیونکہ واجد کی پھٹی آنکھوں میں وحشت کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ محبت کی جوت جگمگا رہی تھی، وہی جوت جو ماں کو دیکھ کر ہر بچے کے چہرے پر جھلملاتی ہے۔

چچی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے بچے کو دوڑ کر اپنے کلیجے میں چھپائے لیکن اچانک ہی ان کے سینے میں وہی شدید درد اٹھا جس کی اذیت وہ اس سے پہلے بھی دو بار سہہ چکی تھیں۔ لیکن غربت نے انہیں ڈھنگ سے علاج کروانے کی اجازت ہی نہ دی تھی اور شاید اس سے پہلے، ان کی سانسیں اپنے بچے میں اٹکی رہتی تھیں تب ہی موت بھی، ان کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی۔ لیکن آج اسے بے رحم زمانے پر چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں موت ان کے بے حد قریب آ چکی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا لیکن جیسے ان کی جان اسی وقت اپنے بیٹے میں اٹکی ہوئی تھی۔ تب ہی زور کا دھماکہ ہوا اور اسی لمحے ان کا دم نکل گیا۔ ماں تھیں نہ اپنے بیٹے کو موت کی بانہوں میں جاتے ہوئے دیکھنے سے پہلے خود ہی ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ موت نے اتنی پیار کرنے والی ممتا کا بھرم رکھ لیا تھا۔ واجد اپنی ماں کے ساتھ اس بے رحم اور بے مہربان دنیا سے بہت دور آ در نہ ہی، دکھ اور پریشانیاں انہیں قطرہ قطرہ کر کے ختم کر رہے تھے۔

لوگ مرتے ہیں زندگی کے لیے
موت ہے زندگی کسی کے لیے

☆☆......☆☆☆

افسانہ

شاہانہ خان

بند ہونٹوں کی دعا

"اسمارہ اب شادی کے قابل ہوگئی ہے داؤد صاحب! آپ کچھ توجہ گھر کی طرف بھی دیں۔ میں نے ہی گھر کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔" بڑی بھابی کی آواز پر چائے اندر لاتی شاہ نور ٹھٹک گئی۔ داؤد صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ایک نظر بیگم کو دیکھا اور......

کبھی کبھی زندگی یوں بھی مہربان ہو جاتی ہے کہ......

"دل کی مثال بھی اُس چنری جیسی ہوتی ہے جو کسی بھی رنگ میں رنگ سکتی ہے۔ کبھی محبت کے سرخ رنگ لیے خوشنما تو کبھی نفرت کے رنگ میں ڈوبی زرد اور کبھی نا اُمیدی اور بدنصیبی کی سیاہ چادر تانے ہوئے۔ تمھیں کون سا رنگ پسند ہے؟"

اُس نے بات کرتے ہوئے اچانک ہی سوال کر ڈالا اور شاہ نور جو اُس کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی چونک پڑی اُس نے سرد آہ بھرتے اُس کی گہری کالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچا کہ وہ تو بس دل کے زرد و سیاہ رنگ سے ہی واقف ہے۔ اسی اثنا میں گھنٹی بجی اور وہ دونوں اپنی کلاس لینے چل پڑے۔

چلتے چلتے عائش نے کہا۔ "تمہارا جواب اُدھار رہا۔" اور شاہ نور یہ سُن کر مسکرادی۔

وہ ایسا ہی تھا شوخ، بے فکر سا، اپنی ذات میں مگن۔ ہر کسی کی دلجوئی کرتا ہوا۔ وہ سب کا پیارا تھا۔ شاہ نور اُسے دیکھتی تو سوچتی وہ بنا ہی محبت کے لیے ہے۔ اک وہ تھی...... زندگی سے بے زار، اُکتائی ہوئی، اپنی ذات سے ناخوش۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ وہ تو بہت بولنے والی ذہین و فطین لڑکی تھی، مگر جب تک اُس کے بابا جانی حیات رہے تب تک۔ اُس کی ماما بچپن میں ہی اُسے اور تین بھائیوں کو چھوڑ کے اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی تھیں۔ بس پھر بابا ہی تھے جنھوں نے اُنہیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

اُسے یاد تھا کہ وہ اُس کے لیے ہر مصیبت میں ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ اُسے کبھی زمانے کی گرم ہوا نے چھوا تک نہ تھا۔ وہ اُس کے لیے سائبان تھے۔

اُن کے رخصت ہوتے ہی حالات نے اُسے زندگی کے تپتے صحرا میں نہایت بے دردی سے لا پٹخا تھا۔ بابا جانی کی ناگہانی موت نے اُسے بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ وہ اُسے تنہا چھوڑ کے جا چکے تھے۔

اُس پر ستم ظریفی یہ کہ اپنے خونی رشتوں کا وہ روپ دیکھنے کو ملا کہ جس نے شاہ نور کے ہوش اُڑا دیے۔

بابا جانی کے سوئم کے دوسرے روز ہی شاہ نور کے تینوں بھائی بحث و مباحثے میں مشغول تھے اور

بھابیاں بھی اِس میں پیش پیش تھیں اور زیر بحث شاہ نور کی اپنی ذات تھی۔

بڑے بھیا نے کھنکھار کے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں میری بات سمجھ سکتے ہو۔ میں فوری طور پر اسلام آباد میں شاہ نور کو نہیں رکھ سکتا کیونکہ گھر ابھی بنا ہے اور اتنی جلدی 'سیٹنگ' نہیں ہو پائے گی اور ابھی شاہ نور کی پڑھائی کا ایک سال باقی رہ گیا ہے اور کالج کراچی میں ہے۔'' سعود بھائی نے بیوی کی طرف دیکھا جو برو اُچکا کر انہیں خبردار کر رہی تھیں اور بولے۔

''بھائی صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ میرا تین کمروں کا فلیٹ ہے اور تین بچوں کا ساتھ! میں کہاں سے اپنے گھر میں گنجائش نکال پاؤں گا اور پھر نادیہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ کس طرح سے سب کا خیال رکھے گی۔''

''اے میاں! تم تو لے جاسکتے ہو، نئی نئی شادی ہوئی ہے اور تم دو ہی تو ہو۔'' سعود بھائی اس اچانک حملے سے گھبرا گئے پھر کچھ سنبھلتے ہوئے کہنے لگے۔

''نہ...... نہ میرا مطلب ہے کہ میں کیسے لے جاسکتا ہوں؟ میں نے کچھ دن پہلے ہی اپنی لائف اسٹارٹ کی ہے۔ نیا بزنس ہے اور ویسے بھی میں اپنے سالے کے گھر میں رہتا ہوں اور میری بیوی ذرا الگ مزاج کی ہے۔ وہ شاہ نور سے کھل مل نہیں پائے گی اور شاہ نور میرے گھر میں خوش نہیں رہ سکتی۔'' انہوں نے اپنی بات روانی سے کہی اور ایسا انداز اپنایا جیسے اب کچھ بولنے اور سننے کی ضرورت باقی نہ ہو۔

کمرے کی فضا اپنوں کی آوازوں سے گونج رہی تھی اور دروازے کے باہر شاہ نور ساکت کھڑی یہ سب سُن رہی تھی۔ اُسے اپنے وجود میں سناٹے اُترتے محسوس ہوئے۔ اُس کا خون منجمد ہونے کو تھا۔ رشتوں کے بھرم کا 'شیش محل' دھڑام سے نیچے آن گرا اور اُس کی گونج میں ساری آوازیں دب گئیں، ساتھ میں وہ بھی!

ایک طویل بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک شاہ نور کی پڑھائی کا ایک سال پورا نہیں ہو جاتا وہ سعود بھائی کے ساتھ رہے گی اور ایک سال کے بعد اسلام آباد بڑے بھائی داؤد کے پاس چلی جائے گی۔ اسے یہ خبر بڑے بھائی نے دی۔ کچھ دیر تک شاہ نور یوں ہی بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ بالکل اس طرح کہ جیسے وہ بے جان وجود ہو جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ ہو۔

☆......☆......☆

دوران سفر نادیہ بھابی نے ایک بار بھی اُسے مخاطب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ ٹیکسی کے رُکتے ہی اُتر کر اپنا بھاری بھرکم سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے، فلیٹ کے داخلی دروازے کی جانب، بھاگنے کے سے انداز میں جانے لگیں۔ سعود بھائی نے بھی اُن کی تقلید کرنا ضروری سمجھا اور کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ شاہ نور اپنا سامان اُٹھائے کس بے بسی سے اُن کی پشت دیکھ رہی تھی۔

شاہ نور نے فلیٹ میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے وہ کسی کباڑ خانے میں کھڑی ہو۔ کمرہ خاصا ابتر حالت میں نظر آ رہا تھا نہ جانے کب سے اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی جابجا چیزیں بکھری ہوئی تھیں وہ تو سدا کی صفائی پسند تھی۔ مگر اب وہ سعود بھائی اور بھابی کے رحم و کرم پر تھی۔

سعود بھائی نے اُس کی اُلجھن بھانپ لی اور کھسیاتے ہوئے بولے۔

''دراصل تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے گھر کا یہ حال ہوا ہے۔ ورنہ وہ سارا کام خود کرتی ہے۔ چلو اب تم آ گئی ہو تو اِس بیچاری کی بھی کچھ مدد ہو جایا کرے گی اور کچھ آرام ملے گا۔'' شاہ نور نے اثبات میں سر ہلایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تا کہ سامان رکھ سکے، مگر اسے کمرے میں کوئی جگہ نظر نہ آئی تو اُس نے سوٹ کیس الماری کے ساتھ لگا کر رکھ دیا۔

''پہلے تم ذرا چائے بنا دو، پھر اِس کمرے کی حالت درست کر لینا۔ تمہاری بھابی تو سفر کر کے نڈھال ہو جایا کرتی ہے۔'' بھائی کی بات سن کر اُس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور کچن کی جانب چل دی جس طرف بھائی نے اشارہ کیا تھا۔

کچن میں آتے ہی وہ چکرا گئی۔ اُف میرا خدا! وہاں کا منظر بھی کمرے سے مختلف نہ تھا۔ اُس نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے کچن صاف کیا اور چائے بنانے لگی۔ اس پل اسے بابا جانی بے طرح یاد آئے اور وہ سسک پڑی۔

☆......☆......☆

پھر یہ روز کا معمول بن گیا کہ وہ سارا کام کرتی کیونکہ نادیہ بھابی ہمیشہ بیمار رہتیں۔ کبھی سر درد، کبھی کمر درد، اب تینوں بچیوں کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ وہ صبح فجر کے وقت اُٹھتی، نماز پڑھتی اور سب کا ناشتا بنا کر بچوں کی تیاری کروا کر، خود بھی کالج جاتی۔ دوپہر میں آ کر کھانا بناتی۔ غرضیکہ سب کچھ اُس کو ہی کرنا تھا۔

وہ اکثر سوچتی کہ شاید قدرت نے اُس کو اِن ہی کاموں کے لیے چُنا ہے۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور ایک سال ہونے کو آ گیا تھا۔ اس دوران بڑے بھائی نے اُسے تقریباً بھلا ہی دیا۔ پھر بھی اپنے وعدے کے مطابق وہ اُسے لینے آ گئے تھے، اور وہ اک بار پھر وقت کے دھارے میں بہنے کو تیار تھی۔

☆......☆......☆

بڑے بھائی کا گھر، سعود بھائی کے گھر کے مقابلے میں قدرے بڑا اور اچھا تھا۔ اُس کے آنے سے بڑی بھابی کی ناخوشی اُن کے ہر ہر انداز سے عیاں تھی۔ خوش تھا کوئی، تو بس اُس کی بھتیجی اسمارہ جو عمر میں اُس سے 2 سال چھوٹی تھی۔ وہ قدرے لاأبالی طبیعت کی مالک تھی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی تھی۔ شاہ نور کو اُس کا وجود غنیمت لگا تھا کیونکہ بھائی تو بس لیے دیے رہنے والے بندے تھے اور بھابی کو اُس کا وجود نظر ہی نہ آتا تھا۔ مگر اسمارہ اُس کو بات کرنے اور اپنے خول سے باہر آنے کے لیے مجبور کرتی اور اُسے آگے پڑھائی جاری رکھنے کا کہتی۔

ایک شام وہ چائے کے لوازمات ٹرے میں سجائے، ٹی وی لاؤنج کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک کسی سے ٹکرا گئی اور ٹرے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گئی۔ اُس نے اُس شخص کو دیکھا جو ٹرے کرنے کے بجائے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر جا کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے اسمارہ سے پوچھا اور گہری نظروں سے شاہ نور کو دیکھا جو کانچ کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اٹھا رہی تھی۔

''یہ محترمہ کون ہیں؟ کیا کوئی مہمان ہیں؟'' وہ اب تک کانچ کے ٹکڑے جمع کرنے میں لگی تھی۔

''یہ مہمان نہیں۔ میرے پاپا کی بہن ہیں یعنی میری پھوپو۔''

''کیا......؟'' وہ ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ خجل سی ہو گئی اور جلدی سے کچن کی طرف جانے لگی۔

''یہ تمہاری پھوپو ہیں۔'' اس کی حیرانی دور نہیں ہو رہی تھی۔ ''مگر یہ تو تمہاری چھوٹی بہن لگتی ہے۔''

''ہاں، ہم میں زیادہ فرق نہیں ہے۔''

''فرق تو ہے تم مغربی طور طریقوں والی ماڈرن گرل اور وہ اک مشرقی انداز لیے سادہ سی لڑکی۔''

''اچھا چند لمحوں میں اتنی گہری نظروں سے جانچ بھی لیا۔''

بعد میں اُسے اسمارہ کی زبانی پتا چلا کہ اُس کا نام عائش تھا اور وہ بھابی کا بھتیجا تھا، یعنی اسمارہ کا کزن۔ وہ ہر روز یہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اور اسمارہ بچپن کے دوست تھے اور ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

عائش بڑی بھابی کا بہت لاڈلا تھا۔ بھابی اُس پہ صدقے واری ہوتیں۔ اسمارہ اُسے اُس کی باتیں بتاتی اور وہ سوچتی کہ اسمارہ کتنی خوش قسمت ہے۔ سب کچھ ہے اُس کے پاس، ماں باپ، عالیشان گھر اور اتنا پیارا دوست جو ہر قدم پر اُس کے ساتھ تھا۔ مگر کوئی تہی دامن تھا تو بس وہ تھی۔

☆......☆......☆

شاہ نور ہر گزرتے دن کے ساتھ خود میں واضح تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ سرِ شام جانے کیوں انتظار کی سوئی اُس کے دل میں ٹک ٹک کرتی اور عائش کے آتے ہی اُسے در و دیوار میں زندگی کی رمق نظر آتی۔ جس دن وہ نہ آتا وہ جلے پیر کی بلی بنی پورے گھر میں پھرتی۔ اب وہ خود کو آئینے میں دیکھا کرتی، اچھی خاصی پیاری لگتی اسے اپنی صورت وہ چپکے چپکے اور سنورنے لگی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے خود کو دیکھنے کی وجہ ملی تھی۔ وہ مسکرانا چاہتی تھی، بولنا چاہتی تھی اور اپنی اس تبدیلی سے بہت خوش تھی مگر وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

☆......☆......☆

شاہ نور بھی اپنی تعلیم پوری کرنا چاہتی تھی مگر بھابی سے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ اسمارہ نے بھرپور ساتھ دیا اور عائش کی کاوشوں سے وہ ان دونوں کے ساتھ یونیورسٹی جانے لگی۔ وہاں وہ پڑھتے بھی اور باتیں بھی کرتے عائش کو یہ سادہ سی لڑکی بہت بھاتی اور اُس کے ساتھ وقت گزارنا اُسے اچھا لگتا۔

☆......☆......☆

''اسمارہ اب شادی کے قابل ہو گئی ہے داؤد صاحب! آپ کچھ توجہ گھر کی طرف بھی دیں۔ میں

نے ہی گھر کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔'' بڑی بھابی کی آواز پر چائے اندر لاتی شاہ نور ٹھٹک گئی۔

داؤد صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ایک نظر بیگم کو دیکھا اور پھر سے کتاب میں کھو گئے۔

''آپ سن رہے ہیں نا داؤد صاحب!'' بڑی بھابی نے پھر اُن کو ٹوکا۔

''ہوں! سن رہا ہوں کہیے، کیا بات ہے؟''

''میں اسمارہ کی شادی عائش سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے وہ اسمارہ کے لیے ہمیشہ سے ہی پسند ہے اور میں چاہتی ہوں اب جبکہ وہ برسرروزگار ہے تو شادی کے بندھن میں بندھ جائے۔''

''ٹھیک ہے بیگم! جیسے آپ کی خواہش، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' بیگم داؤد شوہر کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی شادی کی تیاریوں کے بارے میں سوچنے لگی تھیں، جبکہ برآمدے میں کھڑی شاہ نور کی زندگی، اُس کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی کی طرح سرد ہوچکی تھی۔

☆......☆......☆

شاہ نور اک بار پھر اپنے خول میں بند ہوچکی تھی۔ اسمارہ اور عائش اُس کے رویے پر حیران تھے۔ وہ اب کم ہی بات کرتی۔ عائش کے آتے ہی کمرے میں بند ہوجاتی۔ عائش نے بہت بار کوشش کی کہ وہ بات کرے مگر اُس کی چپ کا قفل نہ ٹوٹا۔

''نہ جانے کیا مسئلہ ہے تمہاری پھوپو کو؟ مجھ سے وہ بات کیوں نہیں کرتی؟ کیوں اس طرح خاموش ہے؟''

''عائش! وہ ایسی نہیں ہیں مگر ان کے رویے سے میں بھی حیران ہوں کہ آخر ہوا کیا کہ وہ دوبارہ اتنی بے زار اور خاموش ہوگئی ہیں۔ آنکھیں بھی سوجی سوجی رہتی ہیں جیسے روتی رہی ہوں۔''

☆......☆......☆

بڑی بھابی نے اپنے طور تیاریاں شروع کردی تھیں وہ بہت خوش تھیں اور ستم تو یہ تھا کہ وہ شاہ نور کو بھی ان کاموں میں ساتھ رکھتیں۔

ایک روز بڑی بھابی اپنی الماری سے جہیز میں رکھے جانے والے کپڑے شاہ نور کو دے رہی تھیں کہ اسمارہ اُن سے کچھ پوچھنے آئی اور سامان دیکھ کر ٹھٹک گئی، پوچھنے لگی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' شاہ نور اُٹھ کر کپڑے پریس کرنے چل دی۔

''یہ جہیز کا سامان ہے۔'' بڑی بھابی نے سرسری بتایا۔

''اوہ! اچھا کیا ہم شاہ نور کی شادی کررہے ہیں؟ واؤ کتنا مزہ آئے گا۔'' بڑی بھابی نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

''یہ تمہاری شادی کا سامان ہے۔''

''اصولاً تو پہلے شاہ نور کی شادی ہونی چاہیے اور ویسے بھی میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں۔''

''ہمیں کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں، یہ فیصلہ تم نہیں ہم کریں گے۔ تمہیں بس وہ کرنا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کس سے کرلوں شادی؟''

''ارے لڑکا تمہاری پسند کا بھی ہے اور اچھا بھی۔''

''کون ہے وہ؟''

''عائش۔''

''عائش نہیں ماما! وہ صرف میرا دوست ہے۔''

''ہاں تو کیا ہوا! تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو اور ایک ساتھ خوش رہتے ہو اور کیا چاہیے؟''

''ماما! میں عائش کو اپنے بھائی جیسا سمجھتی ہوں اور وہ بھی مجھے بہن کی طرح۔ جانے آپ لوگوں کو ایسا کیوں لگا کہ ہم دونوں ایسی کوئی خواہش رکھتے ہیں۔''

بڑی بھابی کو شاک لگا تھا اور جاتے ہوئے اسمارہ نے رُک کر کہا۔

''ماما! عائش شاہ نور کو پسند کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رُکی نہیں تھی۔

☆......☆......☆

گھر میں تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔
اسمارہ بھی خوش نظر آتی۔ گھر بھی خوب سجایا گیا تھا۔
اُداسی تھی تو بس اُس کے اندر تھی۔ وہ بے جان سی
پورے گھر میں چکراتی پھرتی اور خدا سے دعا مانگتی کہ
خدا اُسے کسی اور امتحان میں نہ ڈالے۔

دلہن کی چیزیں اُس کے سامنے پڑی تھیں اور
اُس کے آنسو اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں خود سے اُلجھ رہی تھی کہ بڑی
بھابی اور اسمارہ اندر داخل ہوئیں اور پہلی بار بھابی
نے اُسے پیار سے دیکھا تھا اور قریب آ کر بیٹھ
گئیں۔ وہ کچھ کچھ حیران تھی کہ ایسا کیونکر ہوا؟ بھابی
نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ نور بیٹا! تم میری بیٹی جیسی ہو اور آج سے میں
تمہاری ماں ہوں۔'' شاہ نور اچانک اِس بات پر چونک
پڑی۔ عرصہ ہوا تھا اُسے پیار بھرے لمس کا مزہ چکھے ہوئے۔

''بیٹا! ہم کل تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''
بڑی بھابی نے گویا اُس پر بم گرا دیا تھا۔

''میرا نکاح؟ کل تو اسمارہ کی شادی ہے۔''

''اسمارہ ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہے اور ہم
اب تمہارا فرض پورا کرنا چاہتے ہیں۔''

شاہ نور کو تو وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے کی عادت
ہوگئی تھی۔ اُس کی اپنی کیا مرضی؟ اُسے تو بس فیصلہ سنایا
جاتا تھا۔ اُس نے بے بسی سے سوچا اور گردن جھکا دی۔

تب اسمارہ نے پیار سے اس کے گلے میں بازو
حمائل کر دیے۔

''شاہ نور آپ پوچھیں گی نہیں کہ آ کی شادی
کس سے ہو رہی ہے۔''

''نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بے
اختیار بھر آئیں اپنوں نے اتنے دکھ دیے تھے کہ خوشی
بھی دل کے کسی کونے میں بس رویا ہی کرتی تھی۔

''میں جانتی ہوں شاہ نور آپ اپنی ہر تمنا ہر
خواہش کا گلا گھونٹ کر بس دوسروں کے لیے جی رہی
ہیں اور یہ ہی آپ کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ میرے
خیال میں دوسروں کی زندگی جینا بہت بڑی بے وقوفی
ہے۔ اسمارہ کی بات پر بھابی کچھ کھسیا کر کمرے سے باہر
چلی گئی اسمارہ نے شرارت سے اس کی خوبصورت آنسو
بھری آنکھوں کو دیکھا۔ آپ جس حقیقت کو اپنے آپ
سے بھی چھپاتی رہیں میں اس کو جانتی ہوں۔''

''کیا جان گئی ہو تم۔'' شاہ نور نے بہت گھبرا
کر پوچھا۔

''یہ ہی کہ عائش کے بنا آپ کی زندگی ادھوری
ہوگی۔'' اسمارہ کی بات پر اس کا چہرہ سفید ہوگیا۔

''نہیں نہیں اسمارہ پلیز تم غلط......'' لیکن
اسمارہ نے درمیان سے ہی اس کی بات کاٹ دی۔

''بس کر دیں شاہ نور۔ کب تک یوں ڈر ڈر کر
اپنے دل کو مار کر زندگی گزاریں گی۔ سچی بات یہ
ہے کہ آ کی خاموش محبت یک طرفہ نہیں۔ عائش
بھی آپ کی محبت اب اپنے دل میں چھپائے
چھپائے تھک چکے ہیں سو ان کی خواہش پر آپ،
دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے، ان کی بن جائیں گی۔

شاہ نور کی سانسیں جیسے ایک لمحے کو تھم سی گئیں۔
اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی
ہے وہ بس سکتے کہ عالم میں اسمارہ کو دیکھے گی۔ اسمارہ
نے اسے بے اختیار اپنے گلے لگا لیا۔ اللہ بہت رحیم
ہے شاہ نور۔ اور وہ بند ہونٹوں کی دعا بھی بنا کہے جان
لیتا ہے بس جذبے میں سچائی ہونا ضروری ہے۔

اچھا چلیے اب مسکرا دیجیے اور دل سے میاں جی
کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر تھوڑا سا کریڈٹ
مجھے بھی دی دیجیے۔''

اسمارہ کی بات پر شاہ نور نے بھیگی پلکوں کے ساتھ
بے اختیار مسکرانے ہوئے شاہ نور کو گلے لگا لیا تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

لمحوں نے خطا کی تھی

''اتنی فکر مند مت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔'' ''اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو بھنبھوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کرسکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔'' ''تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا''......

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

ٹھنڈی، دودھیا چاندنی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ چاند کی پُرسکون اور رومان بھری روشنی نے ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ رات کی رانی کی مسحور کن مہک اطراف میں بکھری ہوئی تھی۔ خاموش رات اپنے اندر بھید بھرا اسرار چھپائے ہوئے تھی۔ ماحول کی پاکیزگی نے ایک سحر سا طاری کر رکھا تھا۔

وہ لوہے کے اونچے سے تخت پر تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اُس کے پہلو میں اُس کا کیوٹ سا بیٹا لیٹا ہوا تھا جو بمشکل تین، ساڑھے تین سال کا تھا۔

''مما......'' اسد نے کروٹ بدلی تو اِک نرم و گداز، گدگداتا ہوا سا احساس اُس کے رگ وپے میں ممتا کی حلاوت بھرنے لگا۔ اُس نے وارفتگی سے اپنے پہلو میں کسمساتے معصوم اور نازک وجود کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ ڈالا۔ اندر دور تک سکون اُتر گیا۔ وہ یونہی اُسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے دباتی رہی، تھپکتی رہی، محویت سے اُس کے گھنے سیاہ بال دیکھتی رہی، پھر دفورِ جذبات میں اُس نے اپنے ہونٹ بچے کے بالوں پر رکھ دیے۔

''مما......'' وہ سیدھا ہوا۔

''جی جان۔''

''بابا کب آئیں گے۔'' وہ نرسری کا بچہ تھا مگر اُردو بہت صاف بولتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اُس کی مما نے اُس سے اُس وقت باتیں کرنا شروع کردی تھیں جب وہ محض ایک دو ماہ کا تھا۔

''بابا کب آئیں گے۔'' اب کی بار اُس کی معصوم آواز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی تھی۔ ماں کی توجہ نہ پاکر اُس کا غصے میں آنا ایک فطری عمل تھا۔ وہ ماں کی بھرپور توجہ کا عادی تھا۔

''آجائیں گے بیٹا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''بابا آئیں تو میں اُن سے بات نہیں کروں گا۔'' وہ بسوراماں نثار ہونے لگی۔

''کیوں؟''

''بس خفا ہوں میں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر آنکھوں پر رکھ لیں۔

"اچھا میری بات سنو۔" اُس نے بچے کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اُس کے ہاتھوں کو آنکھوں پر سے ہٹایا اور اُسے کہانی سنانے لگی۔ بچہ بہل ہی گیا۔ بچے تو بہل ہی جایا کرتے ہیں۔ کبھی کھلونوں سے، کبھی شہزادے کی کہانی سے، مگر کب تک۔

"مما چاند کتنا خوبصورت ہے نا۔" اُس کا معصوم ذہن اب آسمانوں کی وسعتوں میں سفر کرتے چاند میں اٹک گیا۔ وہ چاند کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اُس کے گلابی پھولوں جیسے ہونٹ پھیلنے سکڑنے لگے۔ آنکھوں میں بے تحاشا روشنی سی بھر گئی اور گال تمتمانے لگے۔

"تم بھی تو چاند ہونا، میرے چاند۔" اُس نے ممتا کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا۔

"وہ چاند زیادہ اچھا ہے مما۔" بچے نے اُفق کی جانب ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"نہیں، میرا چاند اُس چاند سے زیادہ پیارا ہے۔" وہ قطعیت بھرے انداز میں لاڈ سے بولی۔

"نہیں مما، آسمان والا چاند بہت اچھا ہے۔" اُس نے بازو پھیلا کر 'بہت' پر زور دے کر کہا وہ چپ رہی۔

"چاند میں ماموں نظر آتا ہے مما۔" اس کا بچے کے بالوں میں سرسراتا ہاتھ یک لخت رُک گیا۔ ٹھنڈی چاندنی رات اُسے لمحوں میں سلگا گئی۔ اُس کے ہونٹ پل میں خشک ہوئے۔

"چندا ماموں، چندا ماموں۔" وہ خوشی سے تالیاں پیٹتا رہا اور وہ لرزیدہ وجود کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن منتشر ہو کر بے قابو ہو کر بدن میں اُدھم مچا رہی تھی۔ بچہ سو چکا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی اُس کی سانس رُک رہی تھی۔ پیاس کا احساس شدت سے جاگا تھا، یوں لگ رہا تھا حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ اُس نے ایک نظر پُرسکون سوتے بچے کو دیکھا اور اُٹھ بیٹھی۔

"ماموں۔" اُس نے زیرِ لب دہرایا اور اُس کے اندر باہر درد پھیلنے لگا۔ اُس نے لبوں سے نکلتی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ کی ہتھیلی جما دی مگر اُسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ وہ تخت سے اُٹھی اور پاؤں میں چپل اُڑس کر بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی۔ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور لبوں سے لگالی۔ وہ غٹاغٹ بہت سارا پانی پی کر بھی اپنا حلق تر نہیں کر پائی تھی۔ تن من لق دق صحرا بن گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکلی، پاؤں بالکل بے جان ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ویرانی بھری وحشت اُتر آئی تھی۔

"ماموں۔" وہ خشک ہوتے ہونٹوں سے بڑبڑائی۔ اُسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے روشن رات تاریکی کے لبادے میں لپٹی دکھائی دینے لگی۔ وہ اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، خوف اور ڈر کی سرد لہر شریانوں میں بھاگتے دوڑتے گرم جذبات سے لبریز لہو کو جمانے لگی۔

قریب ہی شہتوت کے درخت میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ شاید کوئی پتا گرا تھا، وہ سہم گئی۔ سناٹا اُس کی روح میں اُتر گیا تھا۔ کیسی خاموشی تھی، سرد اور مردہ، تلخ کڑوی، کڑواہٹ زدہ، اُس نے اپنے ٹوٹے بکھرے لرزیدہ وجود کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں چھپا لیا اور آہوں اور سسکیوں کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت دے دی۔ اُن پر اب کوئی بند نہیں باندھا۔

"ماموں" لفظ اُس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دہکتے الاؤ میں جلتا دیکھ رہی تھی۔ درد نے اُسے گھائل ہی نہیں، پژمردہ اور نڈھال بھی کر دیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کے ایک لفظ

'ماموں' نے اُسے اندر تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہول کر رہ گئی۔ زخم خوردگی سے وہ بلبلاتی رہی۔ زخموں سے ٹیسیں اُٹھتی رہیں، روح میں سناٹا چکرانے لگا۔ روتی رہی، کرلاتی رہی، اُس کے اندر دور تک دراڑیں پڑتی رہیں۔

اُس کی دردناک سسکیاں ہولناک سناٹوں میں گونجتی رہیں۔ خاموش فضا میں ارتعاش برپا کرتی رہیں۔ وہ رو رو کر بے دم ہوگئی۔ بے کسی سے اُس نے اپنا سر اپنی ہی گود میں گرا لیا اور بے جان بازوؤں کو اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کے گرد لپیٹ لیا۔ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے آنکھوں کے اندر کسی نے مٹھی بھر مرچیں ڈال دی ہوں۔ اُس کی ہچکیاں وقفے وقفے سے کربناک وحشت زدہ سناٹے میں اُبھرتی رہیں۔ فجر کی اذان کی آواز اُس کی سماعتوں میں پہنچی، وہ چونکی۔ اتنا وقت گزر گیا۔ ساری رات تمام ہوئی وہ بے آواز روتے ہوئے سر اوپر اٹھا کر گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر سیاہ گھور اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ خاموشی اور خوف سرسراتے ہوئے اُس کی ہڈیوں میں اُتر کر اعصاب کو شل کر رہے تھے۔

وہ ابھی تو ذرا سا ہی سکون کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ پائی تھی کہ اُس کے بیٹے کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ نے دل کی دنیا تہہ بالا کر کے دل میں دھواں سا بھر دیا تھا۔ سارا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ سارے زخم ہرے کر دیے تھے۔ وہ اُٹھی اور بے جان قدم واش روم کی طرف بڑھا دیے۔ ابھی اُسے وضو کر کے نماز پڑھنی تھی۔ غرض کے سجدے ادا کرنے تھے۔ خدا کی بارگاہ سے دل کا سکون مانگنا تھا۔

''جسے کہیں سکون اور طمانیت اور خوشی نہ ملے۔ جسے سارا زمانہ دھتکار دے۔ سارا عالم ٹھکرا دے۔ اُسے خدا کی ذات اپنی رحمت کی بانہوں میں پناہ دے کر سمیٹ لیتی ہے۔ سکون عطا کرتی ہے۔ طمانیت سے دامن بھر دیتی ہے۔

جسے کوئی معاف نہیں کرتا، اللہ اُسے بھی معاف کر دیتا ہے، بس مانگنے والے کو مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ اس کے پاس بھی آخری در خدا کا ہی بچا تھا۔ ہر کسی کے پاس آخری در خدا ہی ہوتا ہے جہاں آنسوؤں کو دیکھ کر اندر آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ بہت پسند ہیں خدا کو ندامت کے آنسو۔

☆......☆......☆

''مما۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی مما کی نازک سی کلائی پکڑ کر دھیرے سے ہلائی۔

''مما اٹھو۔'' اب کی بار وہ ذرا زور سے بولا اور اپنی دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اُس کی کلائی زور سے بھینچ ڈالی۔ سختی بھری گرفت سے وہ ذرا سا کسمسائی مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔

''مما اٹھو مجھے بھوک لگی ہے۔'' وہ چڑ کر شور کرنے لگا اور ساتھ ساتھ اُسے ہاتھوں سے مارنے لگا۔

''تم گندی مما ہو، گندی ہو۔'' وہ بیڈ سے اُتر کر چلانے لگا۔ درشتی سے چیزوں کو پٹخنے لگا۔ تبھی اُس کی آنکھ کھلی وہ نافہمی کے عالم میں خالی خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہی، پھر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ شدتِ گریہ اور تمام رات اذیت میں گزارنے کے بعد ابھی تو ذرا کی ذرا اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بے سدھ سوئی پڑی تھی جاگ تو گئی تھی مگر اُس کے اعصاب ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے اور آنکھیں کھولنے سے آنکھوں میں شدت سے جلن اور تپش سمٹ آئی تھی۔

''تم گندی مما ہو۔'' وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا کیوٹ سا گپلو سامنا آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر قہر سجائے اپنی مما کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے الفاظ کیسے تھے۔ دل کو کاٹتے ہوئے دل کو چیرتے ہوئے اُس کی رتجگے کی ماری آنکھیں برسنے لگیں۔ یوں لگا جیسے زخموں پر نمک پاشی ہو رہی ہے۔

’’نہیں، نہیں بیٹا میں گندی مما نہیں ہوں۔‘‘ وہ عجلت میں بیڈ سے اُتری۔ اُس درد کی ماری کا نازک سا پاؤں بیڈ کی چادر میں اُلجھ کر رہ گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اوندھے منہ فرش پر گری تھی۔ اُس کی پیشانی ماربل کے چکنے فرش سے ٹکرائی اور پیشانی پر گومڑ سا اُبھر آیا۔ وہ کمرے کے وسط میں بکھری پڑی بس ’سی‘ کر کے رہ گئی۔ وہ بچہ جو چند لمحے پہلے غیظ و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اب بدحواس ہو کر رونے لگا۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی مما کو فرش سے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

’’مما اُٹھیں۔‘‘ وہ فکرمندی سے بولا۔ تبھی بشیراں (ملازمہ) اندر آئی اور اُسے نیچے گرے دیکھا تو لپک کر سامنے آئی اور سہارا دے کر اُسے اٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ اُس کے ٹخنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ پاؤں میں بہت درد محسوس کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

’’باجی صاحب کو فون کروں؟‘‘ بشیراں نے پاس بیٹھ کر کہا مگر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اسے منع کر دیا۔

’’باجی آپ کا تو ٹخنا بری طرح سے چھل گیا ہے، درد بھی ہو رہا ہوگا۔‘‘ بشیراں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کا سفید گلابی مائل پاؤں اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہولے ہولے دبانے لگی۔

’’باجی ذرا دیکھیں تو خون رس رہا ہے، آپ کہو تو فون کر دیتی ہوں۔ شہر سے آتے ہوئے صاحب کوئی دوائی لیتے آئیں گے۔‘‘ بشیراں صحیح معنوں میں اُس کی وفادار اور غمگسار تھی۔ وہ اِس بات سے بخوبی آگاہ تھی بشیراں نیک فطرت خاتون تھی۔

’’رسنے دو خون، میں اِسی قابل ہوں کہ میں در در کی ٹھوکریں کھاؤں، دھکے کھاؤں مگر کہیں کوئی سہارا نہ ملے، کوئی پناہ نہ ملے۔‘‘ اُس نے خود اذیتی کی شدت میں اپنا نچلا ہونٹ کچل ڈالا۔

وہ تو ملازمہ تھی، وہ اُس سے کیا کہتی کہ اُس کے تو اندر اتنے زخم ہیں اتنے گھاؤ کہ جن کا شمار ممکن ہی نہیں اور برسوں سے اُن زخموں سے خون رس رہا ہے اور کون جانے کب تک رستا رہے گا۔

فاخرہ جبیں صرف سوچ کر رہ گئی۔ بولی کچھ بھی نہیں، بس بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی رہی اور ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ بشیراں بغیر کہے اُس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ آنسو فاخرہ کی بند آنکھوں کی گھنی سیاہ پلکوں کو بھگوتے رہے۔ وہ اپنی ذات میں کتنی اکیلی تھی کوئی اس سے فاخرہ سے پوچھتا آنسوؤں کا پانی قطرہ قطرہ اُس کے سفید گالوں پر بہنے لگا۔ اُس نے اپنے گال صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یونہی بے آواز روتی رہی۔ بشیراں نے ترحم آمیز نظروں سے فاخرہ کو دیکھا اُس کا دل اپنی مالکن کی بے سروسامانی پر بھر آیا۔ اتنی حسین عورت کہ جسے دیکھ دیکھ کر دل نہ بھرے، اتنے مصائب اور کٹھن نامساعد حالات نے بھی اس کے صبیح چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مضموم و آرزدہ عورت جس کا من اور تن دونوں ہی لہولہان تھے مگر اُس کے چہرے کی تازگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

بشیراں نے فاخرہ کے دل نواز نقوش کے سحر سے بمشکل نظریں چرائیں اور کچھ سوچ کر اُٹھی اور مختلف درازیں کھنگالنے لگی کہ کوئی مرہم مل جائے کوئی کولڈ کریم ہی مل جائے تاکہ وہ اُس کے زخمی گھٹنے پر لگا دیتی۔ مگر بہت تلاش بسیار کے باوجود بھی کوئی دوا، کوئی مرہم نہیں ملا تھا۔

’’باجی میں کوئی دوا ڈھونڈ رہی تھی تاکہ آپ کے لگا دوں مگر ملی ہی نہیں۔‘‘ بشیراں دوبارہ فاخرہ کی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی۔ جواباً فاخرہ نے کچھ نہیں کہا تھا بس سسکتی رہی آہیں بھرتی رہی۔

زمان کو پچھلے دو دن سے بخار تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی اُسے آ کر لے گیا تھا تاکہ اُسے دوائی لے دے

اور رات کو واپس چھوڑ کر جانے کی بجائے اپنے گھر ہی لے گیا تھا۔

''تیری ٹانگیں ٹوٹ تو نہیں گئیں جو یوں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے دبوا رہی ہے۔ بچہ باہر بھوکا روتا پھر رہا ہے۔ اِدھر سوگ منانے سے ہی فرصت نہیں ہے۔''

زمان کی ماں نے کمرے میں آتے ہی جو یہ منظر دیکھا مانو اُس کے سر سے لگی پیروں تک چلی گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر فاخرہ کے کالے سیاہ بال اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ کر اتنی زور سے کھینچ لیے کہ فاخرہ کی درد سے جان نکلنے لگی۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کرسکی۔ فاخرہ کی ٹانگیں سکڑ کر پیٹ سے آن لگیں۔ اُس کا وجود گٹھڑی بن گیا۔ ڈری سہمی کپکپاتی گٹھڑی فاخرہ کے بال چڑیا کا گھونسلا بن چکے تھے۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اُس عورت نے (جو فاخرہ کی ساس اور اُس کے شوہر زمان کی ماں تھی) یہاں تک بس نہیں کیا اب وہ قہر کی طرح برسی تھی۔ اُس نے فاخرہ کی کمر پر دوہتھڑ مارنا شروع کردیے مارتی رہی۔ پھر اُس کا سکڑا سمٹا وجود کسی غلیظ ڈھیر کی طرح پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ فاخرہ کا سر زوردار آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرایا تھا مگر فاخرہ نے سی تک نہیں کی تھی۔ کراہنا یا تڑپنا، بلکنا تو درکنار اُس نے تو ایک آہ بھی نہیں بھری تھی۔ اب وہ ظالم خرانٹ عورت اُسے اپنے سخت پیروں سے ٹھوکریں مار رہی تھی۔ فاخرہ بے حس وحرکت یوں پڑی تھی جیسے اُس کے اندر سانس باقی ہی نہیں رہی ہو۔ زندگی نے اُکتا کر اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ہو کہ اے کمزور عورت! تیرے جیسی بے حس عورت کو میری ضرورت ہی نہیں، تو ٹھیک ہے مجھے بھی تیرے ساتھ نہیں رہنا۔''

''تُو اچھی بیوی تو کبھی بن ہی نہیں سکی اور بن بھی نہیں سکے گی، مگر اچھی ماں تو بن کر دکھا گھٹیا عورت۔ تُو تو ناگن ہے ناگن، جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔''

اِس بات پر فاخرہ نے زور سے بند کی ہوئی آنکھیں کھولیں اور ایک ایسی نظر سامنے کھڑی عورت پر ڈالی کہ وہ پل بھر کے لیے فاخرہ کے تیور بھانپ کر سٹپٹا کر رہ گئی۔ کیسی وحشت در آئی تھی فاخرہ کی آنکھوں میں، جیسے وہ اُسے کچا چبا ڈالے گی۔

''میرے بچوں کے سامنے میری تذلیل مت کرو خالہ! مجھے معاف کردو۔ میری اولاد کی نظروں میں مت گراؤ مجھے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے! مجھے اپنی اولاد کی نظروں میں حقیر مت کریں۔'' فاخرہ اُس کے قدموں سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رودی۔ بشیراں سے اُس کی یہ حالتِ زار دیکھی نہیں جاتی تھی مگر اُس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اُس کو سہارا دیتی اِس وقت۔

''اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ ذرا بدکردار عورت! تُو ہے اس قابل کہ تجھے معاف کردیا جائے۔'' اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے فاخرہ کے منہ پر پاؤں سے ٹھوکر ماری، نرم گال پر ضرب لگی تھی۔

''اور تُو سوے کس چکر میں بہا رہی ہے۔ کان کھول کر سُن! تجھے اس حرافہ کی تیمارداریوں کے لیے نہیں رکھا گیا ہے کہ تُو اِس عورت کے ناز نخرے اٹھائے، اس کی ناز برداریاں اٹھائے۔'' اب اُس مرد مار عورت کا روئے سخن بشیراں کی طرف ہوا۔ اُسے بشیراں کی خیر خواہی بری طرح کھٹکتی تھی۔

''مت بھولو کہ تمہیں اس عورت کی خبر گیری کے لیے رکھا گیا ہے۔ تمہیں ہر وقت سائے کی مانند اس کے ساتھ رہنا ہے۔ اس کے پل پل کی رپورٹ مجھے دینی ہے اور اس کے لیے میں تمہیں تنخواہ دیتی ہوں، لہٰذا تمہیں اس عورت سے ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تم۔'' اُس نے بے حس وحرکت کھڑی بشیراں کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس عورت کا طنطنہ، اس عورت کا گھمنڈ نجانے کیا دن دکھانے والا تھا۔

''دادو مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ مجھے کچھ کھانے کو دے دیں۔'' اسد زمان اُس کی ٹانگوں سے لپٹا کہہ رہا تھا۔ اُس عورت سے جو ڈائن تھی سفاک ہونے کی حد تک ظالم تھی۔

''اپنی ماں سے مانگ، جیسی تیری ماں ویسا تُو ناگن کا سنپولیا۔'' وہ بکتی جھکی منہ سے کف اُڑاتی، پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ بشیراں نے لپک کر اسد کو گود میں اٹھالیا جو بھاں بھاں کر کے رو رہا تھا۔

☆......☆......☆

زمان احمد کا بھائی رحمان احمد، زمان کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔ دو کمروں کا نیم پختہ گھر، ذرا سا کچن۔ دروازے کے سامنے رکشہ رکنے کی آواز آئی تھی پھر کسی نے دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا تھا۔ صبا اور فضا ابھی اسکول سے آئی تھیں جبکہ اسوہ اور اسد چھوٹے سے ایک کھلونے کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ دروازہ پھر سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے والے کے انداز میں عجلت ہی نہیں ایک محسوس کی جانے والی جارحیت بھی تھی۔ صبا اور فضا ٹی وی کی آواز فل کھولے اپنی اچھل کود میں لگی ہوئی تھیں۔ اماں دوسرے کمرے میں اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھائے بے خبری کی نیند سو رہی تھی، گہری نیند۔ ایسی پُرسکون نیند کہ لگتا نہیں تھا کہ جلد اُس کی آنکھ کھلے گی اور باہر رحمان دروازہ توڑ دینے کے درپے تھا۔ اُسے غصہ آ رہا تھا، بہت آ رہا تھا بے تحاشا غصہ مگر کس پر...... فاخرہ جبیں پر، اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بند دروازے کے پار فاخرہ کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر نوچ کھسوٹ ڈالے، خراشیں ڈال دے۔

''بدبخت عورت نجانے کیوں دروازہ نہیں کھول رہی۔'' زمان نے دروازے پر زوردار لات مار کر تنفر سے کہا۔ جو طیش رحمان کو فاخرہ پر آ رہا تھا ویسا ہی تاؤ زمان کو بھی آ رہا تھا۔ سب کو فاخرہ پر غصہ آتا تھا اور سب بلا دریغ اظہار بھی کرتے تھے۔ نفرت کا، کراہیت اور حقارت کا۔

رحمان نے زمان کو ذرا سا ٹہوکا دیا پھر کچھ خیال آیا کہ وہ تو دیکھ نہیں سکتا اُس کا مقصد سامنے آتی فاخرہ کی طرف رحمان کی توجہ مبذول کروانا تھا مگر وہ اپنے بڑے بھائی کی بے نور آنکھوں کو محض دیکھ کر رہ گیا۔

''ہوگئے تمہارے سیر سپاٹے ختم۔'' رحمان نے بدتمیزی سے اکھڑ لہجے میں کہا۔ فاخرہ نے استفہامیہ اُسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہنا بھی بے سود ہی ٹھہرتا، کیا فائدہ اپنی حاضر جوابی دکھانے کا، جب کوئی فائدہ ہی نہیں، کیا اُسے نظر نہیں آ رہا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ صد شکر کہ دروازہ اندر سے کھل گیا۔ خالہ اماں آنکھوں میں نیند کا خمار لیے کھڑی تھیں۔ سب کو ایک نظر باری باری دیکھا، فاخرہ نے، قہر آلود سلگتی نظروں سے، اندر تک کاٹتی نگاہیں، پھر اُن کی نظریں تپے ہوئے رحمان پر رکیں جو پہلو بدل رہا تھا، اُس کے ساتھ چپکا زمان۔

''سلام اماں۔'' رحمان نے لٹھ مار انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، آ جا پتر اندر آ۔'' وہ درمیان اٹکی تھی دروازے کے، ذرا سا سائیڈ پر کھسکی۔

''مجھے اندر نہیں آنا، بھائی کو اندر لے جاؤ۔'' وہ یوں ہی اکڑا اکڑا بولا فاخرہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

خالہ اماں نے زمان کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف مڑیں، جاتے ہوئے رحمان نے ایک کٹیلی سرد نگاہ فاخرہ پر ضرور ڈالی تھی۔ یہ اُس کے سسرالی رشتے تھے جن کے لیے فاخرہ ایسی ہستی تھی جس میں زمانے بھر کی خامیاں تھیں۔ اُس کی ہر خامی ناقابلِ برداشت، اُس کی ہر غلطی ناقابلِ تلافی اور اس کا میکہ......

فاخرہ نے آتے ہی کپڑے تبدیل کیے اور کھانا پکانے میں جت گئی۔ بشیراں اُس کی مدد کر رہی تھی۔

رات کو وہ گھر کے کاموں سے فراغت پا کر کمرے میں آئی تو دیکھا صبا اسوہ کو ساتھ لگائے تھپک

رہی تھی جبکہ اسوہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر کہانی سننے کی ضد کررہی تھی۔ کھانے کے خالی برتن کمرے کے فرش پر بکھرے پڑے تھے بشیراں کو شاید گھر جانے سے پہلے دھیان نہیں رہا تھا برتن اُٹھانے کا۔

''مما اسوہ ایک ہی بات پر اڑی ہوئی ہے کہ مما سے کہانی سننی ہے جبکہ میں نے کہا بھی کہ مجھے بھی کہانی آتی ہے شہزادی کی اور ظالم جادوگر کی۔'' صبا نے فاخرہ کو دیکھ کر بتایا۔

''بیٹا میں سناتی ہوں کہانی ذرا کمرہ سمیٹ لوں۔'' فاخرہ نے دونوں بچیوں کے یونی فارم چارپائی سے اُٹھا کر الماری میں لٹکائے، اُن کے اسکول شوز اکٹھے کر کے رکھے، اسد کے کھلونے سمیٹے پھر کھانے کے برتن اُٹھا کر کچن میں رکھنے چلی گئی۔ جاتے جاتے ذرا سا دوسرے کمرے میں جھانکا، اسد اپنے باپ کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور خالہ اماں زمان سے باتیں کررہی تھیں۔ فاخرہ کچن میں۔ وہ بھی برتن دھو کر جب اپنے کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کر اُس کا دل ملال سے رونے لگا، فضا اور صبا کے درمیان میں اسوہ سوئی پڑی تھی۔ وہ تینوں ماں کا انتظار کرتے کرتے سوگئی تھیں۔ اسوہ کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اُس کے نازک گالوں پر آنسوؤں کے نشان تازہ تھے۔ فاخرہ کا دل تڑپنے لگا۔ اُس کی مجبور ممتا ہر رات، ہر دن ایسے ہی بلکتی تھی۔ باوجود چاہنے کے بھی وہ اپنے بچوں کے لیے بہت سارا تو درکنار، تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال پاتی تھی۔ اُس نے وہیں اپنی بیٹیوں کے پاس جگہ بنائی اور لیٹ گئی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا کب آنکھ لگ گئی۔ اُس کا نیند میں ڈوبا ذہن ابھی پوری طرح سکون بھی نہیں پاسکا تھا کہ کسی نے اُسے بے دردی سے جھنجوڑ ڈالا۔

''اری بے حس عورت کس قدر ظالم ہے تُو، تیرے شوہر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تُو آرام سے سوئی ہوئی ہے۔ اُٹھ جا اس نمانے کے پاس جا۔'' فاخرہ کا ذہن سوئی جاگی کیفیت میں چیخنے لگا، بدن جو آرام پانا چاہ رہا تھا ذہنی یکسوئی نصیب نہیں ہوئی تو جیسے اعصاب کھنچ کر رہ گئے۔ بدن میں درد کی لہریں سی اُٹھ کر فاخرہ کو بدحال کرنے لگیں۔

''اب جا بھی اُس کے پاس احسان فراموش عورت، قدر کر اُس فرشتہ صفت انسان کی۔'' فاخرہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں زمان اسد کو ساتھ لپٹائے لیٹا تھا۔ جیسے ہی فاخرہ کمرے میں آئی زمان دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پچھلے چودہ سالوں سے فاخرہ کے قدموں کی چاپ سے آشنا تھا۔ اُس کے بدن کی خوشبو زمان کے بدن کا حصہ تھی۔

''تم آگئیں فاخرہ۔'' جیسے ہی وہ بیڈ پر آکر بیٹھی زمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' فاخرہ نے اب دونوں ہاتھوں میں زمان کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''بخار تو اب نہیں ہے مگر بدن میں بہت درد ہے، کروٹ نہیں لی جارہی۔''

''دبادوں۔''

''ہاں دبادو اور تب تک دباتی رہنا جب تک میری آنکھ نہ لگ جائے۔'' زمان نے اپنے ہاتھ سے اسد کے نقوش ٹٹولتے ہوئے کہا۔ وہ اکثر ایسے ہی اپنے بچوں کے نقوش کو چھو چھو کر دیکھا کرتا محسوس کیا کرتا تھا۔

فاخرہ ذرا سا آگے کھسکی اور پیروں کی طرف بیٹھ کر زمان کے پاؤں دبانے لگی۔ فاخرہ نرم گورے ملائم ہاتھوں سے زمان کے گہرے سیاہ پاؤں کو دباتی رہی، اُبھری ہڈیوں والے سخت سوکھے ہوئے پاؤں، فاخرہ کے ہاتھوں میں ہڈیاں چبھتی رہیں فاخرہ کا سر مارے نیند سے بوجھل ہورہا تھا۔ اُس کی پلکیں بار بار جڑ رہی تھیں۔ فاخرہ خود پر جبر کر کے بند آنکھوں سے زمان کو دباتی رہی۔ میٹھی غنودگی نے ایک بار تو اُسے نیند میں پہنچا بھی دیا مگر یہ لمحوں کی بات تھی فاخرہ جھٹکا کھا کر

سیدھی ہو بیٹھی، زمانے بھر کی تھکن اُس کی پور پور میں سما رہی تھی۔

''فاخرہ اِدھر آ میرے پاس۔'' زمان نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ فاخرہ نے ایک آزردہ سی سانس خارج کی اور زمان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آگے ہو کر لیٹ گئی۔ زمان کا ہاتھ کسی لکڑی کی مانند فاخرہ کے بالوں میں سرسرانے لگا پھر اُس کا ہاتھ فاخرہ کے بالوں کی لمبائی ناپنے لگا۔ وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

''تمہارے بال بہت لمبے اور ریشمی ہیں نا۔'' زمان نے یہ سوال ہزاروں بار پہلے بھی پوچھ رکھا تھا۔

''جی بہت لمبے گھنے سیاہ بال۔'' فاخرہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تمہاری پیشانی کیسی ہے۔'' یہ بھی پرانا سوال تھا مگر ہر بار نیا تجسس دبا ہوا ہوتا تھا سوال میں۔

''جی بہت چمکتی ہوئی کشادہ، جیسی بخت آوروں کی ہوتی ہے۔'' فاخرہ نے سسکاری لی اُس کی پیشانی کشادہ روشن تھی مگر وہ بخت آور نہیں تھی مقدر کی سیاہی نے اُسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

''رو رہی ہو کیا؟'' اب زمان کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید وہ رو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اب فاخرہ کے نین نقوش کھوج رہے تھے۔ زمان کے ہاتھ کی انگلی فاخرہ کی آنکھ میں کھب گئی بلا کا درد اٹھا تھا اور آنکھ سے پانی بہہ نکلا۔ فاخرہ کے دل سے کراہوں کا سیلاب اُمڈ چلا آ رہا تھا مگر اُس نے بے دردی سے اپنی آہوں کو ہونٹوں میں ہی دبا لیا اور کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

''فاخرہ مجھے بتاؤ تمہاری آنکھیں، تمہاری ناک، تمہارے ہونٹ کیسے ہیں۔'' زمان کے انداز میں نجانے کیا تھا کہ فاخرہ نے آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اوپر اُٹھا کر زمان کو دیکھا۔ زمان کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخر وہ یہ کیوں پوچھ رہا ہے کرید رہا ہے جستجو تھی کوئی کھوج یا پتا نہیں مگر فاخرہ بے دلی سے بولی۔

''میری آنکھیں بڑی بڑی ہیں، بولتی ہوئی، اپنی طرف کھینچتی ہوئی۔ میری ناک ستواں اور ہونٹ ایسے جیسے تازہ گلاب۔'' زمان کا ہاتھ فاخرہ کے بدن پر سرسرانے لگا۔ پھر زمان اُس سے بدن کے خدوخال پوچھنے لگا۔ اپنا شوہر اپنی ہی بیوی کو کھوجتا رہتا تھا۔

''تم بہت خوبصورت اور مکمل عورت ہو۔'' زمان خمار آلود لہجے میں بولا۔ فاخرہ ٹھٹکی یعنی وہ جاگنے اور جگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ فاخرہ کو اپنا وجود ٹوٹتا بکھرتا محسوس ہو رہا تھا وہ صبح سب سے پہلے اٹھتی تھی اور سب کے بعد سونا نصیب ہوتا تھا۔

''سُنا ہے وہ بھی بہت پُرکشش نوجوان تھا۔'' زمان نے کوئی تیر فاخرہ کے روح و بدن میں اُتارا تھا وہ اب ایسے طنزیہ کاٹ دار جملوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے اب بہت اطمینان سے جواب دے دیتی تھی۔

''جی!! بہت ہینڈسم اور وجیہہ تھا۔''

''یاد آتا ہے نا بہت۔'' زمان کے ترکش میں بہت تیر تھے، اپنے تئیں گھائل کرنے کے لیے۔

''بالکل نہیں قطعی نہیں۔'' وہ زور زور سے ہنسا پھر ہنستا رہا۔

''کہاں وہ پڑھا لکھا ڈیسنٹ مرد اور کہاں میں، میٹرک پاس بھی نہیں عام سا مرد کا لا کلوٹا۔'' وہ پھر ہنسا۔

''ادھورا مرد اندھا مرد۔'' ہاہاہا۔ فاخرہ نے تاسف سے زمان کو دیکھا وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا اور وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا کہاں زمان اور کہاں فاخرہ جیسی، کوئی چیز بھی تو دونوں میں مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ شکل و صورت، تعلیم، ذہانت، کچھ بھی مگر حالات و واقعات تو شاہوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو وہ کیا چیز تھی۔

فاخرہ واش روم سے فارغ ہو کر آئی، گیلے بال سُلجھا کر وہ بس سونے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ کچھ بھی ایسا تلخی بھرا نہیں سوچنا چاہتی تھی جو نیند کو اُس کی

آنکھوں سے کوسوں دور بھگا دے۔

☆......☆......☆

فاخرہ اپنی طاقت، اپنی ہمت اور صبر پر حیران تھی کہ بھلے اُس کا دل اپنوں کے ستم پر اُن کے ڈھائے جانے والے مظالم پر کتنا ہی ماتم کناں ہوتا مگر بند نہیں ہوتا تھا۔ وہ مر کیوں نہیں جاتی تھی۔ روز روز کے مرنے سے ایک بار ہی مر جاتی مگر جینا کتنا ہی دشوار اور دقت طلب ہو، مرنا اُس سے بھی کہیں کٹھن اور ہولناک ہوتا ہے۔ اتنی ذلت، اتنی خواری پر فاخرہ کا تن بدن سُلگتا رہتا۔ اپنی ذات کی پامالی اُسے کاٹتی رہتی، مارتی رہتی مگر اب وہ اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر زندہ تھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی۔ کسی آس، کسی اُمید کے سہارے شاید وہ کبھی معتبر ہو جائے مگر کیا پتا آنے والا وقت فاخرہ جبیں کی چھید بھری جھولی میں کیا ڈال دے۔

فاخرہ جب اُٹھی تو نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہی فجر کی نماز پڑھ پاتی تھی۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ نہیں کھل پاتی تھی۔

فاخرہ نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا۔ آٹا گوندھا اور جلدی جلدی پراٹھے بنانے لگی۔ اتنی دیر میں بشیراں بھی آ گئی۔ اُس نے صبا اور فضا کو جگایا اور اُن کی اسکول جانے کی تیاری کروانے لگی۔ پھر بشیراں بچوں کو ناشتا کروانے لگی۔ فاخرہ نے کپڑے بدلے، چند لقمے زہر مار کیے، آدھا کپ چائے پی، برقع اوڑھا اور سوتے ہوئے اسد اور اسوہ کو پیار کیا اور ایک نظر خالہ اماں کو دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔

باہر رکشہ آ کر رُکا بشیراں نے صبا اور فضا کو اُس میں بٹھا دیا رکشہ چل پڑا۔

فاخرہ کا اسکول قریب ہی تھا دو گلیاں چھوڑ کر اس لیے وہ پیدل ہی جاتی تھیں دونوں۔

''آپ کا پاؤں اب کیسا ہے؟'' بشیراں کے پوچھنے پر فاخرہ چونکی۔ پھر یاد آنے پر بولی۔

''اتنی فکر مند مت ہوا کرو، معمولی سی چوٹ تھی۔''

''اُس دن آپ کی ساس نے میرے سامنے آپ کو مارا۔ اس بری طرح آپ کو بھنبھوڑا اور میں بس دیکھتی رہی۔ کچھ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔''

''تم کیوں ہو رہی ہو شرمندہ، تمہارا کیا قصور بھلا۔''

''آپ خود کماتی ہیں، خود اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہیں، پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ایسے کٹھور اور سنگدل لوگوں کو، جو آپ کو انسان نہیں سمجھتے۔'' وہ سچی مخلص تھی۔

''چھوڑنا نہیں چاہتی، کیونکہ میں اب ایک ماں ہوں، باقی کچھ نہیں، ماں ہونا میرے اندر توانائیاں بھر دیتا ہے۔ میں نئے سرے سے اپنے اندر زندگی کو جوان ہوتے، سانس لیتے دیکھتی ہوں۔ اولاد ہر ماں کا سرمایہ ہوتی ہے۔ میری اولاد بھی میرا اثاثہ ہے، قیمتی اثاثہ، میری کل متاعِ جاں۔'' تبھی اُس کی نظر سامنے رُکی ٹھٹکی اور پھر تھم گئی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ یک ٹک دیکھے گئی یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں پانیوں سے بھر کر دھندلی ہو گئیں۔

''کیا ہوا رک کیوں گئیں؟'' بشیراں نے پوچھا۔

''بس کچھ نہیں۔''

''آپ روز اس گھر کے سامنے رُک جاتی ہیں۔ کس کا گھر ہے یہ۔'' بشیراں نے فاخرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کوئی نہیں، تالا لگا ہوا ہے، میرا یہاں کوئی نہیں رہتا۔'' وہ نم آنکھوں کو مسلتی ٹوٹے قدموں سے آگے بڑھ گئی سامنے ہی سرکاری ہائی اسکول کی عمارت نظر آ رہی تھی وہ اسکول میں سینئر ٹیچر تھی۔ پرنسپل اُس کی مشاورت سے اسکول کے ہر کام کیا کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

عروہ نے تیز آواز میں کمپیوٹر پر ''بلما'' لگا رکھا تھا اور بالکل ہیروئن کے انداز میں اسٹیپ لینا سیکھ رہی

تھی۔ بہت دنوں سے اُس کی پریکٹس چل رہی تھی۔تقریب کا سارا انتظام مس افشاں کررہی تھیں۔ عروہ نے کالج کی تقریب میں ڈانس کرنا تھا۔ امن نے بھی عروہ کے ساتھ اسٹیج پر ڈانس کرنا تھا وہ دونوں کزن ڈانس میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں۔ امن اور عروہ گھر پر اپنے طور پر اکٹھے ڈانس کرکے سیکھتی رہتی تھیں۔ وہ تقریب میں اپنی کارکردگی سے نمایاں نظر آنا چاہتی تھیں۔

عروہ اس وقت کمر کو بل دے دے کر ناچ رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی، مگر وہ تھرکنے میں اتنی گم تھی کہ اُسے دستک کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ ذرا توقف کے بعد دستک دوبارہ ہوئی۔ عروہ کا دھیان بٹ گیا اور اُس کے پاؤں تھم گئے۔

''کون؟'' عروہ نے درشتی سے پوچھا۔

''امن، دروازہ کھولو۔''

''آؤ، اتنی دیر لگادی۔'' عروہ نے امن کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور اندر سے دوبارہ کنڈی لگادی۔

''تمہاری مما کہاں ہیں۔'' امن نے پوچھا۔ نجانے اُسے امن کی مما (تائی جان) سے ڈر کیوں لگتا تھا، عجیب منہ پھٹ سی تھیں۔ پل میں اگلے کو بے عزت کرکے رکھ دیتی تھیں۔

''اپنے 'دورے' پر نکلی ہیں بے فکر رہو۔'' عروہ نے لاپروائی سے کہا اور امن کو آنکھ ماری اور پھر دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

''میری مما آنے نہیں دے رہی تھیں۔ میں بہت مشکل سے بہانے بنا بنا کر آئی ہوں۔''

''چل چھوڑ، اپنی اور میری مما کو، اتنے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈانس ہی سیکھنا ہے نا کوئی فلموں میں تو کام کرنے نہیں جارہی ہیں ہم دونوں۔'' عروہ ایسی ہی تھی۔ لاپروا من موجی، کسی کی نہیں سنتی تھی۔

''دراصل یار میں نے مما کو بتایا نہیں ہے نا کہ مجھے کالج فنکشن میں ڈانس کرنا ہے، چوری چھپے حصہ لے لیا، میری مما کو جانتی تو ہو کہ ذرا سخت طبیعت کی ہیں۔''

''چل چھوڑ! پرال کر ساری فکریں۔'' کہتے ہی عروہ نے ایک بار پھر 'بلما' تیز آواز میں لگادیا۔ عروہ تو خیر سرے سے اپنی ماں کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ امن اپنی مما سے ذرا سا ڈرتی تھی مگر اس وقت بلما کی چھنک اور سُر میں وہ بھی سارے ڈر اور خوف دل سے نکال چکی تھی۔

''اُووف تھک گئی۔'' امن نے پنکھا فل اسپیڈ میں چلایا اور صوفے پر بے دم ہوکر گر گئی۔ اُس کی پوری قمیض پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ وہ تھک چکی تھی مگر لگن ابھی باقی تھی۔ یہی حال عروہ کا تھا دونوں ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے۔ تھری سیٹر صوفے پر وہ دونوں پڑی ہانپ رہی تھیں۔

''پھر ناچیں۔'' ذرا سی سانس بحال ہوئی تو عروہ نے پوچھا مگر امن نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انکار کردیا۔

''نہیں یار ذرا بھی سکت نہیں، کل آؤں گی۔'' امن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ باہر نکلی تو دیکھا فروا اپنے سامنے پالک کا ڈھیر لگائے خود کسی سے فون پر باتیں کررہی تھی۔

''ہیلو فروا آپی کیسی ہو؟'' امن فروا کو سامنے پا کر بوکھلا گئی۔ وہ بھی تائی جان جیسی ہی تھی۔

''ہوگیا ناچ گانا۔'' فروا نے خشمگیں نگاہوں سے امن کو گھورا، وہ ٹپٹا گئی۔ اُس کو خدشہ لاحق ہوا کہیں فروا اُس کی مما کو نا بتادے یہ سوچ کر امن کے اوسان خطا ہونے لگے۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ فروا کی گھورتی نظروں سے خائف ہوکر بھاگی۔

''اپنی مما کی آنکھوں میں دھول جھونکنا خوب سیکھ گئی ہو۔'' وہ طنز سے باز نہیں آسکتی تھی۔ امن جانتی تھی کہ فروا کا عروہ پر تو بس نہیں چلتا تھا مگر امن کو جلی کٹی سنانے پر تلی رہتی تھی اور امن دوبدو جواب نہیں دیتی تھی

کچھ بھی تھا اتنا لحاظ مروت تو بہر طور اُس میں تھا۔

☆......☆......☆

عروہ اور امن کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں ہم عمر، ہم مزاج ہی نہیں کلاس فیلو بھی تھیں۔ بہاولپور شہر کی مل والی گلی کی رہائشی یہ دونوں کزن ایک پرائیویٹ کالج میں 'آئی کام' فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ کالج میں اُن دونوں کی دوستی ضویا سے ہوگئی جو کسی گاؤں سے پڑھنے کالج میں آتی تھی۔ یہ تینوں کالج میں ہر وقت اکٹھی نظر آتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے مگر کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کو آپس میں بہت زیادہ بات چیت کرنے کی اجازت تو نہیں تھی۔ گھلنا ملنا تو در کنار، بس سب اسٹوڈنٹس اسٹڈی کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ لیکچر کے حوالے سے ڈسکشن ہوتی تھی۔

مگر کھلم کھلا گھومنا پھرنا یا عامیانہ گفتگو کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی بہت سارے لڑکے لڑکیوں نے خفیہ دوستیاں گانٹھ رکھی تھیں۔

دونوں ہی واجبی سی شکل وصورت کی تھیں۔ پڑھائی میں بھی بس اتنی ہی اچھی تھیں کہ پاسنگ مارکس لے لیتی تھیں، اُن کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

اُس دن جب جھلسا دینے والی دھوپ نے اُن کی رنگت جھلسا کر رکھ دی تھی۔ سورج بادشاہ اپنی پوری آب وتاب اور طمطراق سے اُن پر سایہ فگن تھا۔ عروہ اور امن نے اپنی فائلز کا چھجا سا بنا کر آنکھوں پر تان رکھا تھا وہ کینٹین جا رہی تھیں۔

''میں نے تو صبح بھی ڈھنگ سے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس وقت شدید بھوک لگی ہے۔'' عروہ نے بے چاری سی شکل کو مزید بسور کر کہا۔

''ہاں صبح صبح دل بھی نہیں چاہتا اور بھائی نے اتنا شور مچا رکھا ہوتا ہے کہ بس ایک کپ چائے پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔'' ضویا نے بھی اپنا مسئلہ بتایا۔

''میں تو ناشتا کر کے ہی آتی ہوں۔ میری مما مجھے کبھی بھوکا نہیں آنے دیتیں۔'' امن نے کہا۔

''اچھا آؤ! میری تو جان نکلی جا رہی ہے بھوک سے۔'' عروہ نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

''تم تو ہر وقت بھوک بھوک ہی کرتی رہتی ہو۔'' ضویا نے مذاق اُڑایا۔

عروہ نے اُسے غصے سے گھورا مگر بولی کچھ نہیں کیونکہ وہ حقیقتاً بھوک سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

ضویا چلتے چلتے رُکی اور اپنے بیگ کی زپ کھول کر اُس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ ساتھ ہی بیگ میں منہ گھسا لیا۔ عروہ نے اُسے بیچ راستے میں رُکے دیکھا تو اُسے تپ چڑھ گئی۔

''کیا ہے! یہ احمقوں والی حرکتیں بند کرو۔'' عروہ نے اُسے ٹہوکا دیا مگر اُس نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ تلاش بسیار کا کام ہنوز جاری رکھا، نجانے بیگ میں ایسا کیا گم کر بیٹھی تھی جو ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''مل گیا۔'' تبھی ضویا چلائی اُس کی مطلوبہ چیز مل چکی تھی۔

''بدھو کہیں کی۔'' عروہ نے اُسے گھرکا، کیونکہ اُسے ضویا کی یہ حرکات وسکنات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ اکثر لاپروائی سے بیگ میں سیل فون ٹھونس دیتی تھی پھر مل کے ہی نہیں دیتا تھا۔

''ہزار بار کہا ہے کہ اندر کی پاکٹ میں سیل فون رکھ لیا کرو، عمرو عیار کی زنبیل جیسا بیگ ہے تمہارا، جس میں زمانے بھر کا الم غلم بھرے رکھتی ہو پھر اُسی میں سیل فون پھینک کر گم کر لیتی ہو۔ اپنا بھی وقت برباد کرتی ہو اور ہمارا بھی، وہی رہنا بے وقوف گاؤں کی گوری۔'' امن نے بھی اُس کو پہلے ڈپٹا اور بعد میں اُس کا تمسخر بھی اُڑا ڈالا۔

بلکہ یوں کہو امن گاؤں کی کالی۔'' عروہ بھی ہنسی۔

''ہاں تم دونوں تو حسینہ عالم ہو، پریاں ہو اور شہر کی شہزادیاں ہو۔'' وہ بھی دو بدو بولی تو سب ہنسنے لگیں۔

کینٹین پر آ چکی تھیں وہ۔

''تین پلیٹ سموسے اور تین کوک اسٹرا سمیت۔'' عروہ نے کینٹین والے لڑکے کو آرڈر دیا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ مستعدی سے کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ تینوں سموسوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ بے فکری اور لاأبالی پن کی شوخ ہنسی، جو اس عمر کا خاصا ہوتی ہے، بے وجہ ہنسی آتی ہے اور بے حد زوروں کی ہنسی آتی ہے۔ ایسی ہنسی جو دل سے شگوفوں کی مانند پھوٹتی ہے۔ رُکتی نہیں آئے چلی جاتی ہے۔

☆......☆......☆

یہ گھر فرقان احمد کا ہے۔ اچھا پختہ بنا ہوا گھر اُن کی جنت ہے۔ اُن کی بیوی لبنیٰ میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو اچھی بیوی اور اچھی ماں میں ہوتی ہیں۔

اُن کی بیٹی امن، بیٹے ہنزلہ اور حذیفہ اُن کی زندگی ہیں۔ اُن کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لبنیٰ سمجھدار اور معاملہ فہم ہیں، کچھ پڑھی لکھی باشعور بھی ہیں۔ اُن کو محلے میں اس وجہ سے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ خداترس خاتون بھی ہیں۔

اس وقت لبنیٰ دیوار کے ڈھلتے سائے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ امن پاس ہی دوسری چارپائی پر اپنی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ ہنزلہ اور حذیفہ اس وقت ٹیوشن سینٹر گئے ہوئے تھے۔

امن ابھی واش روم سے نہا کر آئی تھی۔ اُس نے بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ لبنیٰ نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے فروا کھڑی تھی۔ امن نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر لبنیٰ کے کندھے سے جھانکا ہنستی مسکراتی فروا پر نظر پڑتے ہی امن کا رنگ فق ہو گیا۔ سانولی رنگت متغیر ہو کر سیاہ نظر آنے لگی۔ لبنیٰ پر تپاک انداز میں فروا کو گلے ملی اور اندر آنے کی جگہ دی۔

''کیسی ہیں آپ چاچی۔'' فروا نے نظریں امن پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جتاتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر امن ٹپٹا کر رہ گئی دائیں بائیں دیکھنے لگی مگر دل کا خوف دائیں بائیں نہ ہو سکا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا، تم سناؤ۔'' لبنیٰ نے خوشدلی سے پوچھا۔ فروا نے بتایا کہ وہ بھی ٹھیک ہے۔ فروا نے اپنا لان کا دوپٹہ اُتار کر گول مول کر کے اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔

''میں سکنجبین بنا کر لاتی ہوں۔'' امن بہانے سے غائب ہو گئی۔

''آپ تو آتی ہی نہیں ہیں، میں نے سوچا کہ میں ہی مل آؤں چاچی سے۔''

''اچھا کیا بیٹا تم چلی آئیں، بس میں تو گھرداری میں ہی اُلجھی رہتی ہوں۔ چاہ کر بھی نکلنا نہیں ہوتا۔'' لبنیٰ نے انکساری سے نہ آنے کی وضاحت بھی دے ڈالی۔

امن سکنجبین بنا کر لے آئی جگ اور گلاس لبنیٰ کے پاس رکھے اور جان بوجھ کر دوبارہ کچن میں جا گھسی جاتے جاتے اپنا 'کام' کر گئی تھی۔ لبنیٰ کے چہرے کے تاثرات یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

فرقان احمد کا شہر کے وسط میں جنرل اسٹور تھا۔ وہ علی الصبح اسٹور پر جایا کرتا تھا۔ اچھا چلتا ہوا اسٹور تھا۔ رات دیر تک بارش ہوتی رہی تھی۔ موسم بے حد سہانا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

''فرقان اُٹھ جائیں نماز کا وقت نکل جائے گا۔'' لبنیٰ نے بیڈ کے سرہانے بیٹھ کر اُن کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، بال سہلانے لگی پھر ہاتھ فرقان کی پیشانی پر آن رکا۔

''بارش رُک گئی کیا؟'' فرقان نے لبنیٰ کے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ کر لبوں پر رکھ لیا۔

''جی رُک گئی۔

''کپڑے استری کردیے۔''

''جی رات کو ہی کر کے رکھ دیے تھے بلکہ جوتے بھی پالش کر کے رکھ دیے تھے۔'' وہ مسکرائی۔

''اچھا اب اُٹھ جائیں نماز پڑھ لیں۔'' لبنیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ بیٹھی رہی تو فرقان یوں ہی کسلمندی سے لیٹے رہیں گے نماز نہیں پڑھیں گے۔''

''اچھا جی بیگم صاحبہ!'' وہ اُٹھ کر سلیپر پہننے لگے۔

☆......☆......☆

فرقان جلدی ناشتا کر کے اسٹور پر چلے گئے لبنیٰ اب امن اور حذیفہ و ہنزلہ کے لیے سلائس تل رہی تھیں۔ امن اور ہنزلہ ہر چیز چپ چاپ کھالیتے تھے جبکہ حذیفہ بہت نخرے کرتا تھا، شرارتی بھی بلا کا تھا۔

''امن میں ٹیبل لگاتی ہوں تم پلیز بیٹا حذیفہ کو دیکھو جا کر۔ ابھی تک نہیں اُٹھا، جاگنے میں بہت وقت لیتا ہے۔'' لبنیٰ بڑبڑاتی ہوئی ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات رکھنے لگی۔

''وہ اُٹھ گیا ہے مما، واش روم میں ہے۔'' امن کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''مجھ سے کچھ بھی مت چھپایا کرو امن۔'' امن سلائس پر جیم لگا کر مزے سے کھا رہی تھی۔ لبنیٰ کی بات پر اُس کا ہاتھ وہیں رُک گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

''تم کالج کے فنکشن میں ڈانس کر رہی ہو۔'' لبنیٰ کی بات پر امن نے دانتوں تلے اُنگلی دبائی جس بات کا ڈر تھا وہی مجسم ہو کر سوال بن گیا تھا۔

''وہ مما، وہ......'' امن ہکلا رہی تھی۔ کوئی مناسب بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ اچانک پکڑی گئی تھی۔

''زندگی میں صرف پہلی بار جھوٹ بولنا مشکل لگتا ہے پھر انسان عادی ہو جاتا ہے۔ بیٹا زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولنا ورنہ اپنا اعتبار کھو دو گی۔ سچ بھی بولو گی تو بھی کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور ماں سے تو کبھی بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اور نہ کوئی بات چھپانی چاہیے۔ ماں سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔'' لبنیٰ نے سرزنش کی تھی یا کوئی وارننگ، امن کی سمجھ سے بالاتر تھا ہاں یہ ضرور ہوا کہ اُس نے کوئی عذر نہیں تراشا بس پریشان سی نظر آنے لگی۔

''بیٹی کے بارے میں کوئی بات یا اطلاع ماں کو بیٹی کے بجائے کوئی باہر کا بندہ دے تب کتنی شرمندگی اور خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ بیٹا یہ یاد رکھنا بات کتنی ہی معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو گھر کے اندر مت چھپانا۔''

لبنیٰ نے ماں کا فرض ادا کرتے ہوئے رسانیت سے امن کو سمجھایا۔ وہ سمجھی یا نہیں اُس کا دوبارہ اس نصیحت پر عمل کرنے کا ارادہ تھا یا نہیں مگر فی الوقت اُس نے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے وہ ندامت میں ڈوبی سر اٹھا نہیں پا رہی ہو۔

''سوری مما۔''

''ٹھیک ہے مگر دوبارہ خیال رکھنا۔ لڑکیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں (جو جانے انجانے میں اُن سے سرزد ہو جاتی ہیں) بعض اوقات اُن کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیتی ہیں۔'' امن نے اپنی کتابیں، فائل سیٹ کیں، اپنا بیگ اُٹھایا اور لبنیٰ کی بات کو بے توجہی سے سنتی باہر نکلی۔ اُسے یہ خواہش ہی نہیں تھی کہ وہ لبنیٰ کی بات دھیان سے سنے اور پھر اُن باتوں سے معنیٰ اور نتیجے اخذ کرے اور آنے والے دنوں میں اُن پر عمل بھی کرے۔ وہ تو لمبی چوڑی ڈانٹ یا لیکچر سے بچ جانے پر خوش تھی۔

''مما میں جا رہی ہوں۔'' امن نے دوپٹا اچھی طرح سر پر جما کر کہا۔

''اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا۔'' لبنیٰ نے آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی اور تا دیر محویت سے امن کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ دہلیز پار بھی کر گئی مگر لبنیٰ دروازے کو ہی دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

اس وقت بھی وہ تینوں کالج گراؤنڈ میں اکٹھی بیٹھی تھیں گرمی آج بھی زوروں کی تھی۔

''ضویا سوٹ کا کیا فیصلہ کیا، مطلب فنکشن میں کیسا سوٹ پہنو گی۔'' عروہ نے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پاس سادہ سے چند جوڑے ہیں بس۔'' ضویا نے سادگی سے کہا۔

''یار پلیز کوئی سادہ سا جوڑا پہن کر نہ آ جانا۔'' عروہ نے اُس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے کیونکہ ضویا کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اس لیے وہ اسٹائلش جوڑے نہ ہی بنوا سکتی تھی اور نہ ہی وہ کریزی تھی ایسی چیزوں کو لے کر۔

''میری آپی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اُن کا جوڑا پہن لوں گی، ڈونٹ وری۔ مجھے دوست کہتے تمہاری شان میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔'' ضویا اسٹیٹس کانشس نہیں تھی۔ کوئی کیا سمجھتا ہے، کیا کہتا ہے اُسے کبھی بھی قطعی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی وہ جیسی تھی ویسی نظر بھی آتی تھی، پیچھے نہیں بھاگتی تھی چیزوں کے، لوگوں کے یا جھوٹے خوابوں کے۔

''امن تم کیا پہنو گی۔''

''میں اپنی مما سے کہوں گی ضرور کہ نیا سوٹ دلوا دیں مگر یہ بھی امکان ہے کہ وہ مجھے 'قناعت' پر لمبا چوڑا لیکچر دینے لگیں مگر ہو سکتا ہے سوٹ دلوا ہی دیں۔''

''میں تو بوتیک سے نیا سوٹ لوں گی اپنی مما سے، بھلے ضد ہی کرنی پڑے۔'' عروہ نے آنکھوں کو گول گول گھما کر زعم سے کہا۔ اس سے اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اُسے اپنی بات منوا لینے کا یقین ہی نہیں بلکہ زعم بھی ہو۔

''ویسے عروہ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' امن نے کندھے اُچکا کر تجسس پھیلایا۔

''کس بات کی؟'' ضویا اور عروہ نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''یہی کہ تمہاری آنکھیں کیسی ہیں عجیب سی۔'' امن نے کہا اور عروہ کو منہ چڑاتی اپنی کتابیں اور بیگ وہیں چھوڑ کر اُٹھ کر بھاگی۔ اُسے پتا تھا عروہ پہلے سٹپٹائے گی پھر امن کو مار ڈالے گی۔

''ناک بھی چپٹی ہے۔'' امن جاتے جاتے بولی۔

عروہ اُس کے پیچھے بھاگی تھی۔ ابھی تو وہ نئے سوٹ کی جھلملاہٹوں میں گم تھی کہ امن نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ خوابوں کی وادیوں سے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

''تم تو جیسے حور پری ہو نا، لیڈی ڈیانا جیسا فگر، مونا لیزا جیسی مسکراہٹ ہے نا۔'' وہ مسلسل امن کے پیچھے بھاگ رہی تھی مگر وہ پکڑائی میں ہی نہیں آ رہی تھی، تبھی وہ زور سے کسی سے ٹکرائی تھی۔ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں امن کو لگ پتا گیا تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے گرلز، چلیں اپنی اپنی کلاسز میں۔'' سامنے بی کام کا سی آر نیہات ضمیر تھا وہ اُن کو ڈپٹ رہا تھا۔ امن نیہات ضمیر سے ہی ٹکرائی تھی۔

''آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے۔ بی میچور گرلز، یہ اُچھل کود، یہ بھاگ دوڑ، فضول کے قہقہے بہت بچکانہ حرکتیں ہیں ویری سیڈ۔'' وہ تو شروع ہی ہو گیا تھا۔ لعنت ملامت کرنے پر تو یوں تل گیا تھا جیسے نجانے اُن دونوں سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

وہ انہیں برا بھلا کہتا وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ وہ دونوں گم صم کھڑی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

''جہاں بھی جاتے ہیں بے عزت ہی ہوتے ہیں اور یہ ضویا ضمیر کا بھائی نیہات ضمیر سڑیل، کھڑوس، پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑتا ہے۔ مجال ہے ذرا ہلا گلا کرنے دے۔''

''اچھا یار معاف کر دے میں نے تمہیں گول

آنکھوں والی چپٹی ناک والی کہا۔'' امن چہرے پر بے چارگی و مسکینی سجا کر چاپلوسی کرنے لگی بلکہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے وہ پہلے ہی نیہات کے ہاتھوں خوار ہو چکی تھی۔

''تم تو مس کترینہ کیف ہو پراں دفع ہو۔'' عروہ نے اُس کے بندھے ہاتھ جھٹکے اور تن فن کرتی یہ جا وہ جا۔

امن کو ماننا پڑا کہ آج کا دن بے عزت ہونے کا دن تھا۔

لبنیٰ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی اُس کا ارادہ آج بازار جانے کا تھا۔ امن نے بہت لجاجت و منت بھرے انداز میں نئے سوٹ کا تقاضا کیا تھا، لاڈ سے عاجزی سے اور لبنیٰ نے حامی بھرلی تھی۔ اس سے پہلے کہ امن ضد کرتی۔ لبنیٰ جو کم ہی اکیلی بازار جایا کرتی تھی مگر کچھ سوچ کر گھر سے چادر اوڑھ کر نکلی اور زمان بھائی کے گھر چلی گئی۔

☆......☆......☆

دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ لبنیٰ ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''السلام وعلیکم!'' زینت گھر کی صفائی کر رہی تھی لبنیٰ پر نظر پڑی تو اِدھر آ گئی۔

''وعلیکم السلام، بھابی عائشہ کہاں ہیں۔''

''وہ تو گھر نہیں ہیں، کہیں باہر گئی ہیں۔'' زینت کل وقتی ملازمہ تھی اس لیے گھر میں اُس کی کافی عزت تھی اور اُسے گھریلو معاملات کے بارے میں پتا ہوتا تھا۔

''کچھ پتا ہوگا کس کے گھر گئی ہیں۔'' لبنیٰ نے بیزاری سے پوچھا اُسے عائشہ بھابی کی گھر گھر پھرنے والی عادت سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔

''پتا نہیں جی۔''

''فروا بی بی کو جگا دوں۔'' زینت کہہ کر لبنیٰ کو دیکھنے لگی کہ وہ کیا جواب دیتی ہیں۔

''نہیں رہنے دو، ویسے یہ آج پارلر کیوں نہیں گئی۔''

''پتا نہیں جی، ناشتے کے لیے زمان صاحب نے بلوایا تھا تو اُس نے دروازے کے اندر سے ہی کہہ دیا کہ موڈ نہیں ہے پھر زمان صاحب نے کہہ دیا کہ جب اُس کا دل چاہے گا اٹھ جائے گی اور جب تک جی چاہے وہ سوئے۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں پھر، بھابی کو بتا دینا۔'' یہ کہہ کر لبنیٰ بازار چلی گئی۔

امن کے لیے لبنیٰ نے ایک اسٹائلش سا سوٹ لیا۔ میچنگ شوز بھی لے لیے، چھوٹی موٹی کچھ اور گھریلو ضروریات کی چیزیں لے کر وہ سبزی لے رہی تھی جب کوئی اُس کے پاس آ کر رُکا تھا۔ لبنیٰ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں گلے مل کر زار و قطار رونے لگیں تھیں۔ حال احوال بھی نہیں پوچھا تھا حال چھپا ہوا تو نہیں تھا۔

دونوں کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنے اطراف سے بے خبر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔

تبھی بشیراں نے اُن کو الگ کیا اور احساس دلایا کہ بازار میں سب لوگ اُن کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ لوگ تو اُن کے پاس آ کر پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے خیریت تو ہے نا، اُن دونوں نے بروقت خود کو سنبھالا اور آنسو صاف کر لیے۔

''کیا ہوا ہے بہن، کوئی مر گیا ہے یا چوری وغیرہ ہو گئی ہے؟'' اُس اجنبی خاتون کی نگاہوں میں بیک وقت ترحم بھی تھا شک و شبہات بھی۔

''کچھ نہیں ہوا، پرانی سہیلیاں ہیں عرصے بعد ملی ہیں تو آبدیدہ ہو گئیں۔''

''بشیراں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو وہ عورت ناک بھوں چڑھاتی پلٹ گئی لوگوں کا مجمع بھی چھٹ گیا اور سب معمول کے مطابق اپنے کاموں میں دوبارہ منہمک ہو گئے تھے۔

''کیسی ہو فاخرہ؟'' لبنیٰ نے چادر کے پلو سے آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں میں۔'' فاخرہ کی سوز میں ڈوبی

بات پر لبنیٰ کچھ لمحوں کے لیے بس گم سی ہوگئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ تسلی و تشفی یا کسی کو دلاسہ دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے کے لیے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر مقابل کا دُکھ، اُس کا صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس درد کے مداوے کے لیے لفظ بہت چھوٹے۔

''تم کیسی ہو لبنیٰ، میں تو 'اپنوں' کی شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ تمہیں دیکھا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ نجانے میری آزمائش کب ختم ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں۔'' عبایا میں چھپا اُس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا مگر اُس کے لہجے کا اضطراب لبنیٰ کے دل میں گڑھ گیا تھا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا فاخرہ، اللہ تعالیٰ کبھی بھی بندے کو اُس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، سب وسوسے اور خدشے دل سے نکال دو۔'' فاخرہ اذیت سے مسکرائی۔

''میں ہر رشتے کی مجرم ہوں لبنیٰ، کوئی بھی مجھ سے کبھی خوش نہیں رہا حالانکہ بہت سے لوگ میری زندگی میں ایسے بھی ہیں جن کو خوش رکھنے کی کوشش میں، میں ہلکان ہورہی ہوں۔ اپنا آپ مٹا رہی ہوں مگر میری خطائیں شاید اتنی زیادہ کہ سزائیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے سدھارنے کے لیے بہت جتن کیے مگر میرا سفر ختم ہی نہیں ہوتا اور کوئی آس بھی نہیں کہ سفر کی تھکن بھری طوالت کے دوسرے کنارے پر کوئی سکھ، عزت، یا بچی کھچی کچھ محبت میرے حصے کی منتظر ہے۔'' اُس کی سانس پھولنے لگی۔

''میرے پاؤں اس آبلہ پائی کے سفر میں درد کی منزلیں طے کرتے تھک گئے ہیں۔ اذیت بھری مسافت نے میرا دل فگار کر ڈالا ہے۔ میں نے اب دوسروں کے ڈر خوف کو دل سے نکال دیا ہے۔ میرے بچے میری ڈھال بن جائیں تو مجھے سکھ مل جائے مگر میرا دل لرزتا ہے، یہ سوچ کر کہ اگر بچوں نے بھی میرے آگے سوال رکھ دیے تو کیا کروں گی۔ کیسے سامنا کروں گی ان کی ملامت بھری نظروں کا۔'' فاخرہ کا دل اس سے صرف ماں کا دل بنا کرب سے گزر رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو، تمہاری بیٹیاں کوئی سوال نہیں کریں گی۔ وہ تمہاری درد آشنا بنیں گی۔''

''میں اب صرف 'ماں' بن کر زندہ رہ رہی ہوں۔ میری اولاد میری مضبوطی ہے۔ لبنیٰ تم دعا کرنا میرے حق میں کہ میں کم از کم اپنی اولاد کی نظروں میں ہی سرخرو ہوجاؤں۔ وہ ہی مجھے معتبر کردیں، ہم کوشش کرتے ہیں مگر کبھی کبھی نتائج ہمارے ارادوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانچ پڑتال کرتے بہت سا وقت گزر گیا۔ پچھتاووں کی آگ میں جل جل کر گزار دیے اتنے سال مگر نہ ملال کم ہوا اور نہ ہی ندامت۔'' لبنیٰ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی کزن فاخرہ کے دکھ، اذیت اور تکلیف کو دل سے محسوس کرتی تھی مگر بہت سارے معاملوں میں مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شروع شروع میں لبنیٰ نے فرقان، زمان، رحمان اور اپنی ساس کو سمجھانے اور احساس دلانے کی کوشش کی تھی مگر سب بے سود تھا۔ اُسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اُس کی بات ماننا تو درکنار کسی نے فاخرہ کے حوالے سے اُس کی بات سننا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ پھر آخرکار لبنیٰ نے فاخرہ کی زندگی کے سارے معاملے اللہ پر چھوڑ دیے تھے اور اپنی سسرالی فیملی کو سمجھانے کی کوشش ترک کردی تھی کیونکہ یہ سب خدا بن گئے تھے۔ فاخرہ کی قسمت کے فیصلے خود کرنے لگے، سزا دینے لگے، سزا تجویز کرنے لگے بھول گئے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

''اچھا میں چلتی ہوں، بچوں کو پیار دینا لبنیٰ۔'' فاخرہ نے لبنیٰ کو سوچوں کے بھنور سے نکالا۔ دونوں بھینچ بھینچ کر گلے ملیں، پھر وہ چلی گئی۔ ایک وقت تھا جب وہ دونوں گہری دوست ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج ایک دوسرے کو ملنے کو ترستی تھیں۔

اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے

ہم سے منہ زور کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو عمارات کیا کرتے تھے
اے محبت یہ تیرا بخت کہ بن مول ملے
ہم سے انمول جو ہیروں میں تلاش کرتے تھے
اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں
خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے

لبنیٰ کی آنکھوں سے آنسو نہیں یادیں بہہ رہی تھیں۔ فاخرہ کی بے وقعتی، اُس کی بے قدری پر اُس کا دل ہمیشہ کٹتا تھا مگر اُس کے بس میں کیا تھا۔ اُن کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی، دکھ سکھ بانٹنا تو دور کی بات تھی۔ بہت سی یادوں کے منہ کھل گئے تھے۔

لبنیٰ دل گرفتہ سی گھر لوٹی تھی۔

☆......☆......☆

''چل معاف کردے نا، تُو میری اچھی بہن ہے نا۔'' امن اس وقت اپنی چھت پر کھڑی عروہ کی چھت پر جھانکتے ہوئے کہا۔ شام کا وقت تھا عروہ چھت پر چارپائیاں بچھا رہی تھی۔ یہ لوگ چھت پر سوتے تھے۔ مگر عروہ نے پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا بس اپنا کام کرتی رہی۔

''عروہ سُن نا، اِدھر دیکھ نا میری طرف چھپکلی'' امن نے آخری لفظ دانتوں تلے دبا کر کہا۔ عروہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور ذرا سا درمیانی فاصلہ گھٹا کر امن کے سامنے آن رُکی مگر چہرے پر غصہ نظر آرہا تھا۔

''ہاں بول، کیا ہے۔''

''معاف کردے، میں نہیں رہ سکتی نا تمہارے بنا، دوستوں میں ہنسی مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے یار! اتنا برا ماننے کی بھلا کیا تک ہے۔'' وہ جلدی جلدی بول گئی۔

''چل ٹھیک ہے، یہ بتا تیرا سوٹ سِل گیا۔'' عروہ نے نروٹھے پن سے کہا تو امن نے فضائی کس اُس کی طرف اچھالی۔ مقصد عروہ کا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔

''ہاں مما نے سی دیا ہے، گلابی رنگ کی لونگ شرٹ اور فیروزی پاجامہ ہے۔ نگوں اور موتیوں کا ہلکا ہلکا کام ہے، شوز بھی ہائی ہیل میچنگ۔'' امن کے دمکتے خوشی کے تمتماتے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے۔

''واہ کیا بات ہے۔ اس بار تمہاری مما نے تمہیں قناعت پر سبق نہیں پڑھایا۔''

''بس مما فضول خرچی کو پسند نہیں کرتیں نا اس لیے ورنہ تو وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''خاک محبت کرتی ہیں۔ ہر وقت روک ٹوک، یہ نا کرو وہ نہ کرو، یہاں نہ بیٹھو وہاں نہ بیٹھو، میری مما کو دیکھو۔ کبھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جہاں دل چاہے جاتی ہوں۔ جو جی چاہے کرتی ہو، تو بھی اپنی ہر بات چاچی سے منوایا کر 'ضد' کر کے۔'' وہ اُسے اُکسا رہی تھی۔

''میں اپنی مما سے ''ضدیں'' نہیں لگاسکتی۔''

''چلو ترستی رہنا ساری عمر، اچھی یو بو بن کر گزار دینا زندگی'' وہ ہاتھ جھاڑ کر بولی جیسے کہہ رہی ہو قصہ ختم۔

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم کیا پہن رہی ہو؟'' امن کی آواز میں دبا دبا جوش اور اشتیاق جھلکا۔

''سی گرین فراک پیور دبکے کے کام والا''

''اچھا وہی جیسا فروا کا ریڈ ہے۔'' امن دیوار پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکی۔

''اچھا پھر تم نے نیا سوٹ نہیں خریدا پھر۔''

''خریدا ہے، وہ گھر سے پہن کر جاؤں گی اور سی گرین فراک ڈانس کرتے ہوئے پہنوں گی۔'' عروہ اترائی۔

''اچھا یار تم اپنے فراک کے ساتھ وہ فروا کا ریڈ والا بھی ساتھ لے جانا پلیز میرے لیے۔''

''نا بابا فروا نہیں دیتی اپنی چیزیں، اور وہ فراک تو ہے بھی بہت قیمتی۔''

''مانگنے کی ضرورت بھی کیا ہے فروا سے، چوری لے آنا، پلیز میری خاطر۔'' امن ندیدوں کی طرح بولی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' عروہ نے احسان کرتے

ہوئے کہا۔

''بہت بڑا تھینکس۔'' امن اُس ریڈ دبکے والے شیفون کے فراک کی جھلملاہٹوں میں کھوگئی۔

☆......☆......☆

کالج بہت بڑا نہ ہونے کی وجہ سے کالج فنکشن کا اہتمام ایک ہوٹل کے ہال میں تھا۔ امن اور عروہ نے منتیں کرکر کے فروا سے میک اپ کروایا تھا۔ فروا نے لاکھ نخرے کیے مگر صد شکر کہ اُن کا میک اپ کر دیا تھا اور جب وہ کالج کے لیے نکلنے لگیں تب فروا نے امن کو اپنا پنک پاؤچ بھی دیا اور حیرت کا مقام تھا کہ بن مانگے ہی دیا تھا۔ امن نے فروا کو ہونٹ سکوڑ کر یوں اشارہ دیا جیسے مشکور ہو کر اُسے کس کر رہی ہو۔

''میں بھی چلتی ہوں۔'' فروا نے کہا تو اُس نے چونک کر دیکھا۔

''سیلون تک۔'' فروا نے کہا تو اُن کی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں۔

''اوہ اچھا۔'' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فروا کا سوٹ وہ چوری سے لے کر جا رہی تھیں فروا کے ساتھ فنکشن میں جانے کی وجہ سے بھانڈا پھوٹ جاتا۔ شکر ہے خیر گزری۔

وہ ہوٹل میں داخل ہوئیں تو ہوٹل کی انٹرنس میں ہی نیہات ضمیر اور ضویا ضمیر کھڑے مل گئے۔ فروا پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ نیہات نے گہری نظروں سے امن کو دیکھا۔ گلابی لونگ شرٹ، فیروزی پاجامہ، لمبے گھنے بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ فرنٹ سے بالوں کا بینڈ اسٹائل بنا رکھا تھا جس کی وجہ سے امن کا چہرہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی مگر پُرکشش تھی اور کم عمری کی سحر انگیز نوخیزی توجہ کھینچ لیتی تھی نیہات محویت سے اُسے تکتا رہا، وہ متوجہ نہیں تھی۔ ضویا سے باتوں میں مگن تھی، ہنسی مسکراتی، اٹھلاتی، دوپٹہ کندھے پر جھول رہا تھا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، نیہات کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور امن کو دیکھے۔ انہماک سے توجہ اور پھر دلچسپی سے۔

''چلو اندر جاؤ رش بڑھ رہا ہے۔'' وہ ایک دم روکھے پھیکے انداز میں بولا۔

''ضویا، امن چلو۔'' اب کے بار درشتی سے بھرپور لہجہ تھا۔

''ایک تو یہ تمہارا بھائی بھی نا، ہر وقت ڈانٹتا ہی رہتا ہے۔'' امن نے منہ بگاڑا۔

''سی آر ہے نا نیہات بھائی، نمائندہ ہیں وہ؟''

''اپنی کلاس کے ہیں، پورے کالج کے نہیں اور ویسے بھی آج تو ہم کالج میں ہیں بھی نہیں۔''

''اچھا چھوڑو، آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''تم بھی بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔'' امن نے بھی ضویا کی تعریف کی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی قابل ہی نہیں بہت اچھے بھی تھے۔ بظاہر دیکھنے میں بھی دلکش تھے۔

ہال میں جا کر عروہ نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنا چہرہ آئینے کے سامنے کر کے آنکھیں پھیلا کر کبھی سکیڑ کر خود کو ہر زاویے سے دیکھا۔ آئینے نے جھوٹ بول کر ایک خوش فہمی اسے تھمائی کہ آج حسین ترین لگ رہی ہو۔ ہاں وہ معمول کے دنوں کی نسبت آج قدرے اچھی لگ رہی تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ اُس کا حسن قیامت خیز دکھائی دے رہا تھا اور دیکھنے والی نظر کو اسیر کر کے راہ چلتوں کو رک جانے پر مجبور کر دے۔ نگاہوں کو خیرہ کر دے، مبہوت کر کے اردگرد سے بیگانہ کر ڈالے، مگر عروہ کی خوش گمانیوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ اُس کو کم از کم اس وقت ایسا ہی لگ رہا تھا۔

نیہات ضمیر اسٹیج پر کمپیئرنگ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اُس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ نیہات ضمیر اپنی دل موہ لینے والی آواز میں گانا سنا

رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے سیل فون سے اُس کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ ہر چہرہ جوش و خروش سے تمتما رہا تھا۔ جب گانا ختم ہوا تو بے تحاشا تالیاں بجا کر اُسے داد دی گئی۔

پھر بہت سارے آئیٹم ہوئے، ڈرامے ہوئے پھر نیہات نے امن اور عروہ کا نام اناؤنس کیا ڈانس کے لیے اور کس دل سے جلتے کڑھتے لیا یہ صرف وہی جانتا تھا یا اُس کا دل۔ گو کہ باہر کے لوگ چند ایک ہی تھے پھر بھی اتنے لوگوں کے سامنے امن کو عجیب جھجک مانع آ رہی تھی۔ مرد اساتذہ نہیں تھے صرف فی میل ٹیچرز ہی تھیں۔ یہ سوچ کر امن نے خود کو تسلی بھری تھپکی دی۔

میوزک شروع ہوا تو انہوں نے بہت مہارت سے ڈانس کیا۔ کہیں بھی سر اور تال کو اپنے اسٹیپ سے اوپر نیچے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیا۔ ردھم کے ساتھ ایک ساتھ ایک جیسا ناچتی رہیں۔ ہال سے اُٹھ اُٹھ کر گرلز اور بوائز سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہونٹوں اور ہاتھوں کی مدد سے ہوائی بوسے اُچھال رہے تھے۔ بوائز اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر تھرک رہے تھے اور نیہات ضمیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امن کو کہیں غائب کر دے۔ ان لڑکوں کی نظروں سے کہیں دور چھپا دے یا پھر خود کہیں روپوش ہو جائے۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں، وہ کمپیئر تھا۔ اسٹیج پر رہنا اُس کی مجبوری تھی۔ اسی نہج پر سوچ کر وہ وہاں سے خود کو ہٹا نہیں سکتا تھا۔

☆......☆......☆

صبا اور فضا کا زیادہ وقت فاخرہ جبیں کے ساتھ گزرا تھا۔ صبا چھوٹی تھی تو فاخرہ اُسے اپنے ساتھ اسکول لے جاتی تھی۔ صحت مند بڑی بڑی آنکھوں والی صبا دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ خالہ اماں فاخرہ کو خود اسکول چھوڑ کر جاتی اور چھٹی سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اسکول کے آگے آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ چھٹی ہوتی تو فاخرہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورتی واپسی کی راہ لیتی۔

فاخرہ نے اسکول کے اندر ایک بچی صبا کو سنبھالنے کے لیے رکھی ہوئی تھی جو کہ چوکیدار نے ڈھونڈ کے دی تھی۔ فاخرہ کے اسکول کی ساری ٹیچرز صبا سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ تھی بھی تو بہت پیاری، میدے جیسی رنگت، نرم و ملائم صبا کے بعد فضا کی ذمہ داری بھی فاخرہ نے اٹھالی۔ دونوں بچیاں چونکہ سارا وقت ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس وجہ سے ماں سے لگاؤ اور گہری اُنسیت ایک تو فطری عمل تھا اور دوسری بات اور تھا بھی کون جو اُن کو اپنے قریب رکھتا، اُن کا خیال کرتا۔ ددھیال میں صرف دو چاچو تھے، جو زمان کی فاخرہ سے شادی کے بعد باری باری بہانے بنا کر گھر چھوڑ گئے تھے۔ اُن کو فاخرہ کا وجود گوارا نہیں تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ فاخرہ جیسی بے حیا عورت کے ساتھ رہ کر اُن کی بیویاں اور پھر اُن کی بیٹیاں بگڑ جائیں گی۔

وہ جو پہلے ہی اپنے اندھے ناکارہ بھائی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ اُن کو زمان کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ فارغ بیٹھے نکمے، ناکارہ مرد کو کما کر کھلانا اُن کو عذاب لگتا تھا۔ وہ بات بے بات اُسے جھڑک دیتے تھے۔ اُن کی نظر میں زمان جیسے ادھورے مرد کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جو گھر میں بے کار پرزے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ جو کسی کام کا نہیں تھا۔ ماں زمان کے کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا خیال رکھتی تھی۔ ایسے میں فاخرہ کا زمان کی زندگی میں آنا سب کی خلاصی کا بہانہ بن گیا۔ زمین جائیداد وہ پہلے ہی دھوکے سے اپنے نام لکھوا چکے تھے۔ فرقان کا جنرل اسٹور تھا جبکہ رحمان کی سونے کی دکان تھی۔ دونوں بھائیوں کا چلتا ہوا کاروبار تھا مگر دونوں کو ہی زمان کی تین وقت کی روٹی بھاری معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی بیویاں بھی ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر دونوں ماں بیٹے کو کھانا دیتی تھیں۔ لُبنیٰ تو پھر بھی اچھی فطرت کی تھی مگر عائشہ تو کسی اور کا وجود برداشت

ہی نہیں کرتی تھی۔ اُسے اپنی ساس اور زمان کا وجود بھی کسی خار کی طرح چبھتا تھا۔

فاخرہ کا آنا اُن کی گلوخلاصی کروا گیا۔ دونوں چلے گئے کچھ ماہ کرائے پر رہے پھر ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے گھر بنوائے اور شان سے رہنے لگے۔

فاخرہ ایم اے پاس سرکاری ٹیچر تھی۔ گوری چٹی اونچی لمبی، رسیلے ہونٹ، لمبے حسین چمکتے بال، وہ گلاب سے گلابی نازک بدن والی لڑکی اپنی ایک خطا کے عوض زمان کی جھولی میں پھینک دی گئی۔

وہ جو حسن میں یکتا تھی۔ خاندان کے سارے لڑکے اُس پر فدا تھے۔ سیکڑوں اُسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے خواہاں تھے۔ وہی باکمال لڑکی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر بے اعتبار ہوگئی، نامعتبر ٹھہرائی گئی، معتوب ٹھہرا دی گئی اور اُس کے نتیجے میں فاخرہ جبیں کی شادی زمان سے ہوگئی۔ انمول ہیرا بے مول ہوگیا۔ بے قیمت ہوگئی وہ، اُس کا معیار گر گیا پھر کیا بھاؤ لگتے اُس کے۔ کوئی مول تول کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اتنی ارزاں اور حقیر ہوگئی فاخرہ جبیں کے رل گئی۔

سہاگ رات کو زمان کبھی رونے لگتا کبھی ہنسنے لگ جاتا۔ کبھی فاخرہ کی سنی سنائی تعریفیں کرتا، کبھی اُس کی سیاہ بختی پر رونے لگتا کہ اُس جیسی مکمل لڑکی نامکمل مرد کے پلے باندھ دی گئی۔

پورے خاندان میں فاخرہ جبیں کی قابلیت کے چرچے تھے۔ سب اُس کے حسن کے گن گاتے تھے جو زمان نے بھی سن رکھے تھے، واقف تھا مگر جہاں سب فاخرہ کے خواب دیکھتے تھے، فاخرہ کو پالینے کے تمنائی تھے۔ وہاں رحمان بھی اُس پر فریفتہ تھا مگر فاخرہ کسی کو بھی گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔

زمان نے تو کبھی اپنی بے نور آنکھوں میں اتنا مہنگا خواب سجانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ ادھورا تھا پھر اتنا مکمل سپنا کیسے پرونے کی جسارت کرسکتا تھا اور

وہ بن مانگے تعبیر بن کر اُس کے من آنگن میں اُتر آئی تھی۔ پڑھی لکھی برسرِ روزگار فاخرہ جبیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خالہ اماں اور زمان اُسے دل سے قبول کرتے مگر انہوں نے بھی اُسے دھتکارنا اور ذہنی اذیت دینا شروع کردیا۔ جسمانی طور پر بھی خالہ اماں اُسے اذیت دینے سے باز نہیں آتی تھیں۔ زمان بھی اپنی لاٹھی سے اکثر اُسے پیٹ ڈالتا تھا۔ رات کے پُرکیف، سرور انگیز لمحوں میں کبھی کبھی زمان 'عاشق' بن جاتا تھا اور کبھی اک اَن دیکھی ہستی کا 'رقیب' بن کر فرخندہ کو بے عزت بھی کرتا تھا۔ اُس کے تیور بگڑ جاتے، چہرہ مزید بدصورت و کریہہ نظر آنے لگتا پھر وہ فاخرہ کے وجود کی دھجیاں اُڑانے لگتا۔ اُسے جسمانی اذیتیں دیتا۔ وحشت زدہ ہو کر اُسے بھنبھوڑ ڈالتا، بھڑک اٹھتا۔ طوفان اُٹھا دیتا۔ جو ہاتھ میں آتا فاخرہ کو مار دیتا، اپنا غصہ، اپنی ناکامی اپنا سارا زہر نکال کر فاخرہ کے بدن میں انڈیل دیتا۔ وہ ساری رات روتی رہتی، تڑپتی رہتی۔ سب کم ظرف تھے، سب اُس کا 'صبر' آزمانے پر تل گئے تھے۔

فاخرہ جبیں اس رشتے کو نبھاتے ہوئے پل صراط پر سے گزر رہی تھی۔ وہ پل پل سلگتی، تڑپتی، جیتی اور مرتی تھی۔ اُس کے اندر تپش، گھٹن، حبس، آگ بڑھتی جارہی تھی۔

زمان ساری تنخواہ اُس کے ہاتھ سے لے لیتا تھا اور فاخرہ اپنی ضرورتوں کے لیے پیسے زمان سے مانگا کرتی۔ وہ سب فاخرہ کو بلیک میل کر رہے تھے، خوار کر رہے تھے۔ اُس کی عزتِ نفس تار تار ہوچکی تھی۔ کہیں امان نہیں تھی، کہیں آسودگی نہیں تھی۔ وہ خود کما کر بھی خالی ہاتھ رہ جاتی تھی۔ کیسی بے سروسامانی تھی، کیسے بے آسرا ہوئی تھی وہ۔ میکے والے منہ موڑ چکے تھے اور اب تو شہر ہی چھوڑ گئے تھے مگر فاخرہ کو تپتے الاؤ میں پھینک گئے تھے، جہاں وہ رات دن جلتی تھی، کٹتی

مرتی تھی مگر زندہ تھی۔

پھر صبا آ گئی۔ فاخرہ کے بے قرار دل کو قرار آ گیا ۔وہ بہل گئی، سنبھل گئی، جینے لگی۔ صبا تھی بھی تو من موہنی سی، بالکل فاخرہ کی طرح۔ تب فاخرہ نے اپنے اندر توانائی جمع کی اپنی بیٹی کے لیے۔ اب وہ ایک ماں تھی اُسے اپنی بیٹی کے لیے جینا تھا۔ شاید اُس کے بچے اُس کا یقین بن جائیں، سہارا بن جائیں۔

صبا کے لیے اسکول کے اندر چوکیدار نے کسی بے آسرا بچی کا انتظام کر دیا تھا، صبا کو سنبھالنے کے لیے اور وہ بچی یتیم تھی۔ فاخرہ کو وہ بہت اچھی لگنے لگی تھی مگر وہ اُسے خالہ اماں کی وجہ سے اپنے گھر لے کر نہیں آ سکتی تھی، ورنہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُس بچی کو پڑھائے لکھائے، آسرا دے، پناہ دے مگر وہ تو خود بے اماں تھی، کمزور تھی، اُس کی قسمت کے فیصلے تو خود دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ پھر وہ کسی اور کی قسمت بدلنے کا ارادہ کیسے باندھ سکتی تھی۔ جب یقین ہی نہیں تھا کہ وہ اِن ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا بھی سکے گی۔

''لوگوں نے اپنی اپنی زندگیوں میں کیا کیا گل نہیں کھلائے اور میں نے ایسا کیا کر دیا جس کی سزا ساری زندگی بھگتنی پڑے گی۔ زمان اور خالہ میرا جینا حرام کیے رکھتے ہیں۔ آخر کب میری سچائی پر لوگ یقین کریں گے۔ کب تک مجھے بہتان تراشیوں اور تہمتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' فاخرہ ہر روز اپنا محاسبہ کرتی روز زندگی کے لمحے شمار کرتی۔ آسودگی کم اور اذیتیں زیادہ جمع ہو جاتیں، وہ روز جوڑ توڑ کرتی مگر حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔

''تمام عمر لوگ گناہوں کی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے عیوب کو اپنی رحمتوں کی چادر سے ڈھانپے رہتا ہے۔ وہ لوگ زمانے میں قابلِ عزت بن کر شاہانہ زندگی گزار دیتے ہیں۔'' وہ تمام دن کُڑھتی رہتی سلگتی رہتی۔

زندگی میں جب برا ہوتا ہے تو پھر ہوتا چلا جاتا ہے، پے در پے صدمات انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ مگر فاخرہ اپنی اولاد کے کسی بھی معاملے میں کوئی کوتاہی و لاپروائی نہیں برتنا چاہتی تھی۔ زمان اور خالہ اماں سے مایوس ہو کر اُس نے اپنی تمام توجہ اور محبت صبا پر لگا دی، پھر فضا آ گئی۔ فاخرہ اُن پھول سی بچیوں کو دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ اب زمان اُسے جتنی بھی لفظوں کی مار مارتا، کتنا ہی پیٹ ڈالتا وہ اپنی بیٹیوں کے لیے اپنی ساری اذیت بھول جاتی۔ فضا اور صبا میں بالترتیب ایک سال کا وقفہ تھا۔

جب بھی لبنیٰ یا عائشہ کے میکے سے عیدی آتی تھی تو خالہ اماں اسپیشلی صبا اور فضا کو ساتھ لے کر اُن کے گھر جاتی تھیں اور وہاں سے آنے کے بعد صبا اور فضا سو سو سوال کرتیں۔

''مما نانا ابو کہاں ہیں۔ ہمارے ماموں، ہماری نانو کہاں ہیں۔ ہماری عیدی کیوں نہیں آتی؟'' اُن کے تجسس میں ڈوبے سوال فاخرہ کے اندر بے چینی، اضطراب اور کڑواہٹ بھر دیتے۔

''عائشہ چاچی کی امی نے اتنے سارے سوٹ بھجوائے ہیں۔ فروا آپی اور عروہ آپی کے لیے بھی سوٹ، جوتے، کیچر، پونیاں بھی بھجوائی ہیں۔''

''بتائیں نا مما آپ کو نانو عیدی کیوں نہیں بھجواتیں۔ ہماری نانو کہاں ہیں؟'' صبا پوچھتی تو فاخرہ کا دل جیسے کوئی کند چھری سے کاٹتا رہتا۔ اُسے اپنی سانسیں بوجھ لگنے لگتیں۔ وہ بے بسی سے اپنی بیٹی کو دیکھتی رہتی۔ بے بسی کا دبیز احساس فاخرہ کو کچوکے لگاتا رہتا۔ اپنوں کی بے اعتباری، بے اعتنائی اور لاپروائی نے اُسے یہ دن دکھائے تھے۔ وہ قسمت پر شاکر رہنے والی اب شاکی رہنے لگی۔ اللہ سے شکوہ کرنے لگی، گلہ کرنے لگی۔ زندگی نے اُسے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ہر دن نئی تکلیف ہر دن نیا سوال۔

وہ صبا کو کیا جواب دے کر مطمئن کرتی، جھوٹ کا پلندہ یا سچ، جھوٹ بولنے سے وقتی طور پر تو وہ مان جاتی یقین کرلیتی مگر زندگی میں کبھی فاخرہ کا جھوٹ کھلنے پر اُس کا ردِعمل کیا ہوتا۔کیسی بے یقینی صبا کی آنکھوں میں ٹھہر جاتی۔ فاخرہ جھرجھری سی لیتی نہیں وہ سب کی بے یقینی و بے اعتباری سہہ گئی مگر وہ اپنی اولاد کی نظروں میں بے اعتبار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ہر ماں اپنی اولاد کی بے یقینی سے ڈرتی ہے۔سوال کرنے سے ڈرتی ہے۔ ایسے سوال جن کا جواب اُن کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر فاخرہ سچ بتادیتی تو پھر صبا کے معصوم ننھے سے ذہن میں ہزاروں سوال اور اُگ آتے اور فاخرہ ٹال مٹول سے کام لیے جاتی، بس آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی۔

لبنیٰ فاخرہ کی کزن تھی اور دوست بھی رہی تھی اس لیے کبھی کبھار چوری چھپے فاخرہ کو فون کرلیتی، تب فاخرہ بھی اپنے دکھ سکھ اُس سے بانٹ لیتی تھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔

صبا اور فضا کی اسکولنگ کی وجہ سے اُن کے دل میں اُبھرتے کئی نوکیلے سوال وقتی طور پر دب گئے تھے۔ فاخرہ نے اپنی طرف سے کوشش کی کہ دوبارہ صبا فضا کو اپنے چاچو لوگوں کے گھر نہ جانے دے۔ عائشہ اور رحمان اس طرح تو اُس کی بچیوں کا ذہن اور زہر آلود کردیں گے۔ ان میں شکوک وشبہات اور بدگمانیاں بھردیں گے اور ایک دن اُس کی اپنی اولاد ہی اُس کی مخالف بن کر اُس کے سامنے کھڑی ہوجائے گی۔

فضا اور صبا کا ذہن بٹ جائے، اُن کے خیالات بکھر جائیں۔ ایسا فاخرہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اب وہ خالہ اماں کے سامنے اکڑنے لگی تھی۔ ضد کرنے لگی تھی اپنی بچیوں کے لیے۔ جب جب وہ صبا اور فضا کو رحمان یا فرقان کے گھر لے کر جانا چاہتی تھی۔ تب فاخرہ تن جاتی۔ اُن کو جانے نہیں دیتی تھی۔ بدلے میں خالہ اُسے مار مار کر اَدھ موا کردیتیں مگر فاخرہ اس معاملے میں خالہ کو اپنی من مانی نہیں کرنے دیتی تھی۔لبنیٰ اور عائشہ نے کبھی اپنی ساس کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور وہ خبیث عورت سارے بدلے فاخرہ سے ہی لے رہی تھی۔ چار چوٹ کی مار دیتی تھی بات بے بات اُسے طلاق کی دھمکی دی جاتی تھی۔

پھر خالہ اماں نے فاخرہ کی 'رکھوالی' کے لیے ایک عورت رکھ لی۔ بشیراں اب کسی سائے کی مانند اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ فاخرہ کی تنخواہ سے ہی بشیراں کو تنخواہ دی جاتی تھی۔

اسی دوران اسوہ اور پھر اسد دنیا میں آگئے تھے۔ بشیراں نے جب فاخرہ کے حالاتِ زندگی دیکھی تو اُس کی تمام تر ہمدردیاں فاخرہ کے ساتھ ہوگئیں۔ وہ اُس کی خیرخواہ تھی۔ اُسے بہت ترس آتا فاخرہ پر اور ایسی بے جوڑ شادی پر وہ کفِ افسوس ملتی رہتی۔

صبا آٹھویں کے پیپرز دینے والی تھی، فضا ساتویں میں جبکہ اسوہ ابھی چوتھی کلاس میں تھی۔ تینوں بہنیں ہی اپنی ماں کے ساتھ بہت اٹیچ تھیں۔ احساس کرنے والی حساس بچیاں تھیں۔ تابعدار بھی تھیں۔ مگر اسد کبھی کبھی اکھڑپن اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرجاتا تھا۔ دادی اُس کا ذہن خراب کررہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا۔ فاخرہ نے فجر کی نماز کے بعد واشنگ مشین لگالی تھی پھر ناشتا بنانے لگی۔ زمان کے لیے دودھ والا دلیہ بنانا تھا۔ آج کل زمان کا پیٹ خراب رہنے لگا تھا۔ فاخرہ نے پراٹھے بنائے، رات کا سالن گرم کیا پھر چائے بنانے لگی۔ تبھی باہر واشنگ مشین کی سیٹی بجی تھی۔ فاخرہ نے برنر کی آنچ ہلکی کی اور چھوٹے سے صحن میں نکل آئی۔ واشنگ مشین سے کپڑے نکال رہی تھی۔ تبھی اُس کی چٹیا کا زور کا جھٹکا لگا۔ فاخرہ بروقت سنبھلی اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر اُس کو موقع نہیں دیا گیا۔ اس بار کا جھٹکا شدید تھا اتنا شدید کہ وہ اگلے ہی پل زمین پر گرپڑی۔ ایک اسی

سالہ بوڑھی عورت کی نفرت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ جب جی چاہے چھتیس سالا فاخرہ کو روئی کی مانند دھنک دیتی تھی، پٹخ دیتی تھی، گرا دیتی تھی۔ فاخرہ نیچے گری زمین کا حصہ بن رہی تھی۔ دھول مٹی جیسی، بے توقیر کم مایہ۔

''ساری چائے اُبل گئی۔ چولہا خراب ہو گیا۔ اندھی ہے کیا۔'' اُس نے فاخرہ کے پیٹ پر لات ماری، اس سے پہلے کہ فاخرہ اپنا بچاؤ کرتی فضا، صبا اور اسوہ نے آ کر اپنی دادو کو پکڑ لیا تھا۔ خالہ اماں کی دردناک چیخیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ تینوں بچیوں نے اپنی دادو کو زمین پر گرایا ہوا تھا اور دانتوں اور ناخنوں سے اُسے کاٹ رہی تھیں۔ چٹکیاں کاٹ رہی تھیں۔ خالہ اماں واویلا مچا رہی تھی۔ فاخرہ زمین سے اُٹھی تو کچھ لمحے تو وہ شاک کی کیفیت میں یہ منظر دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر خالہ کو اُن کے چنگل سے آزاد کروایا۔

''ہائے میرے ربا، مجھے کھا گئیں چڑیلیں، میرا خون نکال دیا، جیسی ماں حرافہ ویسی ہی چنڈالیں ہیں۔ یہ حرام زادیاں۔'' خالہ اماں اپنے بازوؤں کو دیکھ کر رو دی، دانت کھبے ہوئے تھے اُن کی سوکھی کلائیوں میں۔ خون بھی رس رہا تھا۔ وہ صحن میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی، کوسنے بددعائیں دینے لگی۔

''اب پتا چلا کتنی تکلیف ہوتی ہے۔'' تینوں بہنوں نے زبانیں نکال کر دادو کو چڑایا اور اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔ فاخرہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ خوش ہوتی یا مغموم اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

مگر آج پہلی بار اُس نے اپنے اندر ڈھیروں اطمینان اُترتا دیکھا وہ اکیلی نہیں تھی کوئی اُس کا تھا اُس کو بچانے والا، اُس کا اپنا۔ فاخرہ تو عادی ہو چکی تھی۔ مار کھانے کی یا شاید ڈھیٹ بھی، یا پھر اذیت پسند۔

خالہ اماں فاخرہ کو اور اس کی بیٹیوں کو گالیاں دیتی رہیں۔ برا بھلا کہتی رہی مگر وہ اتنی بے دم ہو چکی تھی۔ اس وقت کہ دوبارہ اُس نے فاخرہ پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی اور بکتی جھکتی اُٹھ کر اندر زمان کے پاس چلی گئی۔ فاخرہ نے کپڑے دھو کر تار پر پھیلائے اور کپڑے مشین میں ڈال کر پھر کچن میں آ گئی اور دلیہ بنانے لگی پھر دلیے کی بھاپ نکال کر اُسے ٹھنڈا کر کے پلیٹ میں ڈال کر فاخرہ زمان کو دینے گئی تو خالہ اماں اُس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''زمان دلیہ کھلاؤں۔'' فاخرہ نے پاس بیٹھ کر کہا۔

''نہیں مجھے نہیں کھانا۔'' وہ ساٹھ سال کا تھا آج کل اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔

''کیوں نہیں کھانا۔''

''بچیوں نے اماں سے اتنی بدتمیزی کی، اُن کو کاٹ ڈالا اور تم چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں۔'' اُس نے ہاتھ اِدھر اُدھر مار کر اپنی لاٹھی ٹٹولی اور اندازے سے فاخرہ کو ماری اُس کی کمر میں لگی۔ ایک زوردار آہ بلند ہوئی اور کمرے کی فضا میں گم ہو گئی۔

''دفع ہو جا یہاں سے بدکردار عورت، گندگی کی پوٹ، نظروں سے دور ہو جا۔'' وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

''زمان تمہیں میں کون سا نظر آتی ہوں جو تمہاری نظر سے دور ہو جاؤں۔''

''مجھے اندھا ہونے کا طعنہ دیتی ہے نا گھٹیا عورت، جا دفع ہو جا۔ تُو اس قابل بھی نہیں تھی کہ تجھے کوئی اندھا لولا لنگڑا بھی قبول کر لیتا۔''

''کون جانے زمان، کون کس کے قابل تھا۔ یہ تو وقت کے ہیر پھیر ہیں۔ تقدیر کے فیصلے تھے یا اپنوں کی ستم ظریفی کہ آج میں ان حالوں میں ہوں۔'' وہ دکھ سے ہنسی ایسی ہنسی جیسے بہت سے کانچ ایک ساتھ ٹوٹے ہوں۔

''اب تیری زبان بھی چلنے لگی ہے بدتمیز عورت۔ بھول رہی ہو کہ شوہر کا اسلام میں کیا مقام ہے۔''

(اس خوب صورت ناولٹ کی
اگلی قسط ماہ مئی میں ملاحظہ فرمائیں)

آنے والا وقت کیا دکھانے والا ہے یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ بات کچھ ایسی تھی کہ کسی سے رائے مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کیوں کہ ذلت اور بدنامی اپنی ہی تھی۔ ہمیشہ بیٹی کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور شوہر کو ہر بات سے لاعلم رکھا تھا کیوں کہ انہیں اچھی طرح......

رشتوں کو یقین اور اعتماد دیتا ایک افسانہ

رات پھر موسلا دھار بارش ہوئی تھی جھلسا دینے والی گرمیوں کے بعد وقفے وقفے سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا امیر اور باحیثیت لوگ تو اس سہانی رات کو خوب انجوائے کر رہے تھے مزے لوٹ رہے تھے جبکہ غریبوں کی جانوں پر بنی ہوئی تھی کچے اور خستہ حال گھروں کی چھتوں نہ صرف ٹپک رہی تھیں بلکہ اب تو زار و قطار رو رہی تھی۔ صالحہ بیگم نے باورچی خانے کے سارے برتن نکال کر اس جگہ رکھ دیے جہاں بارش نے نقب لگائی تھی۔ برتنوں کی دکان لگانے کے بعد انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی ماہ رو کو آواز لگائی۔ ''ارے ماہا اٹھ جا بیٹے تیرے ابو باہر صحن سے پانی نکال رہے ہیں آتے ہی ناشتہ مانگے گے تمہیں پتا ہے وہ تاخیر برداشت نہیں کرتے ہیں۔ میں اگر کچن کے کاموں میں مصروف ہوگئی تو اور حشر خراب ہو جائے گا۔ اٹھ جا میری چاند اور جلدی سے ناشتہ بنالے۔'' ماہ رو نے گرم لحاف میں منہ چھپاتے ہوئے منمناتی آواز میں کہا۔''

نہ اماں نہ، میں تو آج بستر سے نہیں نکلنے والی۔ آج تو آپ کو ہی مجھے اور بابا کو ناشتہ کروانا ہوگا۔ ویسے ہی پچھلے دو دن سے گیس غائب ہے چولہے میں جلنے والی لکڑیوں کا حال آپ دیکھ رہی ہیں سارا گھر دھویں سے بھر جائے گا لیکن وہ لکڑیاں آگ نہیں پکڑے گی۔ نہ بابا میں باز آئی ان گیلی لکڑیوں سے۔ ہمارے ملک میں کبھی بجلی کی لوڈشیڈنگ، کبھی گیس کی پتا نہیں ان مسائل سے کب پاکستان کو چھٹکارے ملے گا۔ صالحہ بیگم نے جب دیکھا کہ ان کی ضدی اور ہٹ دھرم بیٹی ٹس سے مس نہیں ہوئی ہے بلکہ بجائے ناشتے کہ اس نے ایک طویل تقریر ماں کو سنا ڈالی۔ لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ بالآخر خود ہی کچن میں گھس کر چولہا سیدھا کیا تھوڑی ہی دیر میں انہیں پتا چل گیا کہ برسات سے بھیگی ہوئی لکڑیاں خود تو جل نہیں رہی ہاں البتہ ان کا خون ضرور جلا رہی ہیں۔

صالحہ بیگم اور فیاض الدین کی اکلوتی اولاد ماہ رو کافی منتوں مرادوں بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ تھی بھی اسم بامسمی، انتہائی خوش شکل اور جاذب نظر۔ فیاض احمد بیٹی کو دل و جان سے چاہتے تھے لیکن بے جا لاڈ پیار کے خلاف تھے جبکہ صالحہ بیگم نے اسے سر چڑھا رکھا تھا۔ باپ کے سامنے تو ماہ رو ڈری سہمی

رہتی تھی لیکن ماں کے سر پر سوار ہو کر اپنی ہر اچھی بری
بے جا بات منوا کر ہی دم لیتی تھی۔

جب تک بچپن کا دور دورہ تھا۔ صالحہ بیگم بغیر کسی
عذر و حجت کے اس کی ہر ضد ہر ہٹ پوری کر کے خوشی
محسوس کرتی تھیں لیکن اب تو خیر سے وہ بی اے فائنل
میں تھی لیکن مزاج میں ابھی تک ضد اور سرکشی تھی
دوسرے ماں کا لاڈ و پیار اور اس پر طرہ امتیاز ہمارا میڈیا
جو نوجوان نسل کے لیے زہر کا دلدل بنا ہوا ہے۔ فلم
اسٹارز، سنگرز، کرکٹ پلیئر ہماری نئی نسل کے خوابوں
خیالوں بلکہ ان کی سانسوں میں لپٹے ہوئے ہیں پڑوس
کی ہنڈیا تو ہمارے بچوں کو ایسی چٹپٹی اور مزیدار لگتی ہے
کہ لڑکے اگر ایشوریا اور کرینہ کے حسن و جمال پر فدا
ہیں تو لڑکیاں سلمان اور شاہ رخ کے کسرتی اور متناسب
جسم و جاں پر فریفتہ ہیں۔ گھر کے بڑوں کا غلط رویہ اور
منفی طرز فکر اس چیز کو اور ہوا دے رہی ہے۔ اماں ابا
بذات خود اس کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے ہیں کہ ان
کی بیٹی شاہ رخ اور ابراہیم کی اداؤں پر جان دیتی ہے
اور بیٹے پریانکا اور کترینا کے عشق میں گرفتار ہیں۔۔
احمقوں کی اس جنت میں غیر تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں بلکہ
پڑھے لکھے باشعور افراد بھی شامل ہیں نقل کے لیے بھی
عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نئی پیڑھی ان کی
بول چال، اٹھنا بیٹھنا، لباس، ہیئر اسٹائل کی تو پوری پوری
کاپی کرتے ہیں لیکن کبھی ان کی لگن انتھک محنت اور جان
لیوا شفقت پر ایک نظر نہیں ڈالتے۔ یہ نہیں سوچتے کہ
دولت اور شہرت انہیں یوں ہی نہیں ملی بلکہ ان لوگوں نے
اپنے آرام کو اپنے آپ پر حرام کیا تب جا کر بین الاقوامی
شہرت نصیب ہوئی ہے اور دھن دولت کی بارش ہوئی ہے۔

فیاض الدین اور صالحہ بیگم کی لاڈلی بھی کیبل پر شاہ
رخ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر ایسی دیوانی ہوئی کہ اسے چلتے
پھرتے، جاگتے سوتے، ہر سو کنگ خان ہی نظر آنے
لگے۔ اور پھر کالج جاتے ہوئے محلے کہ ایک نوجوان پر نظر
پڑی تو اس میں اسے اپنے پسندیدہ اسٹار کا عکس نظر آیا۔
اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ممبئی فلم انڈسٹری سے اس کے
خوابوں کا شہزادہ اڑ کر اس کے پاس چلا آیا ہے اور بس

یہیں سے اوائل عمری کے اس احمقانہ عشق کی شروعات ہو گئی اور جب صالحہ بیگم کو بیٹی کے اس کارنامے کا پتا چلا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ان کی روح فنا ہو گئی۔ کیوں کہ بیٹی کی پسند اور کوئی نہیں محلے کا ناکارہ نکھٹو نوجوان شاہنواز عرف شانو تھا۔ جو شاہ رخ کی حرکات وسکنات کی نقل کرتے کرتے اپنے آپ کو شاہ رخ خان سمجھنے لگا تھا جس کے پاس تعلیم کے نام پر صرف میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا جب تک باپ کی کمائی رہی عیاشیاں ہوتی رہی جب باپ دنیا سے سدھارے اور اپنی کی کمائی کا وقت آیا تو گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ ماں کی سلائی وکشیدہ کاری کی کمائی اور بہن کی پرائیویٹ اسکول کی چھوٹی موٹی تنخواہ کا سہارا نہ ہوتا تو شاہ رخ کے اس ڈپلیکیٹ کو دن میں تارے نظر آ جاتے۔ بیوہ ماں اور جوان بہن کے ساتھ ہمیشہ دانتا کل کل ہوتی لیکن اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ جسم کی ہڈیاں اتنی آرام طلب ہو گئی تھیں کہ کام کے نام سے جان جانے لگتی۔ دور جدید کی لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہر کی شکل وصورت کے بعد میں دیکھتی ہیں اور جیب پر پہلے نظر ڈالتی ہیں لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا ماہ رو پر روز روشن کی طرح شانو کے حالات عیاں تھے لیکن اس کے باوجود وہ جیتی جاگتی مکھی نگلنے کو تیار تھی کیوں کے شانو اس کے لیے شانو نہیں بلکہ شاہ رخ خان تھا۔

دونوں ماں بیٹی کی اس معاملے پر کئی بار تلخ کلامی ہوئی۔ صالحہ بیگم نے تو پہلے اپنی بیٹی کو اس کے باپ کا خوف دلایا کہ وہ کسی بھی قیمت پر شانو جیسے لفنگے کا رشتہ قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی خاندان کے دوسرے افراد کے لیے یہ رشتہ قابل قبول ہوگا اس کے علاوہ انہوں نے بیٹی کو اونچ نیچ اچھے برے سے آگاہ کیا۔ اسے سمجھایا کے حسن وعشق کے ڈرامے کہانیوں اور ناولوں اور افسانوں میں تو بہت اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دنیا ایک سنگین حقیقت ہے کوئی سنہرا خواب نہیں۔ تصورات اور سپنوں کے سہارے کوئی کام نہیں ہوتا جب شادی کے بعد زندگی کے ٹھوس حقائق سے واسطہ پڑے گا تو بولتی بند ہو جائے گی۔ شانو آج تک اپنی ماں اور بہن کے لیے کچھ کر نہ سکا تو زندگی بھر تیرا کیا بار اٹھائے گا۔ وہ صرف تجھے سبز باغ دکھا رہا ہے۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بہلا رہا ہے ماں بہن کی کمائی پر زندگی گزارنے والا بھلا بیوی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔

ماہ رو نے ماں کی ساری سخت شست سنی لیکن پھر بھی بس اس کا ایک ہی جواب ہوتا شادی کروں گی تو صرف شانو سے کیوں کیوں کہ وہ ہنستا ہے تو شاہ رخ کی طرح مسکراتا ہے، شاہ رخ کی طرح چلتا پھرتا ہے، بلکہ بولتا بھی شاہ رخ کی طرح ہکلا ہکلا کر ہی ہے۔ صالحہ بیگم بیٹی کا یہ سودائی پن دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتیں تفکرات اور اندیشوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔

آنے والا وقت کیا دکھانے والا ہے یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ بات کچھ ایسی تھی کہ کسی سے رائے مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھیں کیوں کہ ذلت اور بدنامی اپنی ہی تھی۔ ہمیشہ بیٹی کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور شوہر کو ہر بات سے لاعلم رکھا تھا کیوں کہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ فیاض الدین کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑی تو الٹی آنتیں گلے میں پڑے گی۔ چور کے گھر چوری ہو جائے تو با آواز بلند رو بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح صالحہ بیگم بھی زبان اور ہونٹ سی کر بیٹھ گئی تھیں۔ اگر ماہ رو کے رشتے کے سلسلے میں کوئی بات بھی کرتا تو بڑی صفائی سے یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ ہماری بیٹی کا ارادہ ماسٹرز کرنے کا ہے ابھی شادی کا کوئی خیال نہیں اس کا ارادہ ہے کہ ملازمت حاصل کرنے کے بعد شادی کرے گی۔ بات کرنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا لیکن آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا۔ صالحہ بیگم کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی اس وقت بجی جب فیاض الدین نے کراچی سے آ کر انہیں بتایا کہ ان کے مرحوم دوست نواز احمد کی بیگم نے اپنے

بیٹے صبور کے لیے ہماری بیٹی کو پسند کیا ہے بیگم نور احمد اکثر ان کے گھر آیا جاتا کرتی تھیں لیکن اس بار وہ عنقریب اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ رہی ہیں شوہر کے منہ سے یہ بات سن کر صالحہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہوگئیں تھیں وہ خطرناک گھڑی آن پہنچی تھی جسے وہ اپنی دانست میں ابھی تک ٹالتی آ رہی تھیں کافی دیر تک وہ اپنے دماغ میں کھچڑی پکاتی رہیں پھر انہوں نے اپنی تمام ہمت اور حوصلہ مجتمع کر کے بڑے محتاط لہجے میں کہا فیاض الدین کو ایک نظر دیکھا اور ٹھوس حتمی لہجے میں کہا ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے مجھے بڑا ارمان ہے کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائیں شادی کی ایسی کیا جلدی ہے۔'' اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں اگر ماہ رو اپنی تعلیم جاری بھی رکھے گی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب بیگم نور احمد بات چھیڑے گی تو ہم بھی اپنی بیٹی کی آئندہ تعلیم کی ڈیمانڈ اس نے سامنے رکھ دیں گے۔ میاں کے جواب پر صالحہ بیگم بغلیں جھانکنے لگیں۔ دل کی دھکڑ پکڑ ایک طلاطم پیدا کر رہی تھی۔ باپ بیٹی کے درمیان کوئی معرکہ نہ ہو جائے۔ وہ دل ہی دل میں رب کو یاد کر رہی تھیں۔ ایسے مسائل جس کا حل انسان کے پاس نہیں ہوتا تو بے اختیار نظریں مالک حقیقی کی طرف جاتی ہیں کیوں کہ جس وقت کچھ نظر نہیں آتا اس وقت صرف اور صرف اللہ نظر آتا ہے۔

ہر لڑکی مستقبل کے بارے میں ہونے والی باتوں پر نہ صرف کان رکھتی ہے بلکہ نظریں بھی رکھتی ہے ماں باپ میں جو خفیہ اور اہم نوعیت کی میٹنگ ہو رہی تھی اس کی سن گن ماہ رو کو ہو چکی تھی۔ پیش آئندہ حالات کا ادراک اسے بھی بخوبی تھا باپ کے سامنے تو لب کشائی کی ہمت نہیں تھی لیکن ماں کو وہ لرزا دینے والی دھمکی دے چکی تھی کہ اگر اس کی شادی شانو کے علاوہ کسی اور سے کی گئی تو وہ خودکشی سے گریز نہیں کرے گی۔ بیٹی کی زبان سے یہ جملہ سن کر صالحہ بیگم زندہ درگور ہوگئیں۔ وہ ایک اذیت ناک عذاب سے دوچار تھیں۔ اسٹریس کی وجہ سے بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ماہ رو کالج سے گھر آئی تو صالحہ بیگم نے اسے یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ شانو کے گھر چوری ہوگئی ہے چور ساری جمع پونجی لے گیا اور سب ہاتھ ملتے رہ گئے، ماہ رو سکتے میں رہ گئی۔ کیوں کہ شانو کے گھر کے حالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے بلکہ فی الوقت تو اس کے گھر چوہوں نے بھی فارغ خطی لے کر دوسرے گھروں کا رخ کر لیا تھا۔ پھر بھلا چور کو اس گھر میں کیا ملا ہوگا اپنا وقت ہی ضائع کیا ہوگا کم بخت نے۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں بولائی بولائی سی پھرتی رہی۔ شانو سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی تاکہ چوروں کی روداد سن سکے۔ وہ تو خیر ہوئی بی پڑوسن زبین خالہ کی جو وقت پر آ گئی اور صالحہ بیگم سے علیک سلیک کے بعد کہا۔

'' اے صالحہ ذرا شانو کے گھر چلوگی۔ سارے محلے میں شور ہے کہ چوری ہوگئی ہے۔ شانو کی بہن اور ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہیں بد بخت اٹھائی گیرئیے نے مرے ہوؤں کو مار دیا۔ صالحہ بیگم ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں اور پھر تیار ہو کر پڑوسن کے ہمراہ شانو کے گھر روانہ ہوگئیں۔ ماہ رو گھر میں تن تنہاء تھی اور بے تابی سے ماں کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ تفصیل معلوم ہو سکے کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اٹھ کر ٹی وی آن کیا اور تھوڑی ہی دیر میں اکتا گئی۔ ٹی وی بند کر کے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی اسی اثناء میں صالحہ بیگم اور خالہ زبین باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ دونوں کا موضوع گفتگو شانو کے گھر میں ہونے والی چوری ہی تھا۔ صالحہ بیگم نے ماہ رو کو آواز دے کر کہا ماہا خالہ زبین کے لیے شربت اور کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔ خالہ زبین انکار کرتی رہیں لیکن صالحہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی تخت پر بیٹھ گئیں۔ خالہ زبین نے پھر

شانو کے گھر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور سرگوشانہ والے انداز میں کہا۔ ''اے صالحہ تم کچھ بھی کہو میں تو حق لگتی کہوں گی۔ گھر کے بھیدی نے ہی لنکا ڈھائی ہے ماں بیٹی نے دانتوں کا رس پی پی کر شادی کے لیے پائی پائی جوڑی تھی۔ ساری محنت کی کمائی ایک جھٹکے میں چلی گئی۔ دونوں کی آنکھ کا آنسو نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ اور وہ موا مارا شانو پلنگ پر لیٹا سگریٹ دھنک رہا تھا کش پہ کش لگا رہا تھا چہرے پر کوئی تردد کوئی پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صالحہ بیگم نے ایک گہری سانس لی اور کہا'' کیا کہہ سکتے ہیں زبین بہن کون چور ہے اس دور کے تو نوجوانوں کا مقدر ہی بیروزگاری بن گیا ہے۔ پیٹ کی بھوک اور افلاس انہیں جرائم کے راستے پر ڈال رہی ہے۔ دراصل یہ افلاس ہی جرائم کی ماں ہے۔ زبین نے تڑخ کر فوراً کہا۔ ''لو اور سنو تم نے بھی خوب کہی بیروزگاری اور ناکامی کی اصل وجہ تقدیر نہیں بلکہ ہڈ حرامی بدنیتی اور بدعملی ہے تم نے میرے بیٹے احمد کو دیکھا ہے کم پڑھا لکھا ضرور ہے لیکن کام چور نہیں چھوٹی عمر میں ہی ایک بیکری میں کام کرتا تھا محنت اور نیک نیتی سے کام کیا۔ سارا ہنر اور گر سیکھنے کے بعد اپنی ہی جمع پونجی سے کرائے کی جگہ پر اپنی بیکری کی داغ بیل ڈالی اور پھر ماشاء اللہ اپنی محنت اور لگن سے کس طرح اپنے کاروبار کو چمکایا ہے۔ آج ماشاء اللہ لاکھوں کما رہا ہے۔ سارے مارکیٹ میں سب سے بڑی فیکٹری ہے میرے بیٹے کی۔'' صالحہ بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ درست کہہ رہی ہو زبین بہن محنتی انسان کے گھر مفلسی باہر سے جھانک کر بھاگ جاتی ہے جبکہ نکمے اور کام چوروں کے گھر ڈیرے ڈال کر راج کرتی ہے۔'' ماہ روبنا تو رہی تھی میٹھا میٹھا شربت لیکن ماں اور پڑوسن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر زہر کے کڑوے گھونٹ حلق کے نیچے اتار رہی تھی۔ اس چوری نے اس کے دلبر جانی کا کردار مشکوک بنا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں چور کو گالیاں دے رہی تھی زبین خالہ کے رخصت ہونے کے بعد اس نے جلے کٹے لہجے میں ماں کو مخاطب کر کے کہا۔

''بدگمانی کی بھی حد ہوتی ہے خالہ زبین بغیر سوچے سمجھے شانو پہ اتنی بڑی تہمت لگا رہی ہے وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔

صالحہ بیگم نے خشمگین نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا اور کہا'' صرف زبین نہیں بلکہ وہاں جتنی عورتیں تھیں سب میں ہی یہی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں کہ چور باہر سے نہیں آیا تم کس کس کی زبان پکڑو گی اور میں بھی یہ ہی کہوں گی زبان خلق نقارہ خدا است۔'' ماں کی زبان سے کھری کھری سن کر ماہ رو کا رہا سہا موڈ مزید غارت ہو گیا وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کو کھانے کے بعد جب اس کی امی اور ابو کمرے میں چلے گئے تو ماہ رو نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے فوراً اپنے سیل فون سے شانو کا نمبر ملایا اور اس کے گھر کی چوری پر اظہار افسوس کیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ جواباً شانو کی دل گرفتہ اور غمگین آواز اسے سنائی دے گی لیکن خلاف توقع شانو کا زبردست قہقہہ اس کی سماعت سے ٹکرایا اور اس نے استہزائیہ انداز ہنستے ہوئے کہا۔

''جان شاہ رخ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں ذرا اپنا اپر چیمبر استعمال کرو۔ اماں اور آپا کے جمع جتھے پر میں نے ہی ہاتھ صاف کیا ہے دراصل وہ دونوں کافی عرصے سے جوڑ توڑ میں لگی ہوئیں تھیں اور مجھ سے اس طرح چھپا رہی تھیں جیسے بلی سے دودھ چھپایا جاتا ہے۔ دونوں کو میرا ذرا سا بھی خیال نہیں تھا کہ اسے بھی چار پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے بھی ان کی ساری نقدی اور سونا چاندی پر ہاتھ صاف کر لیا۔

حقیقت جان کر ماہ رو بالکل سکتے میں رہ گئی۔ ماں اور زبین خالہ کی باتیں دماغ میں گونجنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھی بڑوں کے تجربات کتنے صحیح ہوتے ہیں اور کتنے مثبت نتائج اخذ کرتے ہیں۔ شانو کا انکشاف اس پر بجلی بن گرا تھا اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ شانو ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر منہ مارتی ہے اور تم نے اپنا

ہی گھر لوٹ لیا۔تمہاری ماں نے تمہاری بہن کی شادی کے لیے جو پیسہ جوتولہ ماشا اکھٹا کیا تھا اسے ہی لے اڑے تمہیں شرم نہیں آئی۔اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا شانو نے ڈھٹائی اور بے غیرتی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی۔

ماہ رو نے غصے سے دانت پیستے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ موبائل آف کیا اور بستر پر گر گئی۔خون کی گردش تیز ہو چکی تھی اس رات وہ اتنا روئی جتنا ساری زندگی نہیں روئی تھی اسے شانو سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔وہ آنکھیں موندے پڑی رہی اس طرح پوری رات گزر گئی۔

☆......☆......☆

فیاض نے تپائی سے صبح کا اخبار اٹھایا ابھی ورق گردانی ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی انہوں نے اخبار رکھا دروازہ کھول کر جھانکا تو انکے چہرے پر رونق آگئی۔ان کے سامنے ان کے دوست کا بیٹا صبور احمد تھا۔

فیاض نے والہانہ انداز میں اسے لپٹا لیا وہ بہت خوش تھے۔انہوں نے صالحہ بیگم کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو کون آیا ہے۔

صالحہ بیگم نے بھی بڑی خوشدلی کے ساتھ صبور کا استقبال کیا ماہ رو ابھی تک بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی ساری رات بے چینی رہی تھی۔آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی اور وہ ایک عجیب سی بیزار کن اور اعصابی تناؤ کا شکار تھی۔والدین اور آنے والے مہمان کی گفتگو وہ بخوبی سن رہی تھی کیوں کہ چھوٹے گھروں کی ایک خوبی یا خامی یہ ہوتی ہے کہ کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی بلکہ خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔صالحہ بیگم کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا وہ صبور سے کہہ رہی تھیں کہ ارے بیٹا اکیلے ہی چلے آئے امی کو بھی ساتھ لے آتے۔”جواباً صبور نے کہا آنٹی دراصل ہم لوگ کل ہی حیدر آباد پہنچے ہیں۔پھوپی کے گھر قیام کیا ہے میں گھر سے نکلا تو امی آرام کر رہی تھیں امی اور پھوپھو آپ سے کل ملنے کے لیے آئیں گی۔مجھے آج شام ہی کراچی جانا ہے اور کل ڈیوٹی جوائن کرنی ہے دونوں بہنوں کی شادیوں کے کارڈ تقسیم کرنے ہیں وقت کم ہے اور کام زیادہ۔اس لیے میں صبح ہی صبح نکل پڑا۔اتنی صبح آنے کے لیے معذرت آپ لوگ بھی ڈسٹرب ہو گئے۔فیاض احمد اور صالحہ بیگم نے اسے پیار سے دیکھا۔”ہرگز نہیں بلکہ ہمیں تو بہت اچھا لگا ہے۔اچھا تم انکل کے ساتھ باتیں کرو میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔یہ کہہ کر صالحہ بیگم وہاں سے اٹھ گئیں وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ماہ رو کمرے میں آئیں۔ماہ رو گم صم اداس چت لیٹی چھت گھور رہی تھی۔

صالحہ بیگم نے اس کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔”ماہا اٹھ جاؤ جلدی سے فرج میں سے شامی کباب کی ٹکیاں اور انڈے نکال رہی ہوں آٹا بھی گندھا رکھا ہے ذرا جلدی ناشتہ تیار کردو۔میں اور تمہارے ابو مہمان کے ساتھ ہی ناشتہ کریں گے ماہ رو کی سمجھ میں اچھی طرح بات آگئی تھی کہ مہمان کون ذات شریف ہے۔کیوں کہ پچھلے کئی دنوں سے وہ صبور احمد کا تذکرہ ماں اور باپ کی زبان سے زور وشور سے سن رہی تھی۔یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر نہیں تھی کہ کل صبور احمد کی والدہ اور پھوپھی کیوں تشریف لا رہی ہیں رات سے ویسے ہی اس کا موڈ اور مزاج خراب تھا۔پھر مرے پہ سو درے صبور کی آمد۔ دل ودماغ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔شانو کے ساتھ ہونے والی گفتگو کسی زہریلے ناگ کی طرح ذہن میں کلبلا گئی صالحہ بیگم نے جیسے ہی ناشتے کا حکم صادر کیا۔اس نے لیٹے لیٹے تیوری چڑھا کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”باہر سے حلوہ پوری ناشتہ منگوا کر جان چھڑائیں اور مجھے سونے دیں۔صالحہ بیگم نے ایک قہر آلود نظر بیٹی پر ڈالی اور سرد لہجے میں کہا۔

مجھے کوئی ضرورت نہیں تمہارے مشورے کی، جو کچھ کرنا ہے میں کرلوں گی۔تم بس آرام کرتی رہو۔

اب آئندہ میں تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہوں گی۔ صالحہ بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ ماہ رو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی رہی لیکن اب اس کے کان برابر والے کمرے میں ہونے والی باتوں پر لگے ہوئے تھے پہلے تو دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتے رہے پھر فیاض الدین نے اس کے مرحوم والد کو یاد کرتے ہوئے ماضی کے اوراق الٹے وہ کہہ رہے تھے۔'' بیٹا جب تمہارے والد کا انتقال ہوا تم وقت تم تینوں بھائی بہت چھوٹے تھے۔ اللہ تمہاری ماں کا سایہ تم لوگوں پر قائم دائم رکھے۔ بڑی باہمت اور حوصلہ مند خاتون ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی انہوں نے جو تم لوگوں کے لیے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صبور نے نہایت سعادت مندانہ انداز میں جواباً کہا۔

آپ درست فرما رہے ہیں انکل، اللہ کے بعد وہی ہمارا سہارا تھیں ہمارے ماموں اور دیگر رشتہ داروں نے مالی امداد کرنے کی کوشش بھی کی تو امی نے بڑی شائستگی سے منع کر دیا۔ ان کی خودداری نے یہ گوارہ ہی نہ کیا تھا۔ ابو کی پینشن کے علاوہ خود گھر میں ٹیوشن پڑھاتی تھیں ہم لوگوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ اسی کی بدولت آج ہم سر اٹھا کے کھڑے ہیں۔ میری ملازمت کے فوراً بعد ہی امی چاہتی تھیں کہ میں شادی کر لوں لیکن میں نے سختی سے انکار کر دیا کیوں کہ میری شادی سے اہم دونوں بہنوں کی شادیاں تھیں اسی ماہ ہم لوگ انشاء اللہ اس فریضے سے سبکدوش ہو جائیں گے اپنا ذاتی مکان بھی ہم لوگ کر چکے ہیں۔ اسی سال اللہ نے چاہا تو ان کی سب سے بڑی خواہش حج بیت اللہ کی زیارت پوری کروں گا پھر اپنی شادی کے بارے میں سوچوں گا۔ ابھی تک امی نے ہم لوگوں کے لیے کیا اب ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے کچھ کریں۔ فیاض الدین نے بے ساختہ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ اور اس کے خیالات اور نظریات کو سراہتے ہوتے استفسار کیا۔ تم نے مکان خریدا ہے یا فلیٹ صبور نے جواباً کہا۔'' جی انکل مکان ہے بس قسمت سے بہتر ایریا میں مناسب داموں میں مل گیا ہے۔ اور میں نے بھی فوری یہ کام اس لیے کیا کہ میری امی میری شادی کے لیے بہت بے چین تھیں اور میں نہیں چاہتا جو لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر میرے گھر میں قدم رکھے اسے میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچے۔ میری کوشش ہوگی کہ اسے وہ تمام آرام و آسائش فراہم کروں جس کے لیے لڑکی خواب دیکھتی ہے۔

فیاض الدین صبور کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی تعریف کیے جا رہے تھے ماہ رو کی سماعت سے ٹکرا کر اس کا ہر لفظ دل میں اتر رہا تھا۔ مہذب انداز گفتگو شائستہ لب و لہجہ دل میں ہل چل پیدا کر رہا تھا۔ بے ساختہ دل میں مہمان کو دیکھنے کی امنگ جاگی اس نے تو بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ دراز قامت اور قبول صورت صبور اچھا ہی نہیں بلکہ بہت اچھا لگا بلکہ اس سے بھی اچھی اس کی سوچ اور خیالات لگے۔ وہ بغور اسے دیکھے جا رہی تھی۔ صبور کی رنگت گہری سانولی ضرور تھی۔ تاہم جنس مخالف کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ ایک ہی پل میں شاہ رخ کا ڈبلیکیٹ ریزہ ریزہ ہو کر خاک کی نذر ہو چکا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دونوں کے خیالات و نظریات اور سوچوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ اب تک سراب کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فیاض الدین اس سے اس کی تعلیم کے بارے میں ضرور سوال کریں۔ اور شاید دونوں باپ بیٹی کے درمیان کی یہ ٹیلی پیتھی ہی تھی کہ جو اگلا سوال فیاض الدین نے یہی کیا کہ۔

'' صبور بیٹا تم نے اپنی تعلیم اور ذریعہ معاش کے بارے میں نہیں بتایا کیا کرتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ استفسارانہ نظروں سے صبور کو دیکھنے لگے۔ صبور نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔'' انکل میں نے بی

ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل ٹیکنیشن کا ڈپلومہ لیا اور ایک پرائیویٹ لیب میں کام کر رہا ہوں اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر اسپیشلسٹ کی سرکردگی میں بحثیت اسسٹنٹ کام کیا اب ماشاء اللہ اتنا تجربہ ہوگیا ہے کہ مختلف عناصر کو پرکھنے کے بعد حتمی نتائج اخذ کرسکتا ہوں میری اسی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کراچی ایسوسی ایٹ نے مجھے مستقل ملازمت کی آفر کی اور میں نے فوراً قبول کرلی نہ صرف معقول تنخواہ بلکہ آگے ترقی کے بھی مواقع ہیں۔ بات ختم کرکہ اچانک اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھیں اور وہاں جو چہرہ اسے نظر آیا وہ دل کو ایسا بھایا کہ وہ نظر ہٹانا ہی بھول گیا۔ ماہ رو نے جب دیکھا اس کی چوری پکڑی گئی ہے تو وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہوکر تیز تیز چل رہی تھیں لیکن چہرے پر طمانیت اور خوشی کے عکس لرزاں تھے۔ تھوڑی دیر پہلے کی اداسی اور مایوسی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ منہ ہاتھ دھوکر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر اسے خود پر پیار آ گیا۔ اندرونی خوشی ایک چمک بن کر، اس کے چہرے پر بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی وہ مسکراتی ہوئی۔ صالحہ بیگم کے پاس کچن میں پہنچ گئی۔ صالحہ بیگم بہت تیزی سے پراٹھے بنانے میں مصروف تھیں چہرے پر فکر تردد اور پریشانی کے آثار تھے۔ بیٹی کو دیکھ کر خفگی سے منہ پھیر لیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئیں ماہرو نے ماں کی گردن میں اپنے باز حمائل کرتے ہوئے معذرت خواہانہ اور محبت پاش لہجے میں کہا ''میری امی اچھی امی۔'' میں اپنی بدتمیزی، من مانی اور خود سردی کی تہہ دل سے معافی چاہتی ہوں۔ آپ کا اور ابو کا انتخاب بالکل صحیح ہے آپ کی اور ابو کی دعاؤں نے مجھے ایک بہت بڑے جہنم میں گرنے سے بچالیا ہے۔'' ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہوگئی اور پھر ماں کے ہاتھ سے کام چھینتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔'' امی میں بہت شرمندہ ہوں آپ ابو کے پاس جایئے باقی سارا کام میں دیکھ لوں گی۔ جب ناشتہ تیار ہوجائے گا تو آپ کو آواز دے دوں گی۔ صالحہ بیگم نے استعجاب انگیز نظروں سے بیٹی کو دیکھا کہا۔

یہ اچانک کیا معجزہ ہوگیا ہے یا پھر ماں کے ساتھ کوئی ناٹک کر رہی ہو۔''

ماہ رو نے شرم سار اور نادم لہجے میں کہا۔ امی آپ ہمیشہ کہتی تھیں نا کہ دلوں کا پھیرنے والا بھی اللہ ہے۔ بس ایک پل ایک لمحے میں اس نے مجھے تاریکی اور غلط راستے سے اٹھا کر صحیح اور سیدھی راہ دکھادی۔ میں اس کوے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ جو ہنس کی چال چلتے چلتے اپنی چال بھی بھول گیا۔'' صالحہ بیگم نے ایک آسودہ گہری سانس لی اور بے اختیار ہوکر اپنی بیٹی کی پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے۔ جوان کی بیٹی ضد اور ہٹ نے ان کا راتوں کا سکون اور دن کا چین غارت کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے بعد ان کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پیار سے دیکھا۔'' تم ذرا دوڑ کر ایک کام کرو فرج میں سے ذرا ربڑی کا پیکٹ نکال کرلے آؤ۔ پہلے میں اپنی بیٹی کا منہ میٹھا کرواں گی۔ ماہ رو کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا اور ایک حیا آلود اور دلکش مسکراہٹ نے چہرے کو اور بھی گلنار بنا دیا۔ تب صالحہ بیگم نے بے اختیار ماہ رو کا ماتھا چوم لیا۔ اللہ نے ان پر کتنا کرم کیا تھا کہ ان کی بیٹی کے تو دل و دماغ میں تو بروقت اچھے اور برے کی تمیز پیدا کر کے نہ صرف، اسے بلکہ پورے خاندان کو کتنی مشکلات اور اذیت آمیز، پریشانیوں سے بچالیا تھا۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا بھی نکلی تھی کہ کاش اب کسی اور ماں کو، ان کی بیٹی اس اذیت سے نہ گزارے۔ جس سے وہ گزری تھیں۔

☆☆......☆☆

''ارے بیٹا! آج خیر تو ہے۔ تم کچن میں! کہیں سورج مغرب سے تو نمودار نہیں ہوا بھابی کہ میری صاحبزادی کچن میں۔'' سکینہ بیگم کچن میں آتے ہی بولیں۔ ''لو آج میں آگئی تو مجھے سنا رہی ہیں اور اگر نہ آتی تو بھی مجھے ڈانتیں۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔ ''آؤ ادھر آؤ شیری بیٹا......

زندگی کے رنگوں سے آباد، ایک مسکراتا مکمل ناول

''ہائے اللہ! کیا کروں میں اس لڑکی کا؟'' سکینہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''تم کب سدھرو گی اور کب لڑکیوں والی حرکتیں کرو گی؟'' انہوں نے غصے سے سامنے کھڑی شیری کو گھورا۔ جو بڑے مزے سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔

''ماما اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اُس نے مجھے تنگ کیا تو میں نے اسے دو کک مارے اور بس!''

''ہیں ہیں کیا؟ بس دو ہی مارے اور اس کا خون نکل آیا۔'' انھوں نے اسے گھورا۔

''چلیں دو چار اور بڑھالیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''بس شیری بس۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب بہت ہو گیا تم پتا نہیں کیا کرو گی؟ مجھے آج ہی تمہارے ڈیڈ سے بات کرنی ہوگی۔''

''کس بارے میں چھوٹی امی۔'' فرہاد اندر داخل ہوتے ہوئے بولا اور اُس نے ہاتھ ہلا کر شیری کو ہیلو کہا۔ جواباً اُس نے ہاتھ بھی ہلایا اور اشاروں میں آگاہ کر دیا کہ ماما کا غصہ مجھ پر ہی ہے۔ حسبِ عادت!

''فرہاد تم ہی اس سے پوچھو! آج اس کا کالج تیسرا دن ہے اور آج ایک لڑکے کی پٹائی بھی کر آئی ہے۔'' بیگم سکینہ نے اُس کے قریب آ کر کہا۔

''اچھا۔'' وہ سر ہلاتا ہوا بولا جیسے معمول کی بات ہو۔ ''چلیں چھوڑیں چھوٹی امی۔ آپ جا کر میرے لیے کچھ لائیں، مجھے بھوک لگی ہے۔ اس سے میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے سکینہ بیگم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے کچن میں کچھ لانے کے لیے گئیں تو اس نے شیری کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیوں؟ آج کیا کر کے آئی ہو؟'' اس نے بھنویں اکٹھا کر کے سوال کیا۔

''ارے کچھ نہیں یار۔ بس ایک لڑکے نے ریگنگ کرنے کی کوشش کی تو تھوڑا سا ہاتھ مار دیا اور گھر خبر پہنچ گئی۔ باقی تو تم جانتے ہو۔'' اس نے صوفے پر بے ترتیبی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یار شیری! کچھ تو لڑکیوں والی حرکتیں کیا کر۔'' اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اب تُو مت شروع ہو جا۔ تجھ میں بھی کبھی کبھی ماما کی روح گھس جاتی ہے۔ اچھا میں نکلتی ہوں کہیں دوبارہ مامانہ آجائیں اور پھر ڈانٹ پڑنا شروع ہو جائے۔ تُو مجھے بعد میں ملنا۔ میں کچھ لائی ہوں۔ دکھاؤں گی تجھے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے ملتا ہوں میں۔" فرہاد نے ہارے ہوئے انداز میں کہا اور وہ اوپر کی منزل کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

شیرازی ولا اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ شہر کے سب سے پوش علاقے میں قائم تھا۔ اس میں دو خاندان بستے تھے۔

منصور شیرازی اور مقصود شیرازی۔ دو بھائی تھے اور ان کی اپنی اپنی فیملی۔

منصور شیرازی کے چار بیٹے تھے۔ جلیل شیرازی، خلیل شیرازی، رمیز شیرازی اور فرہاد شیرازی۔

مقصود شیرازی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ منان شیرازی، نعمان شیرازی اور ارسلان شیرازی بیٹی شرمین شیرازی جس کو پیار سے شیری کہتے تھے۔

شیری بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ گھر میں سات بیٹوں کے بعد یہ واحد لڑکی تھی۔ اس لیے اسے ہاتھ کا چھالا بنا کر پالا گیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو شیرازی ولا میں بڑے پیمانے پر جشن منایا گیا تھا۔ سبھی اس کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔

جب تک وہ چھوٹی تھی تب تک تو سکینہ بیگم، جو کہ مقصود شیرازی کی بیگم اور شیری کی ماں تھیں۔ ان کا بس شیری پر چلتا تھا۔ وہ اسے بڑے خوبصورت فراک پہناتیں، اس کی پونی بناتیں اور اس کام میں اُن کی جیٹھانی برابر کا ساتھ دیتیں۔ زرینہ بیگم بھی شیری سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ہر کوئی اسے گود میں لیے پھرتا اور کہتا یہ بس میری بہن ہے۔ کبھی وہ جلیل کی گود میں ہوتی تو کبھی منان، اس چھوٹی سی گڑیا سے کھیل رہا ہوتا اور رمیز اور نعمان، اسے گود میں لینے کو جھگڑ رہے ہوتے وہ بس سب کے ہاتھوں میں ہی رہتی تھی، مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی اس میں لڑکیوں والی کم اور لڑکوں والی عادتیں زیادہ آتی گئیں۔ جب بھی گھر کے لڑکے شاپنگ پر جاتے اس کے لیے بھی کوئی اچھی سی جینز یا شرٹ لے آتے۔ انہیں لڑکیوں کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

دونوں بیگمات خوش ہوتیں اور اعتراض نہ کرتیں کہ چلو بچی ہے۔ بڑی ہوگی تو خود ہی اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب بدل جائے گا۔"

وہ بچپن ہی سے اپنے بھائیوں سے کافی اٹیچ رہی تھی۔ اس کے خیال میں اس کے چھ بھائی تھے اور فرہاد جو کہ اس سے تین مہینے ہی بڑا تھا وہ تو اس کا جگری دوست تھا۔

فرہاد اور اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تمام حالات سے آگاہ کر دیتے تھے اور ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہ چھپاتے تھے۔

گھر کے لڑکوں کو مختلف شوق تھے۔ کسی کو باکسنگ کا تو کسی کو گارڈننگ کا، کسی کو باڈی بلڈنگ کا تو کسی کو سوئمنگ۔ غرض سبھی لڑکوں کے شوق خود بخود شیری میں آتے چلے گئے۔

اگر کوئی باکسنگ کرتا تو اسے بھی بتاتا کہ کیا کرنا ہے۔ کوئی ویٹ لفٹنگ کرتا تو اسے بھی بتاتا۔ وہ بڑے شوق سے یہ سارے کام کرتی تھی۔

جلیل اور منان ہم عمر تھے۔ اسی طرح خلیل اور نعمان میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ رمیز اور ارسلان میں البتہ دو سال کا فرق تھا، مگر کبھی لگا نہیں اور فرہاد اور

شیری بھی ساتھ ساتھ کے ہی تھے۔
غرض سب کی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ جلیل اور منان شیری سے پندرہ سال بڑے تھے۔ پھر خلیل اور نعمان ان دونوں سے تین سال چھوٹے تھے۔ پھر رمیز، نعمان اور خلیل سے دو سال چھوٹا تھا، ارسلان اس سے دو سال اور آخر میں شیری اور فرہاد ارسلان سے دو سال چھوٹے تھے۔

جب تک شیری چھوٹی تھی تب تک تو ٹھیک تھا، مگر اب وہ سولہ سال کی ہو گئی تھی اور کسی بھی اینگل سے لڑکی نہیں لگتی تھی سوائے بالوں کے جو شولڈر سے نیچے آتے تھے۔

بچپن میں سکینہ بیگم اور زرینہ بیگم اسے خوب لڑکیوں جیسے کپڑے پہناتی تھیں، مگر اسے ہمیشہ بھائیوں جیسے کپڑے پہننا پسند تھے۔ اور حرکتیں بھی ساری بھائیوں والی کرتی تھی۔

جب وہ تیرہ سال کی تھی تب وہ بڑے مزے سے سڑکوں پر سائیکل دوڑاتی پھرتی جو کہ غلطی سے اس نے ارسلان سے سیکھ لی تھی۔ اس کا تو کچھ نہیں گیا مگر سکینہ بیگم نے ارسلان کی کلاس ٹھیک طرح سے لے ڈالی۔

اس گھر میں سکینہ بیگم ہی تھیں جنہیں اس کی لڑکوں والی حرکات وسکنات پر غصہ آتا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے شکایت کرتیں تو وہ ہمیشہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ساتھ دیتے اور ایک ہی جملہ کہتے ''ابھی بچی ہے۔ کرنے دو اپنی مرضی۔'' جس پر وہ الجھ کر رہ جاتیں وہ ہمیشہ چڑ جاتیں اور خاموش مگر زرینہ بیگم انہیں سمجھاتیں کہ جب اسے خود احساس ہوگا کہ وہ لڑکی ہے تو دیکھنا وہ کیسے اپنا طرزِ زندگی بدلے گی۔

''بھابی دیکھیں ناں! کتنے لڑکے ہیں گھر میں اور آج تک اس نے دوپٹا نہیں لیا۔ اب آپ بتائیں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جوان ہو گئی ہے اسے کب احساس ہوگا کہ وہ اب بچی نہیں ہے۔ کالج جانے والی لڑکی ہے؟''

''کوئی بات نہیں سکینہ! گھر میں اس کے سارے بھائی ہیں اور آج تک لڑکوں نے اسے بالکل اپنی طرح رکھا ہے۔ وہ بھی اسے لڑکا ہی سمجھتے ہیں۔ اب بس تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زرینہ بیگم نے انہیں سمجھایا اور انہوں نے سر ہلا دیا۔

''آج ماما کا موڈ آف ہے؟'' نعمان نے ارسلان سے استفسار کیا۔

''ہاں مجھے بھی لگتا ہے۔ آج موسم ابر آلود ہے۔'' ارسلان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر جلیل، خلیل اور رمیز تینوں آ کر دونوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ''کیا بات ہے چھوٹی امی! کچھ ناراض ہیں۔'' رمیز نے پوچھا۔

''ہمیں بھی لگتا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔ یعنی ہم پانچوں کو کچھ نہیں پتا۔ باقی بچے تین منان، فرہاد اور شیری۔ منان تو آج بابا کے ساتھ گیا ہے۔ یعنی اسے تو یقیناً نہیں پتا اور فرہاد اوپر ہے اور شیری نظر نہیں آ رہی یعنی دونوں میں سے کسی نے کچھ کیا ہے۔'' رمیز اپنی عینک ناک پر جماتے ہوئے بولا۔

فرہاد کی وجہ سے چھوٹی امی کا موڈ آف ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ ان کا سب سے زیادہ چہیتا بچہ ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ ادھوری چھوڑ کر میاں نے سب کی جانب دیکھا تو سب ہی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''یقیناً آج شیری نے پھر کچھ کیا ہے تب ہی آج وہ کمرے سے باہر نہیں آ رہی۔'' جلیل نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے سائیکل لے کر نکلی ہوگی۔'' ارسلان بولا۔ اوں ہوں! مجھے لگتا ہے کہ کسی کے گھر کا شیشہ توڑا ہوگا۔'' خلیل بولا۔

''نہیں نہیں یقیناً کپڑوں پر بحث ہوئی ہوگی اور آخر کار امی نے شیری کا ساتھ دیا ہوگا۔'' رمیز بولا۔

"بالکل نہیں۔" فرہاد کی آواز گونجی جو پتا نہیں کب سے ان کے سروں پر کھڑا باتیں سن رہا تھا۔

"آپ لوگ غلط اندازے لگا رہے ہیں۔ اب ذرا مجھے اس گول چکر میں جگہ عنایت کریں اور اپنے سروں کو پاس سنبھالیں تو میں کچھ عرض کروں۔" وہ ان کے درمیان گھسا جو سارے لاونج میں سر جوڑے دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ وہ جلیل اور ارسلان کے درمیان بیٹھتے ہوئے کشن کو گود میں رکھ کر کہنیاں جماتے ہوئے بولا۔

"ہماری اس شہزادی نے گویا کہنا غلط ہوگا، مگر چونکہ یہ قدرت نے کر دیا ہے کہ شہزادہ بناتے بناتے شہزادی بنا دیا۔" اُس نے افسوس سے سر ہلایا جیسے پتا نہیں کتنا غلط ہوا ہو۔

"اوں ہوں، آگے بکو گے۔" خلیل نے ٹوکا۔

فرہاد نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ سارے ایسے متجسس تھے جیسے وہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ سنانے جا رہا ہو۔

"اب بولو بھی، کیا منہ دیکھ رہے ہو۔" رمیز نے کہنی ماری۔

"اچھا اچھا تم سب تو پیچھے پڑ گئے۔ تو سنو۔ آج شیری کالج میں ایک لڑکے کی پٹائی کر کے آئی ہے جس کی شکایت چھوٹی امی کو کالج کی جانب سے ملی ہے۔"

"لو! اس میں کون سی بڑی بات ہے؟ پٹائی ہی کی ہے۔ آخر وہ مرد ہے۔ مرد۔" جلیل بے نیازی سے بولا۔

"او ہیلو، بھائی لوگو!" فرہاد نے ہاتھ سے جلیل کو ٹوکا۔ وہ مرد ہمارے لیے ہے۔ دنیا کے لیے وہ لڑکی ہے مت بھولیں۔"

"یار معاملہ سیریس تو نہیں۔" ارسلان نے پریشانی سے پوچھا۔ کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے شیری کا۔ پتا نہیں بیچارے کو کتنا پیٹا ہو۔" ارسلان کو بیچارے لڑکے سے ہمدردی ہوگئی۔

"تو کس نے کہا تھا کہ اسے باڈی بلڈنگ، ویٹ لفٹنگ سکھائیں۔ اب وہ لڑکیوں کی طرح ایک آدھ تھپڑ پر تو گزارہ کرے گی نہیں یقیناً اچھی خاصی پٹائی کر کے آپ لوگوں کا نام روشن کر کے آئی ہو گی۔" فرہاد نے منہ چڑھا کر کہا۔ اتنے میں شیری آگئی۔

"بھئی مجھے بھی جگہ دو۔ کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی تھی۔ سوچا اب تو ممی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ وہ ان کے درمیان گھستے ہوئے بولی۔ بے ڈھنگی جینز اور شرٹ میں بال بکھرے ہوئے، بڑی بے نیازی سے فرہاد کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس سے کشن بھی چھین لیا۔

"مسئلہ زیادہ تو نہیں ہوا شیری؟" ارسلان نے شیری سے دریافت کیا۔

"تو بتا دیا اس میاں مٹھو نے آپ کو۔ اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹکتی۔" اس نے کہنی فرہاد کی پسلیوں میں گھسا دی جس سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

"بس کر شیری تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں بھائی بس تھوڑا سا مارا ہے۔ دو تین دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" وہ ایسے بتا رہی تھی جیسے معمول کا کام بتا رہی ہو۔

"ہاں یاد نہیں جب یہ تھرڈ کلاس میں تھی اور اسی طرح ایک بچے کی پٹائی کر کے آئی تھی۔ وہ بیچارا ہفتہ بھر بیڈ سے نیچے نہیں اُترا تھا۔" فرہاد نے پھر مداخلت کی۔

"بس کر فرہاد ورنہ پٹے گا مجھ سے۔" وہ انگلی سے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی اور فرہاد چپ ہو گیا۔ اس کا بھروسا بھی کوئی نہیں تھا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی پٹائی بھی کر دیتی۔

یہ بات کہیں پاپا اور بڑے پاپا تک تو نہیں پہنچ جائے گی۔" شیری نے کہا۔

"بھئی چھوٹی امی تک گئی ہے تو یقیناً چھوٹے پاپا

کے پاس جائے گی اور پھر ممی اور پاپا کے پاس پہنچ کر ہی دم لے گی۔'' رمیز اپنی جگہ پھیلتے ہوئے بولا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' سب نے گردن ہلائی۔

''چلو دیکھا جائے گا۔ پٹنا ہی ہے جان سے تھوڑی مار کر آئی ہوں۔'' وہ بے فکری سے بولی۔

''دیکھ شیری ایک نہ ایک دن تو ہمیں ضرور پھنسوائے گی۔'' ارسلان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی لوگو! ٹھنڈ رکھو ٹھنڈ! کچھ نہیں ہو گا۔'' شیری نے کہا۔

☆......☆......☆

رات کو ڈائننگ ٹیبل پر بڑے پاپا نے اس سے آج کا واقعے کے بارے پوچھا تو اُس نے اتنی معصوم شکل بنا لی جیسے غلطی تو اس کی سرے سے تھی ہی نہیں۔

''جی بڑے پاپا! اُس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ تو میں نے دو ہاتھ مار دیئے۔'' وہ اسی معصومانہ لہجے میں بولی جیسے بڑی شریف ہو۔ پٹائی کا مطلب بھی نہ جانتی ہو۔

''دو ہاتھ مارے تھے اور بچے کا ہونٹ پھٹ گیا۔'' سکینہ بیگم گھورتے ہوئے گویا ہوئیں۔

شیری نے مدد طلب نظروں سے اپنے سات کے سات بھائیوں کو دیکھا جو بڑی بے فکری سے کھانے میں مصروف تھے۔ ان سے کوئی امید نظر نہ آئی تو پاپا کو دیکھا۔ انھوں نے ایسے سر ہلایا جیسے اس بار وہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔

جب اسے کچھ نہ سوجھا تو آخری حربہ آزمانا پڑا۔ دو چار آنسو گھسیٹ گھسیٹ کے آنکھوں میں لائی (اسے یہ کرنے میں بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا) اور دھیرے لہجے میں بولی۔

''sorry بڑے پاپا! آئندہ ایسے نہیں ہوگا۔''

''اوں ٹھیک ہے، آئندہ خیال رکھنا۔ اچھے بچے جھگڑا نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے۔''

''جی بڑے پاپا! اس نے مظلوم سی شکل بنائی اور کھانا کھانے لگی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لڑکے گارڈن میں بیٹھے تھے کہ وہ آگئی۔ غصے سے اپنی شرٹ کے بازو اوپر کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے میرے ٹائم پر کسی نے مدد نہیں کی۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گی''۔ وہ بے حد غصے سے انگلی کا اشارہ سب کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''اب دیکھوں گی کہ کیسے مجھ سے اپنے کام کراتے ہیں کہ فلاں کا نمبر لا دوں۔ فلاں کو فون پر بلا دوں۔'' وہ خاص طور پر ارسلان اور رمیز کی طرف مڑ کر بولی۔

''اور آپ آیئے گا خلیل اور منان بھائی کہ ڈیڈی سے یہ کہہ دو وہ کہہ دو اور تم دونوں۔'' وہ خلیل اور نعمان کی طرف مڑ کر بولی۔ ''تمہیں تو چھوڑوں گی نہیں۔'' دونوں کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

''اور تم مما کے چمچے۔'' یہ خطاب صرف اور صرف فرہاد کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی اور وہ جو چاکلیٹ کھانے میں مصروف تھا کہ اسے بخش دے گی؟ اُٹھ کر دوڑا۔

''بھائی بچاؤ یہ لڑکی میرا حلیہ بگاڑ دے گی۔'' کبھی وہ جلیل کے پیچھے جاتا تو کبھی ارسلان کے پیچھے اور شیری مسلسل اُس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

''یہ تو گیا! بیچارا فرہاد! اب اس کی پوری رات ہائے ہائے کرتے گزرے گی۔'' جلیل منان کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولا تو سب ہنس دیے۔

فرہاد شیری کے قابو آچکا تھا وہ اسے گھاس پر لٹائے اس پر بیٹھ کر اسے بری طرح گھونسے مار رہی تھی۔ اس نے رونے والی آواز میں بھائیوں کو پکارا۔

''مجھے بچاؤ ورنہ یہ چڑیل میری جان لے لے گی۔ بچاؤ......بچاؤ......''

سب نے مل کر ان دونوں کو چھڑایا اور شیری کا

غصہ دور کرنے کے لیے وہ سب آئس کریم کھانے چل دیے۔

واقعی ساری رات فرہاد ہائے ہائے کرتا رہا اور ارسلان جو اس کا روم شیئر کر رہا تھا۔ کانوں میں روئی ٹھونس کر سو گیا۔

ناشتے کی ٹیبل پر فرہاد اپنا ایک ہاتھ آنکھ پر رکھ کر آیا۔

''السلام علیکم پاپا جان۔'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکوں کی تو اُسے دیکھتے ہی ہنسی چھوٹ گی اور زرینہ بیگم بڑی فکر سے پوچھنے لگیں۔

''فرہاد بیٹے یہ آنکھ پر ہاتھ کیوں رکھا ہے۔ دکھاؤ کیا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں ممی، وہ ویسے ہی میں نے ہاتھ رکھ لیا۔'' وہ کسی طور اپنا ہاتھ ہٹانے کو تیار نہیں تھا۔

''ارے ایسے کیسے رکھا ہے بیٹا۔ ہاتھ اٹھاؤ۔'' سکینہ بیگم نے بھی زور دیا۔ وہاں پر سب لڑکے اور شیری کا ہنس ہنس کر برا حال تھا جبکہ فرہاد انھیں ایک آنکھ سے مسلسل گھور رہا تھا۔

''فرہاد ہاتھ ہٹاؤ۔'' اب کی بار بڑے پاپا نے کہا تو چاروناچار اسے ہاتھ ہٹانا پڑا۔ وہاں پر سیاہ دھبا تھا جیسے کسی نے گھونسا بہت زور سے مارا ہو۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہوا ہے؟ کس نے مارا ہے تمہیں۔ ذرا بتاؤ کس سے لڑائی کی ہے؟'' زرینہ بیگم نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اُس نے شیری کو دیکھا۔ اس نے اشارے سے کہا اگر میرا نام لیا تو اور کھاؤ گے۔

''کچھ نہیں ممی بس ذرا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' وہ بات سمیٹتے ہوئے بولا۔

''تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ایسا نہیں کرتے۔'' زرینہ بیگم نے اسے جھڑکا اور وہ بری طرح شیری کو گھورنے لگا جو بڑے مزے سے اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''آج سنڈے ہے تو کیا خیال ہے ہم سب مل کر شاپنگ ناں کر آئیں۔''

نعمان نے لنچ ٹائم میں سب لڑکوں سے کہا۔

''ہاں کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم سب شاپنگ پر نہیں گئے۔ اسی بہانے آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔''

ارسلان نے ہامی بھری۔

''اور ویسے بھی آج کل بڑی زبردست کولیکشن آئی ہے شرٹس کی۔'' خلیل نے کہا۔

''ہاں بھئی، ہمیں بھی اچھی سی شرٹس اور ڈریس پینٹ خریدنی ہے۔ اب ہمیں پاپا کا آفس جو جوائن کرنا ہے۔'' خلیل نے منان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں!'' منان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''میرے پاس بھی جینز ختم ہو گئیں ہیں اور آج کل بیگی جینز کا فیشن ہے۔'' شیری نے حصہ لیا۔

''او میڈم! بیگی جینز خالصتاً لڑکوں کے لیے ہے۔'' فرہاد نے اسے احساس دلایا کہ وہ لڑکی ہے۔

''تو کیا ہوا میں بھی تو لڑکا ہوں۔'' وہ کالر اوپر کر کے بولی۔

''لو اور سن لو۔ میں نے کہا تھا ناں کہ اسے اتنا مت سر پر چڑھائیں کہ وہ واقعی ایک دن لڑکا بن جائے۔'' فرہاد نے اپنے بھائیوں کو کہا۔

''تو چپ کر۔ میں لڑکا ہی ہوں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے لڑکی کا جسم دے دیا ورنہ میں آج لڑکا ہوتی۔'' شیری افسوس کرتے ہوئے بولی۔

''خبردار شیری! اگر تم نے خدا کے احکامات میں ذرا مداخلت کی تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' سکینہ بیگم جواب تک صرف خاموش تھیں بول پڑیں۔

''تم لڑکی ہو اور لڑکی بن کر رہو۔ مانا کہ ہم تمہیں لڑکوں جیسی حرکتیں کرنے پر زیادہ سختی نہیں کرتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لڑکا ہو۔'' اللہ تعالیٰ نے تمہیں

لڑکی بنایا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔'' وہ درشتی سے بولیں۔

''ہاں بیٹا زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوتا اور اگر تمہارے پاپا سن لیتے تو انہیں کتنا دکھ ہوتا۔'' زرینہ بیگم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آئندہ ایسے مت کہنا۔ چلو جلدی سے اللہ تعالیٰ سے sorry کرو۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''Sorry اللہ جی۔ ویری ویری سوری۔'' وہ جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگی۔

''یہ ہوئی ناں میری اچھی بیٹی۔'' وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

جب وہ سب شاپنگ کے لیے نکل گئے تو سکینہ بیگم نے زرینہ بیگم سے کہا۔ ''دیکھا بھابی یہ لڑکی دن بہ دن ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے۔ مجھے تو فکر ہوگئی ہے آخر کل کو اس کو بیاہنا بھی تو ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بالکل لڑکا سمجھتی ہے۔ ہائے کیا ہوگا اس کا۔'' وہ فکر مندی سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''تم فکر نہ کرو سکینہ! ابھی بچپنا ہے اس کا۔ ویسے بھی وہ شروع سے اتنے لڑکوں کے ساتھ رہی ہے۔ کوئی اور لڑکی تو ہے نہیں گھر پر اسی لیے وہ ان کے انداز میں رہتی ہے۔ مگر جس دن اسے اپنی لڑکی ہونے کا احساس ہوا دیکھنا اس دن وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔ چوڑیاں، چنری، چوڑی پاجامے، وہ یہ سب چیزیں اپنی مرضی سے پہنے گی۔ ابھی تو وہ بچی ہے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتے رہتے وہ بالکل ان جیسا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ تم فکر نہ کرو وہ انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''بھابی میں تو اللہ کا لاکھ دفعہ شکر ادا کرتی ہوں کہ لڑکوں جیسی حرکتیں ہی کرتی ہے، مگر زبان لڑکیوں جیسی ہے۔ پتا ہے کتنے پاپڑ بیلے اس کی زبان ٹھیک کرانے میں۔ شکر ہے چھوٹی تھی تو سیکھ گئی ورنہ آج یہ (ہوگا) ہی بولتی۔

''میں نے کہا ناں کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔'' انھوں نے سکینہ بیگم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

☆......☆......☆

''ہیلو! ارے کوئی ہے کہ نہیں۔'' شیری کمرے میں داخل ہو کر بولی حالانکہ سامنے فرہاد بیٹھا تھا مگر وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

''کیوں تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ کوئی ہے یا نہیں۔'' وہ کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بولا۔

''اوہ تو جناب ناراض ہیں۔'' وہ اپنے آگے ہاتھ باندھ کر بولی۔ غصے سے فرہاد نے منہ موڑ لیا۔

''چلو چھوڑو غصہ، اور دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔'' وہ اس کی فیورٹ چاکلیٹ سامنے کر کے بولی۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔

''چلو فرہاد پلیز، اب غصہ ختم کرو۔'' وہ اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے بولی۔ مانا کہ اس دن کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور غلطی سے تم بھی میرے ہتھے چڑھ گئے تو بس کام ہو گیا۔ آئی ایم سوری!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

''اچھا بس! سوری کہنے سے میرا غصہ ختم نہیں ہوگا۔ سمجھیں تم۔'' وہ غصے سے بولا۔

''تو کیا کرنا ہوگا تمہارا غصہ ختم کرنے کے لیے خود ہی بتا دو۔'' وہ بڑے مزے سے بیڈ پر پھیل کر بولی۔ اس پر فرہاد کا غصہ اور بڑھ گیا۔

''تم ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہو۔ پہلے مجھے اچھی طرح مار لیتی ہو پھر ایک آدھ چاکلیٹ دے کر سمجھتی ہو کہ غصہ ختم۔'' وہ اسے انگلی کے اشارے سے بولا۔

''اور تم مان جاتے ہو۔ مجھے پتا ہے اس بار بھی میرا سب سے عزیز دوست مان جائے گا۔ ورنہ میں

اپنی باتیں کس سے شیئر کروں گی۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''تم آخر کب سدھرو گی شیری۔ کب بڑی ہو گی۔'' وہ آخر کار ہار مانتے ہوئے بولا۔

''ارے، ارے۔ تم مجھ سے صرف تین ماہ ہی بڑے ہو اور بول بالکل دادا کی طرح رہے ہو۔ وہ اپنے ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

''چلو اچھا چھوڑو۔ تم اس دن کچھ لائی تھیں میرے لیے۔'' فرہاد نے اسے یاد دلایا۔

''ارے ہاں، دیکھو ان چکروں میں بھول گی۔ چلو آؤ تمہیں دکھاؤں۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے روم میں لے گئی اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ فرہاد نے زیادہ غصہ نہیں کیا۔

''یہ دیکھو۔'' وہ ہاتھوں میں پہننے والے بینڈ نکال کر بولی۔'' کیسے ہیں۔'' وہ تین طرح کے بینڈ کے دو دو جوڑے لائی تھی۔ تین فرہاد کے اور تین اپنے لیے۔

''اوں اچھے ہیںThanks۔''

''ارے یہ کیا۔ دوستی میں کوئی thanks نہیں۔'' وہ بڑے شاہانہ انداز میں بولی۔

''بس بس۔ ڈائیلاگ نا مارو۔ میں نے مرد نا کہا تھا۔'' وہ اس کو چڑانے کے لیے بولا۔

''تم! تم ناں کبھی نہیں سدھرو گے بندر۔'' وہ غصے سے بولی۔

سچ کہوں میں سدھرنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی بھر ایسے ہی رہنا ہے۔ تم بھی مت بدلنا۔ سچی جس دن تم سے جھگڑا نہ ہو اس دن کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' وہ اس کے بیڈ پر پھیلتے ہوئے بولا۔

''تم سچ کہتے ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نہ تو تم سے ناراض رہ سکتی ہوں اور نہ ہی لڑے بغیر۔''

''ہم دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے پکے، بلکہ جگری فرینڈز۔'' فرہاد نے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے شیری نے فوراً تھام لیا۔

''God promise پکا۔'' دونوں ہنس دیے۔

باہر سے رمیز نے گزرتے ہوئے دونوں کو دیکھا تو اطلاع دینے کے لیے گیا۔

''مبارک ہو...... مبارک ہو۔ سب کو بہت بہت مبارک باد۔'' رمیز نے زور سے بولا۔ سارے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''بھئی کیا ہوا؟ بتاؤ تو سہی۔ کیا مبارک مبارک کی گردان لگائی ہوئی ہے۔'' ارسلان چڑ کر بولا۔

''بھئی ہمارے گھر میں جو دو عدد پیس ہیں ناں ان میں صلح ہو گئی ہے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے۔'' سب کے منہ سے نکلا۔

''سچی صبح سے مزہ ہی نہیں آ رہا تھا، وہ دونوں تو اس گھر کی جان ہیں جان۔'' خلیل نے ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔'' جب تک وہ دونوں نہ ہوں گھر میں رونق نہیں ہوتی۔''

''بھئی جو بھی کہو۔ شیری نے پیٹا بڑا خوب تھا۔ مزہ آ گیا تھا۔'' نعمان ہنستے ہوئے بولا۔

''تو اور کیا بیچارے فرہاد کا برا حال تھا۔'' منان نے بھی حصہ لیا۔

''یعنی فرہاد کو چوٹ شیری کی وجہ سے لگی تھی۔'' سکینہ بیگم پتا نہیں وہاں کب آئیں۔ وہ زور سے بولیں تو سب متوجہ ہوئے۔ منان نے اشارے سے جلیل کو کہا کہ سنبھال لے۔ ارسلان نے ساتھ بیٹھے رمیز سے سرگوشی کی۔'' اگر اگلے دو منٹ میں ان کا غصہ نہیں گیا تو شیری کی شامت پکی I bet۔'' رمیز نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اس لڑکی کو ذرا خیال نہیں۔ باہر تو پیٹ کر آتی ہے۔ اب گھر میں بھی شروع ہو گئی۔ اسے تو آج میں

پوچھوں گی۔'' وہ آگے بڑھنے لگیں کہ جلیل جلدی سے بولا۔

''چلیں غصہ چھوڑیں۔ رمیز ان دونوں کو خود دیکھ کر آیا ہے۔'' اس نے رمیز کی طرف دیکھا۔ سکینہ بیگم نے بھی سوالیہ نظروں سے رمیز کو دیکھا۔ جس پر رمیز نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی۔

''جی چھوٹی امی، شیری نے فرہاد کو بینڈ بھی دیے ہیں اور دونوں نے ہاتھ بھی ملایا ہے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''اوں ٹھیک ہے، مگر دیکھ لینا ایک دن یہ لڑکی ضرور کچھ کرے گی اور یہ سب تم سب کی وجہ سے ہو گا۔ تم سب نے اسے بالکل لڑکا بنا دیا ہے۔'' وہ انھیں تنبیہہ کر کے گئیں۔

''شکر ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ورنہ آج تو پکا پٹتی یہ لڑکی۔ ہمیشہ ہمیں ڈانٹ پڑواتی ہے۔'' خلیل بولا۔

''اور کیا واقعی یار، شیری میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ سب حرکتیں ہماری جیسی ہی کرتی ہے۔'' رمیز کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''بھئی لڑکیوں جیسی کیسے وہ بنے جبکہ ہم سب لڑکے ہیں۔ ایک فرہاد اور دوسری اس کی فرینڈ کیا نام تھا اس کا؟ وہ! ہاں فیروزہ۔ ایسے میں وہ لڑکی کیسے بنے گی۔ مگر جس دن اس کے دل میں کسی کی محبت نے دستک دی۔ دیکھنا وہ خود لڑکیوں کی طرح سوچنا شروع کرے گی۔'' منان شیری کی سائیڈ لیتے ہوئے بولا۔

''مگر کب آئے گا وہ لڑکا۔ جو اسے لڑکی بنائے گا۔'' جلیل بولا۔

''آئے گا ضرور آئے گا۔ اللہ نے سب کے جوڑے بنائے ہیں اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔'' منان یقین سے بولا۔

''انشاء اللہ جلد آئے گا اور اللہ کرے ہماری زندگی میں ہی آجائے۔ پتا نہیں ہم شیری کو کب سجتے سنورتے دیکھیں گے۔ کب وہ ہاتھوں میں بینڈز کی بجائے چوڑیاں پہنے گی۔ کب جینز کی بجائے شلوار اور پاجامے پہنے گی۔'' ارسلان حسرت سے بولا۔ ''ویسے اسے لڑکا بنانے میں ہم سب کا برابر کا ہاتھ ہے۔'' نعمان نے یاد دلایا۔ ''ہم نے کبھی اسے لڑکیوں کی طرح ٹریٹ ہی نہیں کیا۔ ہمیشہ اسے لڑکوں کی طرح ٹریٹ کیا ہے اور اب جبکہ وہ لڑکوں جیسی ہوگئی ہے تو اب ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں اس گھر میں لڑکی چاہیے۔''

''بھئی جو بھی ہو۔ شیری ہم سب کی جان ہے اور تم سب اس سے اتفاق کرتے ہو۔'' خلیل بولا۔

''وہ ہماری چھوٹی سی بہن ہے اور دیکھنا جب وہ سجے سنورے گی ناں تو تم ان دنوں کو یاد کرو گے۔ ویسے بھی اس کی شادی کے بعد کون سا اس نے لڑکیوں جیسے رہنا ہے۔ ابھی تو اس کا بچپنا ہے۔ so be relax۔''

☆......☆......☆

کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں اور شیری کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ آج وہ صبح سے بور ہو رہی تھی تو کچن میں آگئی۔

''آج کیا بنا رہی ہیں بڑی امی۔ اس نے کچن میں گھستے ہی چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے چندا، آج تو تمہارا فیورٹ کھانا پک رہا ہے۔''

''اچھا!'' وہ خوش ہوگئی۔ لائیں میں بھی آپ کی ہیلپ کرتی ہوں۔'' وہ نجانے کس موڈ میں تھی۔ چھری پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ کیا کرنا ہے۔ وہ پیاز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

''ارے بیٹا! آج خیر تو ہے تم کچن میں! کہیں سورج مغرب سے تو نمودار نہیں ہوا؟ بھابی کہ میری صاحبزادی کچن میں۔'' سکینہ بیگم کچن میں آتے ہی بولیں۔

''لو آج میں آگئی تو مجھے سنا رہی ہیں اور اگر نہ

آتی تو بھی مجھے ڈانتیں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"آؤ ادھر آؤ شیری بیٹا اور ذرا یہ سالن بھونو۔" اس کی توجہ بٹانے کے لیے زرینہ بیگم نے اسے اپنے پاس بلالیا۔

وہ اٹھلا کران کے پاس چلی آئی تو سکینہ بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم کچن میں دلچسپی ہی سہی۔

☆......☆......☆

"مما آپ کو میری بائیک کا پتا ہے کہ کون لے کر گیا ہے۔" نعمان لاؤنج میں داخل ہو کر بولا۔

"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون لے کر گیا ہے۔" سکینہ بیگم چائے کا کپ لیتے ہوئیں بولیں۔

"رمیز تجھے پتا ہے۔" وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"بھئی جہاں تک میرا خیال ہے تو......نہیں۔ جلیل اور منان بھائی آفس گئے ہیں۔ خلیل یونیورسٹی میں ہو گا۔ بچا میں تو تمہارے سامنے ہوں اور ارسلان بھی ہے۔رہ گئے پاپا اور چھوٹے پاپا' لو وہ بھی آ گئے۔" منصور اور مقصود صاحب گلاس ڈور دھکیل کر داخل ہوئے تو رمیز نے اُن کی طرف اشارہ کیا۔

"بھئی کیا ہوا؟ جو ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔" مقصود صاحب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔"کوئی کام ہے بھئی، ہمارے شہزادوں کو کیا۔"

"ارے نہیں پاپا۔ وہ میں بس اپنی بائیک کا پوچھ رہا تھا تو رمیز بڑا تفصیلی جواب دینے لگا۔" ارسلان نے اپنی صفائی دی۔

"اچھا، تو میں کہاں تھا۔ ہاں پاپا اور بڑے پاپا تو یہ ہیں۔" رمیز سوچتے ہوئے بولا۔"بھئی نعمان برا مت ماننا۔ اب مما اور چھوٹی امی تو سائیکل چلانے سے رہیں تو بچے دو ہی لوگ فرہاد اور شیری۔ اب شیری کو بائیک چلانا نہیں آتی تو بچا فرہاد۔"

"تو تم سیدھا سیدھا بکواس نہیں کر سکتے تھے کہ فرہاد لے کر گیا ہے۔" نعمان نے کشن اٹھا کر رمیز کو دے مارا۔

"ارے بھئی میں تو تمہاری مدد کر رہا تھا۔" رمیز دانت نکال کر بولا۔

"لو فرہاد بھی آ گیا۔" رمیز نے فرہا کی انٹری پر اس کی طرف اشارہ کیا۔

"السلام علیکم! ایوری بڈی"۔ وہ صوفے پر دھنس کر بیٹھ گیا۔

"اچھا ہوا تم آ گئے فرہاد۔" نعمان نے اس سے کہا۔

"خیریت بھائی؟" وہ متفکرانداز میں بولا۔

"ہاں یار۔ میری بائیک تم لے کر گئے تھے ناں۔ چلو اب اس کی چابی دو۔ مجھے اپنے دوست کی طرف جانا ہے۔" نعمان جلدی سے اس کے قریب آ کر چابی مانگنے لگا۔

"ارے بھائی میرے پاس تو نہیں ہے۔ میں تو آپ کی بائیک پر نہیں گیا۔" فرہاد حیرانی سے سب کو دیکھ کر بولا۔

"چوری، بائیک چوری ہو گئی۔ وہ بھی گھر سے جبکہ گیٹ بند تھا اور چوکیدار بھی ڈیوٹی پہ تھا۔ ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔" رمیز ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

"تم اپنی فضول عورتوں والی ایکٹنگ چھوڑو۔" نعمان کو غصہ آ گیا۔

"بھئی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور لے کر گیا ہو۔" فرہاد نے نعمان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"بھئی مجھے بہت ضروری جانا ہے۔" نعمان چڑ کر بولا۔

"بیٹا تم گاڑی لے جاؤ۔" منصور صاحب نے حل پیش کیا۔

"بڑے پاپا لے تو جاؤں لیکن پتا تو چلے آخر بائیک کہاں گئی۔"

''ایک منٹ، مما شیری کہاں ہے۔'' نعمان سکینہ بیگم کی طرف ایک دم پلٹ کر بولا۔

''بھئی وہ تو فیروزہ کی طرف گئی ہے۔ اپنی برتھ ڈے کا انویٹیشن دینے۔'' انھوں نے وضاحت کی۔

''کس کے ساتھ۔'' نعمان نے اگلا سوال کیا۔

''ڈرائیور کے ساتھ گئی ہو گی۔'' وہ بولیں۔

''اسے تھوڑی بائیک چلانا آتی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''مما وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہی لے کر گئی ہے میری بائیک۔ کیونکہ ہیلمٹ بھی نہیں ہے۔''

''پر اسے کس نے بائیک چلانا سکھائی ہو گی۔'' اس بار مقصود صاحب بولے۔ تو سب کی گردن ایک دم فرہاد کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ چور بن کر بیٹھا تھا۔ ایک دم بول اٹھا! وہ میں! میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ بھاگنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس سے پہلے کہ فرہاد بھاگتا۔ نعمان اس کے سامنے آگیا۔

''مجھے سچ سچ بتا۔''

''وہ، وہ رونے لگ گئی تھی تو میں نے اسے بائیک چلانا سکھا دی۔''

''کیا۔'' سکینہ بیگم ایک دم پھٹ پڑئیں۔

''تم نے اسے بائیک بھی چلانا سکھا دی۔ اے اللہ اب میں کیا کروں۔'' وہ انہوں نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

''بھائی، وہ بہت اچھی بائیک چلاتی ہے۔ میں نے اسے چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' فرہاد نے صفائی دینا چاہی۔ نعمان اور رمیز ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''بھائی اس سے پہلے آپ کی بائیک کو کچھ ہوا ہے بھلا؟ وہ بالکل ٹھیک تھی ناں۔'' فرہاد نے اسے متوجہ کیا۔

''کیوں کیا پہلے بھی.........؟'' نعمان نے دیکھا۔ جیسے ابھی اسے کھا جائے گا۔

''بھائی پلیز۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''مجھے بتا فرہاد۔'' نعمان نے اسے گھورا۔

''بھائی تین بار پہلے بھی۔'' وہ بس اتنا کہہ کر ایسے بھاگا جیسے پیچھے آگ لگی ہو۔

''رک....... رک فرہاد! آج تو تُو میرے ہاتھوں شہید کا رتبہ پائے گا۔'' وہ اس کے پیچھے دوڑا تو رمیز بھی اس کے ساتھ بھاگا۔

مقصود اور منصور صاحب ان کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

''دیکھا آپ نے شیری نے کیا کیا ہے۔ آنے دو اسے میں چھوڑوں گی نہیں اور آپ کیوں خوش ہو رہے ہیں۔'' سکینہ بیگم مقصود صاحب کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کو شیری کی اس حرکت پر شدید غصہ تھا۔

''بھئی کون سی بڑی بات ہے۔ وہ صرف بائیک ہی لے کر نکلی ہے کہیں بم دم تو نہیں چلایا اس نے۔'' مقصود صاحب سکینہ بیگم کا غصہ کم کرنے کے لیے بولے۔

''دیکھا بھابی! انہیں اس ٹائم بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں زرینہ بیگم کی طرف رخ کر کے بولیں۔ وہ بھی مسکرا دیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دونوں کی نوک جھونک چلتی رہے گی۔

''میں نے آپ کو کتنی دفعہ کہا ہے کہ اسے ذرا سخت الفاظ میں سمجھائیں کہ وہ بچی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ سے کل سترہ سال کی ہو جائے گی۔ اب اسے لڑکیوں والے طور طریقے اپنانے چاہیں۔'' مقصود صاحب کچھ بولنے لگے اس سے پہلے وہ بول پڑیں۔

''اب پلیز یہ مت کہیے گا کہ اس کا بچپنا ہے۔'' وہ تنبیہہ والے انداز میں انگلی ان کی طرف کر کے بولیں۔

''کل کو وہ اگلے گھر جا کر ہماری کیا عزت

کرائے گی۔'' انہیں ابھی سے فکر ہونے لگی تھی۔ آخر ماں تھیں ناں اس لیے۔

''اچھا بیگم جیسا آپ کہیں۔'' مقصود صاحب بات ختم کر کے بولے۔'' وہ آئے گی تو میں بات کروں گا۔''

☆......☆......☆

''باجی آپ سے کوئی لڑکا ملنے آیا ہے۔'' بچے نے اسے مخاطب کیا۔ اس کے ہاتھ سے برتن گرتے گرتے بچے۔ اس نے گھبرا کر تخت پہ بیٹھی دادی کو دیکھا۔ جو مسلسل اسے گھور رہیں تھیں۔

کوئی جواب نہ پا کر لڑکے نے پوچھا۔'' کیا کروں ان کا وہ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ بائیک پر ہیں اور ہیلمٹ پہنا ہوا ہے۔'' بچے نے تفصیلی جواب دیا۔

''کون ہے۔ بلال!'' وہ گھبرا گئی۔

''بھئی مجھے کیا پتا کون ہے۔ خود دیکھیں۔'' جا کر وہ پلٹ گیا۔

''خدا خیر کرے۔'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ گیٹ تک آئی ذرا سا سر نکال کر باہر دیکھا۔

تو بائیک پر بیٹھا ہوا اسے دیکھتے ہی بائیک لاک لگانے لگا اور پھر گیٹ کھول کر اندر زبردستی گھس گیا۔

ارے ارے ایسے کہاں آتے جا رہے ہیں بتائیں مجھے۔'' وہ اس روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

جب اس نے ہیلمٹ اتارا تو اس کی چیخ نکل گئی۔''شیری کی بچی تو نے میری جان نکال لی۔'' وہ ہنستے ہوئے اس سے گلے ملی۔

''تو میرے گھر اتنے دنوں بعد آئی۔ ذرا خیال نہیں تمہیں میرا کہ میری اکلوتی دوست ہے (لڑکیوں میں) اس نے زور دے کر کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا ایک اور دوست ہے جو اسے بہت عزیز ہے۔

''بھئی فیروزے ٹائم ہی نہیں ملا۔ آج بھائی کی بائیک ہتھے چڑھی تو میں نے کہا کیوں ناں موقعہ کا فائدہ اٹھایا جائے اور دیکھ تیرے گھر میں ہوں۔'' وہ اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔

''اے لڑکی! کون سا لڑکا تجھ سے ملنے آیا ہے۔'' دادی جان نے وہیں سے سوال دھرایا۔

''کوئی لڑکا وڑکا نہیں آیا ہے دادی جان۔ میری دوست آئی ہے۔ شرمین۔'' اس نے پورا نام لیا۔ ورنہ شیری جیسا نام سن کر وہ یقیناً اسے کوئی لڑکا ہی تمہیں آور لمحہ ضائع کیے بغیر، اسے چیک کرنے آموجود ہوتیں اور پھر اس کے کپڑے اور حلیہ دیکھ کر وہیں پر اسے لیکچر دینا نہ شروع ہو جائیں۔

وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں کیسے کوئی کام تھا جو یہاں آئی ہو؟''

''ارے نہیں بھئی۔ کوئی کام وام نہیں تھا۔ بس ایسے ہی آ گئی۔ گھر میں بور ہو رہی تھی۔ بائیک بائے چانس ہاتھ لگ گئی تو سوچا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے' بس پھر کیا تھا۔ بائیک اسٹارٹ اور میں یہاں۔'' وہ بڑے مزے سے اپنا کارنامہ سناتے ہوئے بولی۔

اوئے تم نے بائیک چلانا کب سے سیکھی۔ فیروزہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''بھئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا بس تھوڑے دنوں پہلے۔'' اُس نے مختصراً جواب دیا۔

''اور تمھاری مما انھوں نے کچھ نہیں کہا۔'' وہ دوبارہ بولی۔

''وہ تو تب کچھ کہتیں ناں اگر انہیں پتا ہوتا۔ نا انھیں پتا ہے اور نا ہی میں بتاؤں گی' ورنہ تم تو جانتی ہو مجھے ایک بھرپور لیکچر سننا پڑے گا۔ اس کا ٹاپک ہوگا ''بحیثیت لڑکی میرا کردار'' وہ ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ کر افسوسناک لہجے میں بولی۔

چلو ویسے تم نے بائیک چلانا سیکھی کس سے۔ جہاں تک مجھے لگتا ہے تو تمہارے بھائیوں میں سے

تمہاری مما کے خلاف جانے کی جسارت تو کوئی کرے گا نہیں۔ پھر کسی نے سکھادی؟
''بھئی ایک ہی تو ہے۔ جس پر میرے آنسو بم بن کر گرتے ہیں۔ بس جب ہر طرف سے مایوسی نظر آئی تو میرا آخری حربہ......'' وہ مزے لے کر جوس پیتے ہوئے بولی جو ملازمہ رکھ گئی تھی......
''یعنی ایک دفعہ پھر فرہاد تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔'' وہ ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔
''تو اور کیا میں نے دو آنسو بہائے اور وہ صاحب تیار سکھانے کو۔ بھئی اسے بے وقوف بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' وہ مزے سے چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔
''لیکن شیری تجھے اس پر ترس نہیں آتا۔'' فیروزہ خفگی سے بولی۔
''ترس؟ کس بات کا بھئی۔ وہ پہلے میرا تایازاد پھر میرا ہم عمر اور سب سے بڑھ کر وہ میرا سب سے بہترین دوست اور تم نے سنا ہی ہوگا 'A friend in need is a friend in deed' وہ چپس سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔
''بھئی تمہیں کون سمجھائے جو تمہیں سمجھائے وہ خود اپنا سر کھپائے۔'' وہ ہارتے ہوئے بولی۔
''اچھا سب چھوڑو، میں تمہیں انوی ٹیشن دینے آئی تھی۔'' شیرمین اسے ناراض دیکھ کر بولی۔
''کیسا انوی ٹیشن؟'' اس کا موڈ بحال دیکھ کر اس نے بتایا۔
''بھئی کل ہماری شہزادی شیرمین مقصود شیرازی کا جنم دن ہے اور ہم بطور خاص آپ کو انوائٹ کرنے آئے ہیں۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی۔
''اچھا جی! اسی لیے تم آئی ہو اور میں سمجھی کہ میری سہیلی کو میری یاد آئی اسی لیے وہ آئی ہے اور اگر تم مجھے انوائٹ نا کرتی تب بھی مجھے یاد تھا کہ کل محترمہ کا برتھ ڈے ہے اور میں نے گفٹ کا انتظام پہلے سے کر کے رکھا ہے۔'' فیروزہ اسے جتانے والے انداز میں بولی۔
''بھئی مجھے پتا ہے کہ میری سہیلی کو ہر سال کی طرح اس سال بھی میرا برتھ ڈے یاد ہوگا۔ میں تو فارمیلٹی نبھا رہی تھی۔ خیر تم نے کل آنا ہے۔ کیونکہ میں نے چھوٹی سی پارٹی رکھی ہے۔ میرے گھر والے اور صرف تم۔ اس دفعہ میرا گرینڈ پارٹی رکھنے کا موڈ نہیں تھا۔ ویسے بھی گفٹس تو مجھے گھر سے ہی ڈھیروں مل جائیں گے۔ اس لیے فکر نوٹ۔'' شیری ہنستے ہوئے بولی۔
''دیکھ شیری اس دفعہ میں نے خاص طور پر تیرے لیے زنانیوں والا گفٹ خریدا ہے۔ اب بس تو اس گفٹ کی عزت رکھنا اور اسے ڈھنگ سے پہننا۔'' فیروزہ اپنے گفٹ کا مستقبل دیکھ کر پہلے ہی تنبیہ کرنے لگی۔
''بھئی کہیں تو نے پراندہ وراندہ تو نہیں خرید ڈالا۔'' شیری نے اسے چڑانے کے لیے کیا۔
''ارے نہیں بابا، بالکل نہیں۔ میں نے تیرے لیے بہت خوبصورت سے ائیر رنگ لیے ہیں۔ اپنے لیے دیکھے تو تیری یاد آگئی۔ تو بس لے لیے۔'' فیروزہ نے تفصیل بتائی۔
''اب پلیز اسے ڈھنگ سے پہننا یہ نا ہو کہ تو اسے بھی جینز اور بھدی سی شرٹ کے ساتھ پہنے۔ وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔
''تو اور کیا۔ میں اس کی خاطر شلوار سوٹ تو بنانے سے رہی۔ شیری بولی۔
''میں دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں بناتی تو۔'' فیروزہ بولی۔
''دیکھا جائے گا۔'' شیری جانے کے لیے اُٹھ گئی۔ آنا ضرور میں تمہارا انتظار کروں گی۔ فیروزہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

☆..........☆..........☆

وہ گھر میں داخل ہوئی تو خاموشی زیادہ ہی تھی۔ وہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے والی تھی کہ پیچھے سے سکینہ بیگم کی آواز سے وہ ڈر گئی۔

''کہاں تھیں تم؟''

''وہ مما! آپ کو بتایا تھا ناں کہ فیروزے کی طرف گئی تھی انوائٹ کرنے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''کس کے ساتھ۔'' انداز بالکل سپاٹ تھا۔

''مما ڈرائیور کے ساتھ۔'' اس نے بالکل صفائی سے جھوٹ بولا۔

''اچھا تمہارے ہاتھ میں یہ ہیلمٹ کیا کر رہا ہے۔'' انھوں نے فوراً سوال کیا۔

''شومئی قسمت!!'' اس نے ہونٹ دانتوں تلے دابا۔

''اوہ یہ یہ تو مجھے باہر سے ملا تو میں نے سوچا کہ اندر جا کر رکھ دوں۔'' فراٹے سے جھوٹ بولا۔

''اب تم جھوٹ بھی بولنے لگ گئیں۔ تم دن بدن بگڑتی جا رہی ہو شیری۔ اب تمہارا کچھ کرنا پڑے گا؟'' وہ غصے سے بولیں۔

''مگر مما میں نے کیا کیا۔'' دنیا جہاں کی معصومیت وہ اپنے چہرے پر سما کر بولی۔

''کیا کیا ہے۔ یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ تم میں شرم نام کی چیز ہے یا نہیں۔ یہ ہیلمٹ باہر نہیں تھا بلکہ تم یہ اور بائیک لے کر گئی تھیں اور یہ بات گھر میں سب کو پتا ہے۔'' وہ گویا ہوئیں۔ شیری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ضرور یہ اس فرہاد کا کیا دھرا ہے۔ اس نے غصے سے سوچا۔ مگر اب کیا کرنا ہے۔ اس نے خود سے سوال کیا۔

''بولو اب چپ کیوں ہو۔ کہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' سکینہ بیگم تمام حساب کتاب برابر کر دینا چاہتی تھیں۔

''I am sorry مما۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' وہ معصومانہ انداز سے بولی۔

''میں اس بار تمہاری سوری دوری کے چکر میں نہیں آؤں گی اور اب تم سے کوئی بات بھی نہیں کروں گی۔'' وہ بولیں۔

''پلیز مما ایسا مت کریں۔ کل میرا برتھ ڈے ہے۔ اگر آپ ناراض رہیں تو میرا دل کچھ کرنے کو نہیں چاہے گا۔ بس ایک بار صرف ایک بار معاف کر دیں۔ آئندہ بالکل ایسا نہیں کروں گی۔ صرف ایک بار۔'' وہ التجا کر کے بولی۔

''آخری بار! ہاں اور...... دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ کل تمہارا برتھ ڈے ہے اس لیے معاف کر رہی ہوں ٹھیک ہے۔''

''او کے مما۔'' وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔

سالگرہ سے فارغ ہو کر وہ سب کے گفٹس لے کر بیٹھ گئی۔ تب فرہاد آ گیا۔

''کیوں بھئی بھوکی۔ تم سے ذرا صبر نہیں ہوتا کہ صبح گفٹس کھول لیتیں۔'' وہ بھی ایک گفٹ پیک کھولنے لگا۔

''بھئی نہیں ہوتا مجھ سے تو پھر کیا کروں۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''صبر کرنا سیکھ لڑکی۔ صبر کرنا سیکھ۔'' وہ زور دے کر بولا۔

''تم مجھے نصیحت نہ کرو۔ تم میں کون سا صبر ہے تم بھی تو فوراً میرے گفٹس دیکھنے آ گئے۔''

وہ بچپن سے ایسے ہی رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اپنی چیزیں شیئر کرنا۔ ایک دوسرے کو دکھائے بغیر وہ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو سنائے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی وہ ایک دوسرے کو سنا کر اپنا کھانا ہضم کرنے کی کوشش

کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

''بھئی سب سے اچھا گفٹ کس کا لگا تمہیں۔''
جلیل بھائی اس سے پوچھنے لگے۔

''بھئی ہمیشہ کی طرح سے صرف فرہاد کا گفٹ ہی سب اچھا لگا ہوگا۔'' اس کے بولنے سے پہلے ہی منان بول پڑا۔

''جی بالکل، پہلے کی طرح اس بار بھی فرہاد کا گفٹ ہی مجھے سب سے بہترین لگا۔'' اس نے ہامی بھری وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ چونکہ آج سنڈے تھا لہٰذا تمام افراد اپنی روزمرہ کی روٹین سے دور تھے۔

''ہاں فرہاد نے اُسے کتوں والے پٹے دیے ہوں گے اسی لیے یہ اتنا خوش ہو رہا ہے۔ کیونکہ کتے کے پٹے دونوں کو ہی بہت پسند ہیں۔'' ارسلان چڑ کر بولا۔

''دیکھو بھائی! خبردار جو میرے بینڈز کو کتوں کے پٹوں سے تشبیہ دی۔ چھوڑوں گا نہیں میں آپ کو۔'' فرہاد زور سے بولا۔

''اور میں بھی۔'' شیری نے بھی فرہاد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

''چلو دکھاؤ کتوں کے پٹوں کو۔ میرا مطلب ہے بینڈز کو۔'' رمیز نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ سب کو ہنسی آگئی۔ دونوں نے اپنے بازو آگے کیے دونوں نے ایک جیسے بینڈز پہنے ہوئے تھے۔

''بھئی یا تو فرہاد زنانیوں والی چیزیں پہنتا ہے یا پھر شیری مردانہ چیزیں۔'' جلیل نے لقمہ دیا۔

''بھئی یہ آج کل کا فیشن ہے۔'' شیری نے فوراً جواب دیا۔

''بھئی تم لوگ چپ کرو۔'' سکینہ بیگم نے انھیں ٹوکا۔ ''بھابی کیا خیال ہے ہمیں اب جلیل اور منان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔'' انھوں نے کہا اور سب کے کان کھڑے ہوگئے۔

''کیا سوچنا چاہیے بیگم۔'' مقصود صاحب نے کہا۔

''میرا مطلب ہے اب دونوں بزنس کرنے لگے ہیں۔ اب ان کی شادی کر دینی چاہیے۔ کیا خیال ہے۔'' سکینہ بیگم نے جواب دیا۔

''واہ چھوٹی امی کیا بات کہی ہے۔'' خلیل پُرجوش لہجے میں بولا۔

''یعنی دونوں کو لگام ڈالو۔'' نعمان نے مختصراً وضاحت کی۔

''ہوں ٹھیک کہتی ہو۔ تم سکینہ کوئی لڑکی وڑکی بھی تو ہو۔'' زرینہ بیگم نے ان کی تائید کی۔

''بھائی لڑکیاں تو دیکھنی پڑیں گی ناں۔ اب وہ گھر چل کر تھوڑیں آئیں گی۔ ہمیں ڈھونڈنی ہوں گی آپ کا کیا خیال ہے بھائی صاحب۔'' انھوں نے مقصود صاحب سے مشورہ کیا۔

''بالکل ٹھیک خیال ہے اب ان دونوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے کا کام شروع ہو جانا چاہیے انھوں نے مسکراتے ہوئے بھائی کی تائید کی۔''

یعنی کل سے بھابیاں ڈھونڈنا شروع۔ ہرے!'' شیری نے نعرہ لگایا۔

''ارے دیکھو! دونوں کیسے شرما رہے ہیں۔'' ارسلان نے سب کی توجہ ان دونوں کی طرف کی۔

''ہائے، بالکل لڑکیاں لگ رہے ہیں دونوں۔'' رمیز نے لقمہ دیا۔

''بھئی، آج کل تو لڑکیاں بھی ایسی نہیں شرماتی ہوں گی جیسے یہ دونوں شرما رہے ہیں۔''

''تُو چپ کر۔'' منان نے کشن اٹھا کر رمیز کو دے مارا۔

''چھوٹی امی یہ بتائیں کہ آپ اس چڑیل کی شادی کب کریں گی؟'' فرہاد نے موضوع کا رخ

شیری کی طرف کیا۔
''بھئی جب ہمیں کوئی اچھا رشتہ ملا بس تب کریں گے۔'' سکینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اچھا! تو پھر آپ لڑکیاں دیکھنا شیری کے لیے کب شروع کریں گی۔'' اس نے دوبارہ پوچھا۔
''ہائے لڑکے باؤلے ہوئے ہو گیا۔ ہم بھلا شیری کے لیے لڑکیاں کیوں دیکھیں' اس کی شادی تو لڑکے سے ہوگی۔'' شیری نے حیرانگی سے فرہاد کو دیکھا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھی تھی جبکہ باقی سب کے چہروں پر دبی دبی ہنسی تھی۔
''ارے چھوٹی امی آدھا تو یہ لڑکا ہے اور آدھی لڑکی اور انشاء اللہ ہمارے ساتھ رہتے رہتے یہ اگلے دو تین سالوں میں مکمل طور پر لڑکا بن جائے گی تو پھر آپ اس کے لیے لڑکی ہی دیکھیں گی ناں۔''
''بھئی کیا مطلب؟'' سکینہ بیگم نے کہا۔
''دیکھیں چھوٹی امی، شیری اپنے آپ کو لڑکا ہی سمجھتی ہے۔ اور اب ایک لڑکے کی دوسرے لڑکے سے شادی نہیں کر سکتے ناں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔
سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''فرہاد کے بچے رک! تجھے میں پوچھتی ہوں۔'' شیری اپنے بازو کو رول کرتے ہوئے بولی۔
''میں نے کیا غلط کہا ہے۔ بھئی سب میری بات سے متفق ہیں۔'' وہ دوڑتے ہوئے بولا۔ سب مسلسل ہنس رہے تھے۔
''رک تجھے میں بتاتی ہوں۔ یہ میری شادی لڑکی سے کروائے گا۔ رک تو ذرا۔'' وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے بولی۔
''لو آج کی رات پھر سے فرہاد کی ہائے ہائے کر کے گزرے گی۔'' ارسلان نے رمیز کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔
''اور فرہاد ایک بار پھر سے شیری کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ ناظرین و حضرات۔'' خلیل کمنٹری کرتے ہوئے بولا۔
''اب فرہاد شیرازی چلائیں گے مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گی help me, help me, help me۔'' وہ مسلسل کمنٹری کر رہا تھا۔ شیری نے فرہاد کو زمین پر پٹخا اور گھونسوں کی بارش شروع۔ ''تو میری شادی کروائے گا۔'' وہ اس کے اوپر دو زانوں بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے پیٹ پر بیٹھی اسے مار رہی تھی کہ سکینہ بیگم چیخ کر بولیں۔
''شیری یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' سب کی ہنسی کو جیسے بریک لگ گیا اور شیری بھی فوراً ساکت ہو گئی۔ فرہاد نے خدا کا شکر ادا کیا مگر شیری اب بھی اس کے اوپر بیٹھی تھی اور اس کے بازو فرہاد نے پکڑے ہوئے تھے۔
''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس سے پہلے انہیں اتنے غصے میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔
''اٹھو فوراً سے پہلے، اب تم بچی نہیں رہیں کہ فرہاد کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتی پھرو۔'' شیری شرمندہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ''تمہیں ہوش ہے کہ تم کیا کر رہی تھیں۔''
''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' وہ زور سے بولیں۔
''چپ کرو سکینہ غصہ مت کرو میں سمجھاؤں گی۔'' زرینہ بیگم نے انہیں صوفے پر بٹھا لیا۔
''شیری اپنے کمرے میں جاؤ اور جلیل پانی کا گلاس لاؤ۔'' انہوں نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ سب لڑکے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کھسک گئے۔
''دیکھا بھابی آپ نے آج اس نے کیا حرکت کی۔ میں مانتی ہوں کہ یہ دونوں بچپن سے ایسے ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں مگر یہ.....'' سکینہ بیگم نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اب شیری کو سمجھنا چاہیے ماشاء اللہ اب وہ

بڑی ہوگئی ہے۔ کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے۔ اب نہیں سمجھے گی تو کب سمجھے گی۔'' انھوں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ہاں میں سمجھتی ہوں۔ چلو میں خود اس سے بات کروں گی تم فکر نہ کرو۔''

''بھابی پلیز اسے سمجھائیں۔ اسے میری باتوں کا تو ذرا اثر نہیں ہوتا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی باتیں سمجھے گی۔''

''ہاں میں اسے سمجھاؤں گی۔'' انھوں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

☆......☆......☆

''شیری بیٹا' تم سوئی تو نہیں؟'' زرینہ بیگم اس کے کمرے میں داخل ہو کر بولیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''ارے بڑی امی' آئیں ناں۔'' اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''میری بیٹی کیا کر رہی ہے۔'' وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''کچھ نہیں میں نے کیا کرنا ہے۔''

''پریشان ہو! تم ہاں۔'' انھوں نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے پوچھا۔

''بڑی امی آپ نے مما کو دیکھا۔ انھوں نے سب کے سامنے مجھے کتنی بری طرح ڈانٹا اور مجھے میری غلطی بھی نہیں بتائی۔'' اس کے چہرے میں بہت معصومیت تھی۔

''جان غلطی آپ کی تھی، مگر سب کے سامنے بتانے والی نہیں تھی۔'' وہ اس کے بال سہلا کر بولیں جو ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔

''کیا مطلب؟ میں نے کیا کیا۔'' شیری نے حیران ہو کر ان سے پوچھا۔

''جان اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔ ٹھیک ہے تم اور فرہاد بہت کلوز رہے ہو بچپن سے ہی، مگر اب اتنا کلوز ہونا ٹھیک نہیں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں ہر چیز میں ایک distance ہونا چاہیے۔ اب آپ بچی تھوڑی ہیں کہ آپ کو ہر بات سمجھائی جائے۔''

''مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔'' وہ ساری باتیں خود سمجھ جائے گی۔ ہیں ناں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ''ٹھیک ہے ہم نے آپ کو زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔ آپ اپنی مرضی سے ڈریسنگ کرتی ہو اپنی مرضی سے کہیں آ جا سکتی ہو مگر چند باتیں تو آپ کو ہماری ماننی پڑیں گی۔ آپ مانو گی ناں ہوں؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''جی بڑی امی! میں سمجھ گئی کہ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں لڑکیوں والے کپڑے پہنوں گی اور فرہاد کی پٹائی نہیں کروں گی۔'' وہ فوراً اُٹھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے بھئی، ہم نے مان لیا۔ اب تو آپ کا موڈ ٹھیک ہے ناں۔'' وہ ہنستے ہوئے اسے پیار کر کے بولیں۔

''جی بڑی امی فکر نہ کریں۔'' اس نے بڑے وثوق سے اپنی تسلی دی۔

☆......☆......☆

ان دو سالوں میں زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ گھر اور نہ گھر والے۔ بس شیری میں انیس بیس کا فرق آ گیا تھا۔

اس کی ڈریسنگ یا اس کے بچکانہ پن میں نہیں، وہ بس تھوڑی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ گھر میں اور گھر کے کاموں میں اس نے دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔

اب وہ اپنے بھائیوں کے درمیان کم گھستی تھی۔ ہاں البتہ فرہاد کے ساتھ اب بھی وہ ویسی تھی۔ ان دو سالوں میں گھر میں دو نئے افراد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ فائقہ بھابی جو کہ پہلے جلیل کی خالہ زاد تھیں اب ان کی

شریکِ سفر ہونے کا اعزاز پا چکی تھیں اور سلمیٰ بھابی جو کہ پہلے منان کے ساتھ یونیورسٹی میں تھیں اب ان کے گھر میں آ گئی تھیں۔

منان بھائی نے جب اپنی خواہش کا اظہار کیا تب سب نے انھیں چھپا رستم کا خطاب دیا کیونکہ ہمیشہ سب سے سنجیدہ وہی ہوتے تھے۔ البتہ سلمیٰ بھابی کے آنے کے بعد ان کے کئی پول کھلے تھے۔

سب کی طرح ان دونوں کو بھی شیری بہت عزیز تھی۔ اب سکینہ بیگم نے شیری کو لڑکیوں والے گن سکھانے کی ذمہ داری اپنی بہوؤں کے سپرد کر دی تھی، مگر سب کی طرح وہ بھی اس کوشش میں ناکام رہی تھیں۔

جب بھی وہ کچن میں ہوتیں شیری کو بلا لیتیں اور اسے اپنے مفید مشوروں سے نوازتیں۔ شیری صرف سننے کی حد تک استعمال کرتی البتہ ان دو سالوں میں اس نے اچھی سی چائے بنانا سیکھ لی تھی اور سکینہ بیگم نے چائے بنانے کی ذمہ داری اسے دے دی تھی۔

☆......☆......☆

''اوئے ہوئے! کیا بات ہے۔ میری برتھ ڈے کی تیاری بڑے جوش و خروش سے ہو رہی ہے بھئی۔'' شیری گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی تو سب ہال کو سجانے میں مصروف تھے۔

''ہاں بھئی، بقول بھابیز ہماری اکلوتی نند ہے اس کا برتھ ڈے، ہم خوب مزے سے سیلیبریٹ کریں گے۔'' رمیز نے غبارے میں ہوا بھرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چلو شیری جلدی سے اپنا بیگ و یگ رکھ کر کام پر لگو، ہم سب کب سے کام کر رہے ہیں۔'' فرہاد نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، ہم نے کتنا پسینا بہایا ہے اور کہتے ہیں مزدور کا پسینا خشک ہونے سے پہلے اسے اس کی مزدوری مل جانی چاہیے تو ہمیں ہماری مزدوری کون دے رہا ہے۔''

ارسلان بھی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بھئی تم لوگوں نے کیا ہی کیا ہے جو مزدوری مانگ رہے ہو؟'' فائقہ بھابی نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''اس پورے ہال کو سجانے میں ہم نے تین گھنٹے صرف کیے اور بھابی کی نظر میں ہم بیچاروں نے کیا ہی کیا ہے۔'' ارسلان افسوس کرتے ہوئے بولا۔

سلمیٰ اور شیری ان کی نوک جھونک پر ہنس پڑیں۔ ''چلو شیری تم جلدی سے آ جاؤ۔'' سلمیٰ بھابی نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

''بس بھابی ابھی دو منٹ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔ سچی آج یونیورسٹی میں تھک گئی۔ ابھی شاور لوں گی تو بالکل فریش ہو جاؤں گی پھر آپ لوگوں کی ہیلپ کر دوں گی۔'' وہ کہتے ہوئے اپنے روم میں چلی گئی۔

''بھئی جو بھی کہو تمہاری بھابیوں نے محنت بڑی کی ہے۔'' جلیل نے کہا۔

''آہا واہ جی واہ! بھابیوں نے صرف محنت کی ہے اور ہم تینوں نے کیا یہاں جھک مارا ہے۔'' فرہاد ٹیبل پر چیزیں رکھتے ہوئے بولا۔ فائقہ اور سلمیٰ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

''یار جب سے بھابیز آئیں ہیں ہماری تو ویلیو کم ہو گئی۔'' رمیز ارسلان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''یہ تو بس اپنی اپنی بیگم کے گن گاتے ہیں۔'' ارسلان نے بھی پورا پورا ساتھ دیا۔ ''اچھا چلو چھوڑو۔ یہ بحث یہ بتاؤ کہ نعمان کب آ رہا ہے۔'' منان نے بحث کو ختم کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

''ارے ہاں۔ شام کو فون تو آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ پوری کوشش کروں گا کہ برتھ ڈے سے پہلے پہنچ جاؤں۔'' ارسلان نے جواب دیا۔ ''اور ہاں کہہ رہے تھے کہ ایک بہت بڑا سرپرائز لے کر آؤں گا۔

سب کے لیے۔''

''چلو اچھا ہے وہ بھی آجائے ورنہ شیری کا موڈ خراب ہو جائے گا۔'' فائقہ بھابی نے کہا۔ وہ جانتی تھیں کہ شیری اپنے سبھی بھائیوں سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ کسی ایک کے بغیر کبھی بھی کیک نہیں کاٹے گی۔

''میں نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ کیک کٹنے سے پہلے آئے۔'' سلمیٰ بھابی اپنے دوپٹے کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ ''آج ہی اس کا انٹرویو تھا خدا کرے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔

کیسا رہا پوچھا تم نے؟'' منان اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لو بھلا جب خیر سے آئیں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔'' سلمیٰنے میز پر رکھی چیزوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''چلو بھئی، کیک کب تک کاٹنا ہے 9 تو بج گئے ہیں۔'' فرہاد نے اپنے سامنے پڑی چیزوں کو دیکھ کر کہا۔ ''بھئی برتھ ڈے گرل کہاں ہے؟ وہ بھی تو آئے۔'' نعمان بھائی نے کہا۔

''میں یہاں ہوں۔'' بلو کلر کی جینز اور ڈارک پنک کلر کی ٹوپ میں بالوں کی اونچی سی پونی بنائے بغیر کسی جیولری کے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''ہائے لڑکی! آج کے دن تو کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہنتی۔'' سکینہ بیگم نے اپنا روایتی درد دکھایا۔

''ارے چھوڑیں ناں چھوٹی امی۔ دیکھیں تو ہماری گڑیا کتنی پیاری لگ رہی ہے۔'' فائقہ بھابی نے جلدی سے کہا۔ اس کے پہلے کہ وہ ناراض ہوتیں۔

''السلام علیکم!'' خوبصورت سی آواز ہال میں گونجی۔ ''وعلیکم السلام میڈم صاحبہ! اب آ رہی ہو۔ ٹائم دیکھا ہے تم نے۔'' شیری نے فیروزے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ پرپل اور گرین کلر کے کمبی نیشن والے سوٹ میں میچنگ ہلکے پھلکے ائیر رنگ کے ساتھ بالوں کی پونی کیے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''ارے لڑکی، اسے اندر تو آنے دو۔'' فائقہ بھابی نے شیری کو ٹوکا۔ ''کیسی ہو فیروزے۔''

''ٹھیک ہوں بھابی، آپ کیسی ہیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''ہم سب بالکل ٹھیک ہیں۔ ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو تم۔'' سکینہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ ''آؤ فیروزے ادھر آ جاؤ' ہمارے پاس۔'' سلمیٰ بھابی نے خلیل کو شرارت سے دیکھ کر کہا۔

جس کی والہانہ نظریں فیروزے پر جمی ہوئی تھیں سلمیٰ کو دیکھ کر اس نے فوراً اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور سلمیٰ بھابی فائقہ کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہنسی تو فائقہ نے آنکھ کے اشارے سے کہا۔ ''مجھے بھی پتہ لگ گیا ہے۔''

''بھئی کیک کب کاٹنا ہے۔'' فرہاد چیزوں کو للچائی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''بس نعمان بھائی آجائیں تو کیک کاٹوں گی۔'' شیری نے گھڑی پر نظر دوڑائی جہاں گیارہ بج رہے تھے۔

''مجھے آئے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ شیری مجھے گھر بھی جانا ہے۔'' فیروزے بھی گھڑی کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ وہ گھر پر گیارہ بجے کا ٹائم دے کر آئی تھی۔ اسے اتنی آزادی نہیں ملی تھی کہ اپنی مرضی سے دیر تک وہ باہر رہ سکے۔

''آپ فکر نہ کریں فیروزے ہم آپ کو چھوڑ آئیں گے۔'' خلیل اس کی پریشانی دیکھ کر بولا۔

''ہاں بھئی ہمارے دیور تو کب سے تیار ہیں۔'' فائقہ معنی خیز انداز میں بولی۔ تو خلیل جھینپ گیا جبکہ فیروزے ناسمجھی والے انداز میں مسکرائی۔

''لو نعمان بھائی آ گئے۔'' رمیز نے گلاس ڈور سے انہیں داخل ہوتے دیکھا۔ ''تو شکر ہے خدا کا ورنہ مجھے لگا کہ کیک کل ہی کٹے گا۔ ویسے کل شروع ہونے میں صرف 25 منٹ باقی ہیں۔ فرہاد بولا۔

نعمان کے ساتھ ایک اور شخص بھی اندر داخل ہوا۔ ”ہیں یہ کون ہے؟“ سلمیٰ بھابی نے اس شخص کو دیکھ کر نعمان سے سوال کیا۔ سب نے اس شخص کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا جو اپنی طرف سب کو ایسے متوجہ دیکھ کر کچھ کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

”بھئی بوجھو تو جانیں......“ نعمان نے جیسے سب کا تجسس بڑھایا پھر مسکراتے ہوئے اس اجنبی کو دیکھا ”آپ بتائیں گے تو ہم جانیں گے۔“

”نہیں پہچان پائے ناں آپ؟ دیکھا میں نے کہا تھا ناں شہود یہ لوگ تمہیں نہیں پہچان پائیں گے۔“

”شہود کون شہود؟“ ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی یہ ہماری پھوپو کا بیٹا ہے۔“ نعمان نے آخر تجسس کو ختم کر ہی دیا۔

”جہاں تک مجھے پتا ہے تو پھوپو کے تین بچے ہیں ستارہ، اروہ اور شہروز اب یہ شہود کب پیدا ہوا تو مجھے پتا نہیں۔“ ارسلان کندھے اچکا کر بولا۔ ”ارے ماشاء اللہ شہود بیٹے! تم تو لندن میں ہوتے تھے۔ اپنے چچا کے پاس۔“ زرینہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ تو شہود کی کچھ ہمت بندھی۔ اپنے اتنے سارے کزنز دیکھ کر اسے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”ارے شہود تمہاری پھوپو کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ وہ جب پیدا ہوا تو اس کو اس کے چچا نے اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر یہ وہیں رہا ہے۔“ سکینہ بیگم اسے پیار کر کے تفصیل بتانے لگیں۔ وہ سب سے مل کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”مجھے پتا نہیں آپ میں سے کون؟ کون ہے؟، بس میں اُن سب میں سے ایک شخص کو پہچان سکتا ہوں اور وہ شیری ہے۔“ اس نے شیری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تو شیری نے شاکو ہو کر اسے دیکھا۔

”مجھے...... مجھے کیوں بھلا؟“ وہ کچھ الجھ سی گئی۔

”بھئی سارے راستے نعمان نے آپ کی جو تعریف کی اور جو حلیہ بیان کیا مجھے وہ کسی اور میں نظر نہیں آیا۔“ اس نے گہری نظروں سے شیری کو دیکھا۔

”آؤ بھئی آؤ شہود Wel come to the family۔“ فائقہ بھابی نے شیری کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے جلدی سے موقف بدلا۔

”بھئی تفصیل تم سے بعد میں سن لیں گے، پہلے کیک کاٹ لیں۔ آج شیری کا برتھ ڈے ہے۔“ مقصود صاحب نے شیری کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا تو سب کیک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رات کو شہود سے سب لندن کی باتیں سنتے رہے۔ جس طرح شہود نے شیری کا مذاق بنایا تھا۔ شیری کو اس شخص سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اسے شہود میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سو وہ حسب معمول اپنے گفٹس کھول کر بیٹھ گئی اور بڑبڑانے لگی۔

”ہونہہ حلیہ! اپنا حلیہ دیکھا ہے، کیسا بندر لگتا ہے۔ میرا حلیہ بتا رہا ہے اور بھائی، انھیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گی اور یہ فرہاد کہاں رہ گیا۔ ابھی تک وہ میرے گفٹس دیکھنے نہیں آیا۔“ وہ بار بار باہر دیکھتے ہوئے الجھی جا رہی تھی بول رہی تھی۔ سب کی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں اور اسے اور غصہ چڑھ رہا ہے۔ اسے کوئی بلانے نہیں آیا۔ اس بات پر اس کا پارہ اور ہائی ہو گیا۔ صبح جب وہ کچن میں پانی لینے کے لیے گئی تو فائقہ اور سلمیٰ بھابی بڑے مزے سے ناشتا بنا رہی تھیں۔

”شہود کتنا زبردست لڑکا ہے۔“ سلمیٰ بھابی سینڈوچ بناتے ہوئے بولیں۔ ”ہاں لگتا ہی نہیں کہ یہ پاکستان میں نہیں رہتا اور پہلی بار آیا ہے۔“ فائقہ بھابی نے پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے سلمیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کتنی مزے کی باتیں کرتا ہے۔ ارے شیری آؤ بھئی ہماری تھوڑی ہیلپ ہی کر دو۔“ سلمیٰ بھابی

اسے دیکھ کر بولیں۔
''نہیں نہیں آپ پہلے ''شہود نامہ'' ختم کرلیں تو میں کچھ کہوں اس نک چڑے کے بارے میں۔''
وہ غصے سے چھری اٹھاتے ہوئے بولی۔
''کیوں بھئی اس نے تمہارے بارے میں کیا کہہ دیا' جو تم اتنی آگ بگولہ ہو رہی اس کے بارے میں۔'' فائقہ بھابی نے پوچھا۔
''لو اور سنو کل اس نے جو میری انسلٹ کی وہ کسی کو یاد ہی نہیں۔'' ٹماٹر کاٹتے ہوئے شیری نے خفگی سے ان کو دیکھا۔
''ارے بھئی اس نے تو مذاق کیا اور دیکھو اس نے کہا تھا کہ وہ صرف تمہیں پہچانتا ہے' یہ تو تمہارے لیے اعزاز کی بات ہے۔ جان!'' سلمیٰ بھابی اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔
''جو بھی ہے بھابی۔ مجھے وہ شخص بالکل پسند نہیں اور آپ میرے سامنے اس کی تعریف ناں ہی کریں تو اچھا ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔
''بھابی ایک گلاس پانی ملے گا۔'' شہود کی آواز پر وہ تینوں چونکیں۔
''ہیں...... ہاں ہاں بالکل۔'' فائقہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس نے ایک سرسری نظر شیری پر ڈالی اور گلاس لے کر نکل گیا۔ ایک لمحے کو گڑبڑا سی گئی۔ سلمیٰ اور فائقہ نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ لاپرواہی سے نہیں دی ''ارے تو اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اچھا ہے میرے خیالات، اس تک پہنچ گئے۔ اس کے ہٹ دھرم لہجے پر وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
''اسلام علیکم ممانی جان! کیسی ہیں آپ؟ کل سے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔'' شہود لاونج میں داخل ہو کر بولا۔
''میں ٹھیک ہوں بیٹے! تم بتاؤ کیا کر رہے تھے؟

آرام سے تو ہوناں تم؟ یہاں کوئی چیز چاہیے ہو تو بلا جھجک کہہ دینا یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔'' زرینہ بیگم نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔
''ارے شہود بیٹا تم اٹھ گئے۔ ارسلان تمہارا پوچھ رہا تھا۔ ابھی وہ باہر نکل گیا ہے۔'' سکینہ بیگم لاؤنج میں داخل ہو کر بولیں۔
''جی ممانی جان! میری بات ہو گئی ہے اور بھابیز آپ لوگ کیا کر رہی ہیں۔'' وہ دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ''ارے کچھ نہیں بھئی۔ میں اپنا ایک سوٹ کڑھائی کر رہی ہوں اور فائقہ اسے خراب کرنے میں لگی ہے۔ سلمیٰ نے شرارت سے فائقہ کو دیکھا فائقہ کو دیکھ کر بولی۔ جو پوری کوشش کر رہی تھی مگر بیچاری ایک پھول بھی صحیح سے کاڑھ نہیں پا رہی تھی۔
''ایک تو تمہاری مدد کر رہی ہوں اور اوپر سے مجھے سنا رہی ہو۔'' فائقہ کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی۔
''مدد؟ تم اسے مدد کہتی ہو۔ تم غلط بناتی ہو اور پھر مجھے دوبارہ سے ادھیڑ کر ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔'' سلمیٰ بھابی سر کو ہلاتے ہوئے بولیں۔
''کیا......؟ اس کا مطلب میں نے جو اتنی محنت سے پھول کاڑھے تم نے ادھیڑ دیے۔'' وہ حیرت سے چیخیں۔
تو اور کیا کرتی بھئی! میرے سوٹ کا سوال ہے۔'' سلمیٰ بھابی ترکی بہ ترکی بولیں۔
''ہائے میری محنت۔'' فائقہ بھابی نے سر پر ہاتھ مارا تو سب ہنسنے لگے۔
ان دونوں کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اس لیے تو گھر میں مسکراہٹوں کا راج تھا۔
''بھئی واہ!! بہت اچھے ٹائم پر چائے لائی ہو شیری۔ اللہ تمہیں اچھا سا دولہا دے۔'' سلمیٰ بھابی ٹرے سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولیں۔
''بھابی دعا دیتی ہے تو اچھی سی دیں۔ یہ دولہا

دولہا والی دعائیں نہ دیا کریں۔'' شیری مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لو اور دیکھو' یہ واحد لڑکی ہے۔ جو کہہ رہی ہے کہ اچھے دولہا کی دعا میں نہ دیں۔ ورنہ لڑکیاں تو پرنس چارمنگ کی دعائیں لیتیں ہیں۔'' فائقہ نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

شیری نے ابھی چائے کا کپ لیا ہی تھا کہ زرینہ بیگم ٹھکا۔ ''شیری بیٹا تم شہود کے لیے چائے نہیں لائیں۔'' اس کا منہ اس کا نام سنتے ہی کڑوا ہو گیا۔ ''تمہیں کب عقل آئے گی شیری؟'' سکینہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔ مما مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ موصوف بھی یہاں موجود ہیں۔ ورنہ ان کے لیے بھی لے آتی۔'' وہ روکھے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے سیڑھیوں سے اترتے دیکھ لیا تھا۔'' وہ اسے نگاہوں کے حصار میں لپیٹے ہوئے تھا۔

''اونہہ!'' شیری کے منہ سے نکلا۔ سکینہ بیگم نے اسے گھورا اس سے پہلے کہ وہ بولتیں' وہ چائے لینے کے لیے اُٹھ گئی۔ ''یہ لیں۔'' وہ اس کے سامنے کپ رکھتے ہوئے بولی۔ شہود نے شیری کو دیکھا۔ بلیک جینز کے اوپر ڈھیلی سی شرٹ میں دوپٹے سے بے نیاز وہ اسے اپنی سی لگی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کپ پکڑا تو شیری کے نقوش اور تن گئے۔

''آپ اسی حلیے میں رہتیں ہیں کیا؟'' اُس نے اسے مخاطب کیا۔

''کیوں آپ کو کیا اعتراض ہے۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

''نہیں اعتراض تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ بھابیوں جیسے کپڑے نہیں پہنتیں۔'' اس نے دونوں کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ وہ دونوں اپنا کام چھوڑ کر ان دونوں کی باتیں سن رہیں تھیں۔ ''مجھے ایسے ہی پسند ہے۔'' شیری نے مختصر سا جواب دیا۔

''مگر......'' وہ کچھ بولتے بولتے رکا۔ شیری نے اسے گھورا۔ شاید وہ الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ جینز پہنتی ہیں مگر ضروری تو نہیں کہ آپ یہ مردانہ شرٹس پہنیں آپ کچھ اور بھی تو جینز کے ساتھ پہن سکتیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جب سے میں آیا ہوں میں نے آپ کو ایسے بے ڈھنگے کپڑوں میں ہی دیکھا ہے۔ میں نے آپ کو کبھی شلوار قمیض میں نہیں دیکھا اور نہ آپ نے کبھی دوپٹا اوڑھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ اتنی بڑی تو ہیں کہ آپ کو گھر میں دوپٹا لینا چاہیے۔ گھر میں آپ کے بھائی اور فادر ہوتے ہیں۔''

''ہمارے ملک میں اور یورپ میں اتنا تو فرق ہونا چاہیے' آخر ہم مشرقی لوگ ہیں اور سب سے بڑھ کر مسلمان ہیں اور جہاں تک میں اسلام کو جانتا ہوں تو اس نے عورت کو پردہ کرنے کا کہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ آج کل یہ سب کرنا مشکل ہے کیونکہ ہماری جنریشن بہت تیزی سے مغربی رنگ میں ڈھل رہی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا آپ بھول جائیں۔ تھوڑا بہت فیشن ٹھیک، مگر اتنا نہیں کہ آپ بالکل ہی الگ دنیا کے باسی لگیں۔ تو مجھے یہ پسند نہیں۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھا اور گلاس ڈور سے باہر نکل گیا۔ شیری میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہاں سے اُٹھ جائے۔

☆......☆......☆

''ہائے اللہ کہاں رکھ دیا' میں نے وہ سوٹ؟'' وہ اپنی الماری کے سارے کپڑے نکال کر بولی۔

''ارے کیا ڈھونڈ رہی ہو شیری!'' فائقہ بھابی کمرے کا حلیہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور تم نے کیا کباڑ خانہ بنا رکھا ہے اپنے کمرے کو؟''

ان کے صاف گوئی سے کہے جملے جیسے پتھر بن کر شیری کو اپنے منہ پر پڑتے ہوئے محسوس

ہوئے۔ خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا فائقہ اور سلمیٰ
بھی حیرانی سے اس کو دیکھ رہی تھیں جبکہ زرینہ اور سکینہ
بیگم ساکت ہی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔
''ارے بھابی، وہ جو آپ لوگوں نے مجھے پچھلے
سال زبردستی کا ایک سوٹ دلوایا تھا ناں! وہ ڈھونڈ
رہی ہوں۔'' وہ الماری میں منہ دیتے ہوئے بولی۔
''بھئی تمہیں وہ کیوں چاہیے۔'' وہ اس کے
کپڑے سمیٹتے ہوئے بولیں۔
''ارے وہ نہیں چاہیے اس کا دوپٹا چاہیے۔
اچھا تو تم پر شہود کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔'' وہ
ساری بات سمجھ کر بولیں۔
''ارے بس کریں بھابی۔ اس الو کا تو نام بھی
میرے سامنے مت لیں۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں۔
اور جس طرح اُس نے مجھے کل کہا دل کرتا ہے کہ اس
کا منہ توڑ دوں۔'' وہ غصے سے الماری کا دروازہ پٹختے
ہوئے ان کی طرف پلٹی۔
''تو جان! پھر کیوں دوپٹا ڈھونڈ رہی ہو تم۔''
فائقہ بھابی کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔
''ارے بھابی! میں نے سوچا ہے جب تک وہ
یہاں ہے میں کم سے کم تب تک تو وہ کپڑے پہنوں
ورنہ پتا نہیں وہ کیا کرے گا۔ وہ تو شکر کریں کوئی بھائی
نہیں تھا ورنہ پتا نہیں وہ پھر کون سا لیکچر سننے کو ملے گا۔''
''ارے تم دونوں یہاں ہو؟ میں کب سے تمہیں
ڈھونڈ رہی ہوں۔'' سلمیٰ بھابی اندر داخل ہوتے بولیں۔
''بھئی ہم دونوں شہود کی باتوں کو ڈسکس کر
رہے تھے۔'' فائقہ بھابی کے جواب پر سلمیٰ نے
سوچتی ہوئی نگاہوں سے شیری کو سوچتے ہوئے
دیکھا۔ ''ہوں مجھے لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم میں
اور مغرب میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے ہے ناں!''
''شیری یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہیں غلط ٹھہرا رہے ہیں مگر
شہود کی باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ تم جس ماحول میں
پلی بڑی ہو۔ تم اس کے مطابق ڈھل جاؤ گی مگر جان
تم نے اگلے گھر بھی تو جانا ہے ناں۔ تمہارا بھی پرنس
چارمنگ آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائے
گا۔ تو میری جان لڑکیوں میں تھوڑی بہت نسوانیت
کا ہونا لازمی ہے وہ شیری کے پھولے ہوئے منہ کو
اوپر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ ''بھئی دیکھنا ہماری
پرنسس کے لیے پرنس چارمنگ سے بھی زیادہ ہینڈسم
زیادہ ڈیشنگ اور زیادہ خوبصورت اور زیادہ۔''
''بھئی بس بس بس......'' فائقہ سلمیٰ کی بات پر
بریک لگا کر بولی۔ ''ہمیں پتا چل گیا محترمہ بس
کریں۔''
شیری کو ہنسی آئی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔
ارے دیکھو میں بھول گئی۔ باہر بارش ہونے
والی ہے تو میں تمہیں بلانے آئی تھی اور یہاں باتوں
میں لگ گئی۔ چلو بھئی چلیں انجوائے کریں اس
خوبصورت موسم کو۔'' سلمیٰ بھابی ان دونوں کو گھسیٹتے
ہوئے بولیں۔ ''بھابی کہاں جا رہیں ہیں آپ؟''
فرہاد کی آواز پر وہ رک گئیں۔
''ارے بھئی بارش شروع ہو گئی ہے تو سوچا
بارش میں نہائیں۔'' فائقہ نے جواب دیا۔
''تو شیری کہاں ہے۔'' اس نے پوچھا۔ ''وہ
بھی آ رہی ہے۔ کیوں کوئی کام تھا۔''
''نہیں بس میں اس کے لیے کچھ لایا تھا وہ ہی
دکھانا تھا۔''
''تم نے غور کیا سکینہ کہ شیری اب بدل رہی
ہے۔'' بارش میں تینوں کو نہاتا دیکھ کر زرینہ بیگم نے
سرگوشی کی۔
''جی بھابی! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب وہ
پہلے جیسی نہیں رہی۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے
لگی ہے۔ بس یہ کپڑے بھی انسانوں والے پہننا
شروع کر دے تو بس......'' وہ چائے کا سپ لیتے

ہوئے بولیں۔

''ہوں یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ اب گھر میں فائقہ اور سلمٰی آ گئیں ہیں۔ اسے کچھ کمپنی مل گئی ہے۔ اب وہ زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی ہے۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ وہ شیری کو سمجھائیں۔ تم دیکھنا یہ دونوں مل کر کوشش کر رہیں ہیں۔ ہماری شیری بھی ایک دن مکمل طور پر گھر داری سیکھ لے گی۔ ابھی تو اس میں بچپنا ہے۔ اپنے ابا کے گھر لاڈ نہیں اٹھوائے گی تو اور کہاں اٹھوائے گی۔'' زرینہ بیگم نے محبت سے ان تینوں کو دیکھا جو دنیا سے بے خبر بارش کو انجوائے کر رہیں تھیں۔ ''ہوں۔ اللہ کرے اسے اگلا گھر بھی نیک ملے اور میری بچی خوشی و خرم رہے۔ آمین۔'' سکینہ بیگم نے کہا۔

''آمین!'' زرینہ بیگم کے لبوں سے بھی اس بچی کی خوشیوں کے لیے دعا نکلی۔ کوئی اوپر سے شیری کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا بچپنا اسے بہت پسند تھا اور وہ اسے ایسے ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ زندگی بھر۔

☆......☆......☆

''بھئی آج گھر میں بڑی خاموشی ہے۔ خیریت تو ہے۔'' جلیل نے کچھ حیرانی سے نعمان سے پوچھا۔ ''ہاں گھر کی خواتین باہر گئیں اور لڑکے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔'' نعمان نے جواب دیا۔

''بھئی کیا ہو رہا ہے۔ آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہیں۔'' وہ دوپٹا سنبھالتے ہوئے نیچے اتر رہی تھی۔

''ارے شیری! آج کوئی تہوار وغیرہ تو نہیں ہے جو تم شلوار قمیض میں نظر آ رہی ہو۔'' نعمان اس کو دیکھ کر بولا۔ ''ہاں کچھ لوگوں کو میرا اس گھر میں اپنی مرضی سے گھومنا پسند نہیں۔'' اس نے بہت خفگی سے شہود کو دیکھتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا جو بظاہر بہت انجان بنا میگزین پڑھنے میں گم تھا۔ ''ارے! ہماری پرنسس کو کس نے کچھ کہہ دیا۔'' جلیل اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''کسی کی اتنی ہمت جو مجھے کچھ کہے' اُس کا حلیہ ناں بگاڑ دوں۔'' وہ مسلسل اسے گھور رہی تھی۔ اچھا چلو غصہ چھوڑو' بتاؤ تمہاری بھابی کب آئیں گی۔'' جلیل نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ''پتا نہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''ارے واہ جی واہ! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہیں ہیں۔ شہود بھائی ذرا مجھے چٹکی کاٹیں۔'' فرہاد کمرے میں داخل ہو کر جیسے حیران رہ گیا۔ ''کیوں خیریت؟'' شہود اسے دیکھ کر بولا۔

''آج ہمارے گھر کی رانی اپنے روایتی حلیے میں نہیں ہے۔'' وہ شرارت آمیز حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''رُک فرہاد تو پٹے گا میرے ہاتھوں۔'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''چل چھوڑ شیری چل' آ تجھے اپنی نئی سی ڈی دکھاؤ۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''نہیں' مجھے نہیں دیکھنی تمہاری سی ڈی۔ وہ منہ بسور کر بولی۔ ''تیری فیورٹ گیم ہے اس میں۔'' فرہاد نے سرگوشی کی۔ شیری نے بھنویں اچکا کر دیکھا۔ ''چل آ تجھے تیری فیورٹ چاکلیٹ بھی دوں گا۔'' وہ اسے کندھے سے تھام کر کے جاتے ہوئے بولا۔

''یہ دونوں ایسے ہی ہیں۔'' شہود نے انھیں جاتا دیکھا تو نعمان سے پوچھنے لگا۔

''یہ تو کچھ نہیں' تم نے کبھی انھیں لڑتے نہیں دیکھا۔ خدا کی پناہ۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

''سچ پوچھو تو ہمارے گھر کی رونق انہی کی وجہ سے ہے۔ شیری اور فرہاد بچپن ہی سے بہت کلوز رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنی ہر بات شیئر کرتے ہیں۔ ان کی لڑائی ان کا پیار بہت منفرد ہے۔ شیری تو اسے اپنا جگری دوست کہتی ہے۔ جب تک لڑائی نہ کریں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' جلیل ہنستے ہوئے

بتا رہا تھا۔ جبکہ شہود کسی گہری سوچ میں تھا۔

☆......☆......☆

''جی امی........ سب ٹھیک ہے۔''

''جی ماموں وغیرہ سب ٹھیک ہیں۔ آپ کا بہت پوچھتے ہیں۔ ہوں۔ ہوں، جتنا آپ نے اس کے بارے میں بتایا تھا' وہ اس سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ ہاں تھوڑی بہت جو کسر ہے ناں وہ میں پوری کردوں گا جی۔''

شہود بڑے مزے سے اپنی والدہ سے باتیں کر رہا تھا جب شیری آئی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ ''جی امی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ پسند ہے، بس آپ تیاری رکھیں۔ باقی میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔'' شیری انتظار میں تھی کہ وہ کب فون بند کرے اور کب وہ اس سے آنے کو کہے۔ مگر وہ ڈھیٹوں کی طرح مسلسل بات بڑھائے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے شیری کو تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا تھا اور وہ کوئی چانس مس نہیں کرتا تھا۔ اسے اس کا غصے سے بھرا سرخ چہرہ بہت پسند تھا۔ ''اچھا امی گھر میں سلام کہیے گا۔ اللہ حافظ۔''

وہ فون بند کر کے شیری کی طرف مڑا۔ ''کوئی کام تھا آپ کو۔''

''مجھے آپ سے کوئی کام نہ تھا اور نہ ہوگا۔ نیچے آپ کو سب کھانے پر بلا رہے ہیں۔''

وہ کہہ کر رکی نہیں اور چل دی۔ شہود بھی مسکرا کر اس کی پیروی کرنے لگا۔

''ارے بیٹا! کتنی دیر لگا دی تم نے کیا کر رہی تھیں۔'' منصور صاحب نے شیری سے پوچھا۔

''بڑے ابو یہ صاحب فون پر بزی تھے۔'' اس نے تپے ہوئے انداز میں شہود کی جانب دیکھا۔

''Sorry ماموں! وہ میں مما سے بات کر رہا تھا۔'' شہود نے صفائی دی۔ ''ارے کیسی ہیں وہ۔'' سکینہ بیگم نے پوچھا۔ ''اچھی ہیں آپ سب کو سلام کہہ رہی تھیں۔'' ''آئیں گی وہ بھی چند دنوں میں۔'' شہود سلاد پلیٹ میں ڈال کر بولا۔ ''آگے کیا کرنے کے ارادے ہیں تمہارے؟'' جلیل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ابھی تو پاکستان آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ سوچا نہیں کہ کیا کرنا ہے۔ ذرا دیکھ لوں اچھی طرح، پھر سوچوں گا کہ بھائی کے ساتھ بزنس کرنا ہے کہ خود کچھ کرنا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہوں اچھی بات ہے۔ تم یہاں کا سسٹم سمجھ لو پھر کچھ کرنا۔'' منان نے بھی ہامی بھری۔

''اچھا بس۔ کیا ہم سکون سے کھانا کھا لیں۔'' شیری جو اتنی دیر سے باتیں سن رہی تھی چڑ کر بولی۔

''جی مہارانی صاحبہ۔ جیسا آپ چاہیں۔'' منان ہاتھ جوڑ کر بولا۔ جبکہ شہود کو اس کا لہجہ ناگوار گزرا۔ مگر اس نے نظر انداز کر دیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آج مجھے کوئی کام وام کرنے کے لیے نہیں کہے گا۔ آج کے بعد میری چائے کی ڈیوٹی بھی ختم۔'' شیری سب خواتین کو پا کر اونچی آواز میں بولی۔ ''کیوں؟ کیا آج سے مائیوں بیٹھ رہی ہو۔'' فائقہ بھابی نے شرارت سے سلمی بھابی کو آنکھ ماری۔

''ایک تو اس گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور موضوع ہوتا ہی نہیں۔'' وہ چڑ کر فلور کشن پر بیٹھ کر بولی۔ ''دنیا شادی پر ختم نہیں ہوتی کسی کو پتا ہے کہ نہیں کہ مہینے کے بعد میرے فائنل پیپرز ہیں۔ اس کے لیے مجھے تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک ہے کہ نہیں۔'' وہ سب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ہوں ٹھیک ہے۔ تم دل لگا کر پڑھائی کرو اور اچھے نمبرز لاؤ۔'' سکینہ بیگم نے اسے پیار سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو میری شام کی چائے کی ڈیوٹی ختم۔'' وہ ایک بار پھر دل کی تسلی کر لینا چاہتی تھی۔ سو دوبارہ بولی۔

''ہوں ٹھیک ہے۔'' زرینہ بیگم نے کہا۔ اس

نے خدا کا شکر ادا کیا پیپرز کے بہانے ہی سہی اس کی جان تو چھوٹی۔

''بھابی اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ نا شروع کریں ماشا اللہ سے گریجویشن کرنے والی ہے۔'' سکینہ بیگم نے اسے جاتا دیکھ کر زرینہ بیگم سے کہا۔ ہوں ماشاء اللہ۔ یہ اور فرہاد دونوں گریجویشن کر لیں گے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر بور ہوگئی تھی تو لاؤنج میں آ گئی کہ چائے پی لے اور ساتھ تھوڑا سا T.V دیکھ لے تا کہ فریش ہو جائے۔

تبھی وہاں پر شہود آ گیا۔ طریقے سے بال بنائے ہوئے بڑی تہذیب سے پینٹ شرٹ پہنے ہوئے۔ اس نے دل میں سوچا کہ کہیں سے نہیں لگتا کہ یہ بندہ لندن میں پلا بڑھا ہے۔ خالصتاً دیہاتی لگتا ہے۔ وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ بولا۔

''آپ نے نعمان کو دیکھا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ایک فنکشن میں جانا ہے۔'' وہ خود ہی تفصیل بتانے لگا۔ ''نہیں میں نے نہیں دیکھا انھیں۔ ویسے کیا آپ ہمیشہ ایسی بنے رہتے ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیوں ایسا بول گئی بعد میں خود ہی پچھتائی۔ ''جی؟ کیا مطلب۔'' وہ حیران ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ ''میرا مطلب ہے آپ بھائی کے ساتھ فنکشن میں جا رہے ہیں۔ وہاں پر لڑکیاں بھی ہوں گی۔ وہ ایسے لڑکے پسند نہیں کرتیں Mama's boy جیسے۔ انھیں تو Rough اینڈ Tough لڑکے پسند ہوتے ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیوں اس سے اتنی بات کر رہی تھی۔ وہ اس کا مطلب جان کر مسکرا دیا۔ ''یعنی میں آپ کو ایسے اچھا نہیں لگتا۔ ہیں ناں؟'' شہود نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''مجھے آپ ویسے بھی اچھے نہیں لگتے۔'' ترکی بہ ترکی جواب آیا۔ آپ ایسے رہیں یا ویسے I dam care وہ غصے سے بول کر اٹھنے لگی۔

''کیا آپ ہمیشہ انگارے چبائے رکھتیں ہیں یا صرف مجھ سے بات کرتے ہوئے ایسی ہو جاتی ہیں۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اور شیری کو زہر لگ رہا تھا۔ وہ جانے لگی تو شہود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیری کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ ایک بے اختیار جھٹکے سے مڑی۔

''ہم سے بھی مسکرا کر بات کر لیا کریں۔ ہمیں اچھا لگے گا۔'' وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئی جبکہ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر نہ جانے کیوں اسے غصہ نہیں آیا بلکہ پہلی بار دل عجیب طرح دھڑکا تھا۔ رات کو ٹیرس پر وہ کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی جب فرہاد آیا۔

''کیا کر رہی ہو تم یہاں؟ سب کو لگ رہا ہے کہ تم پڑھ رہی ہو اور وہ سارے مجھے باتیں سنا رہے ہیں کہ تم بھی پڑھو۔ دیکھو شیری کتنی محنت کر رہی ہے۔ انھیں کیا پتا کہ یہ صاحبہ یہاں چاند رات سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔'' اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے تشویش ہوگئی۔ ''تم ٹھیک ہو۔'' وہ اس کی طرف مڑی۔ ''لگ تو نہیں رہا کہ کچھ ہوا ہے۔'' فرہاد فکرمند ہو گیا۔ وہ اس کے لیے ایسا ہی تھا اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خاص خیال رکھنے والا۔ اسے یہ پتا نہیں کیوں معصوم سی لڑکی اپنے دل کے بہت قریب لگتی تھی۔

''اچھا چلو سو جاؤ۔ کافی رات ہو گی ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہوں ابھی جاتی ہوں تم جاؤ' جا کر تھوڑا پڑھ لو ورنہ واقعی کم نمبر آئیں گے۔'' وہ جبراً مسکرائی۔ ''ہوں ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ عجیب سی شکل بنا کر بولا۔ ''Take care goodnight'' وہ کہہ کر چلا گیا۔

شیری کو شام والی بات یاد آ گئی۔ شہود کا اس کا ہاتھ پکڑنا اور اس کے بدن میں سنسنی کا دوڑ جانا۔ فرہاد نے نہ جانے کتنی مرتبہ اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر

شیری کو ایسی فیلنگز کبھی نہ ہوئیں تھیں۔ یہ کون سا احساس تھا جو اسے بے کل کر رہا تھا ایک بہت خوبصورت ساجذبہ جیسے بہت خاموشی سے، اس کے دل میں اتر رہا تھا جسے شاید وہ

☆......☆......☆

اللہ اللہ کر کے اس کے پیپر ختم ہوئے۔ اسے لگا جیسے ایک اور زندگی ملی ہو جسے وہ کھل کر انجوائے کر سکتی ہو۔ اس نے اور فرہاد نے مل کر شاپنگ کا فیصلہ کیا۔ ''ہم دونوں شاپنگ پر جا رہے ہیں' کسی نے چلنا ہو تو بتائے۔'' فرہاد نے لاؤنج میں آ کر کہا۔

''ہم؟ ہم سے مراد۔'' فائقہ بھابی نے پوچھا۔

''ہم یعنی میں اور شیری۔ پیپرز ختم ہوئے تو سوچا کہ کیوں نہ مل کر چند جینز اور شرٹس ہی لے لیں۔''

''اچھا In! short تم لوگ کتوں کے پٹے لینے جا رہے ہو۔'' خلیل نے لقمہ دیا۔ ''خبردار جو کسی نے ہمارے بینڈز کو کچھ کہا۔'' فرہاد نے پرزور احتجاج کیا اور سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''بھئی یہ Dog bands کیا ہے۔'' شہود نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''لو اسے بھی بتاؤ کہ کتوں کے پٹے کسے کہتے ہیں۔'' رمیز ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

''ارے وہ جو بینڈز نہیں ملتے' وہ کیا کہتے ہیں' Friendship Bands انھیں ہم In short کتوں کے پٹے کہتے ہیں۔'' نعمان نے تفصیل بتائی۔ اور ایک دفعہ پھر سب پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ''چلو شیری ان سے خدا ہی نپٹے گا۔'' وہ اس کو گھسیٹتا ہوا لے گیا' ورنہ شیری کا ارادہ تھا سب سے دو دو ہاتھ کرنے کا۔

☆......☆......☆

''بھئی رمضان کی آمد آمد ہے' کچھ انتظامات ہی کر لیں۔'' فائقہ نے سلمٰی سے کہا جو کہ حسب معمول اپنے سوٹ کی کڑھائی ختم کرنے کے فراق میں تھی۔

''ارے سن رہی ہیں مسز منان' میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔'' وہ اس کے کان میں چیخی۔

''ارے بابا سن لیا۔ بتاؤ کرنا کیا ہے۔'' وہ اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''بھئی کرنا کیا ہے۔ ذرا صفائی ستھرائی کرتے ہیں۔ گھر کی ماسی تو ہے ہی' اب شیری بھی ہاتھ بٹا دے گی۔ وہ بھی فارغ ہے۔'' انھوں نے کہا۔ ''ہوں ٹھیک ہے تو کل صفائی کا دن ہے۔'' سلمٰی نے کہا اور دوبارہ مصروف ہو گی۔

''واہ بھئی۔ آج ہمارے گھر میں دو اور ماسیوں کا اضافہ ہو گیا۔'' شیری سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔ نہیں، تمہاری غلط فہمی ہے دو نہیں تین ماسیوں کا۔'' فائقہ جھاڑو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''سلمٰی ذرا شیری کے ہاتھ میں Dusting والا کپڑا تھمانا۔'' فائقہ نے اونچی آواز میں سلمٰی کو آواز دی۔

''ارے ...... نہیں نہیں! میں کوئی ڈسٹنگ وسٹنگ نہیں کروں گی میری اسکن خراب ہو جائے گی۔'' شیری سیڑھیوں پر ہی رک گی۔

''بھئی! آپ یہ کام بخوبی کر سکتیں ہیں تو مجھے کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے میری دونوں بھابیاں بہت سگھڑ ہیں۔'' وہ مسکا لگاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں اور ہم اپنی نند کو خود سے زیادہ سگھڑ بنانے والے ہیں۔'' سلمٰی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوتے بولی۔

''اب آ جاؤ نیچے۔ تم کیا سیڑھیوں پر قبضہ جما کر بیٹھی ہو۔ دیکھو بیچارہ شہود کب سے تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔ میڈم! کیا سیڑھیوں پر براجمان رہنا ہے۔'' فائقہ بھابی نے کہا تو اُسے جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کی پچھلی سیڑھی پر اس کے بہت نزدیک کھڑا تھا۔ شیری کی سانسیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے اسے جگہ دے دی۔ وہ آگے بڑھا تو اس کا ہاتھ شیری سے مَس ہوا۔

اس کی سانسوں کی رفتار میں تیزی آ گئی۔
شیری نے خود کو نارمل کیا اور نیچے آ گئی۔ ''چلیں بھابیز! کیا یاد رکھیں گی؟ کیسی اچھی نند ملی۔ چلیں خوش ہو جائیں۔ ما بدولت آپ کی help کرنے کو تیار ہیں۔''
''بڑی مہربانی ملکہ صاحبہ! اب اچھی ماسیوں کی طرح ڈسٹنگ کرو کہ تمہاری شکل نظر آئے۔''
ارے واہ واہ، شیری مقصود شہزادی نے اپنے لیے نئی جاب ڈھونڈلی۔ ویسے کتنی Pay ہے تمہاری۔'' فرہاد سو کر اٹھا تھا اور اپنے روم سے باہر نکلا تھا تو دیکھا شیری بڑی دل جمعی سے صفائی میں مصروف تھی۔
''کاش اتنی محنت کا مجھے پھل ملتا مگر افسوس صد افسوس۔ ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔'' شیری فلمی ہیروئینوں کی طرح ایک بازو ماتھے تک لے جا کر بولی۔ ''اچھا ہے تم فٹ رہو گی۔ ویسے بھی تم کچھ موٹی ہو گئی ہو۔'' فرہاد پانی کی بوتل منہ کو لگاتے ہوئے بولا۔
''ہائے اللہ! کیا میں موٹی ہو گئی ہوں؟'' وہ فوراً جھاڑنے والا کپڑا پھینک کر آئینے کے آگے ہوئی۔
''واقعی فرہاد میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ وہ شرٹ کو ٹائٹ کر کے بولی اور کھلاؤ مجھے اپنی فیورٹ چاکلیٹز میں بھی اتنی بے وقوف ہوں تمہارے ساتھ کھائے جاتی ہوں۔ خود تو جم جا کر کے فٹ رہتے ہو اور مجھے موٹا کر رہے ہو۔'' وہ منہ بسور کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔
''ارے نہیں بابا! اب اتنی بھی موٹی نہیں ہو رہی ہو۔ میں ہوں ناں تمہیں فٹ کرنے کے لیے۔ آج سے ہم دونوں واک پر جائیں گے میں بھی فٹ رہوں گا اور تم بھی۔ بس خوش۔'' وہ صوفے سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب جلدی سے ناشتا دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ مما کچن میں ہیں تم وہاں جاؤ۔''
''یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔'' وہ کہہ کر اٹھی اور چل دی۔
''اس لڑکی کم لڑکے کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو بھی ہے مجھے بہت پسند ہے۔ وہ سب سے ہٹ کر ہے۔'' فرہاد نے محبت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور جیسے خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا تھا۔
''ہوں چوری چوری کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ دیور جی! فائقہ بھابی نے فرہاد کے کان پکڑ لیے۔
ارے بھابی چھوڑیں بھئی میں نے کیا کہا ہے جو آپ مجھے اس طرح پکڑ رہی ہیں۔'' فرہاد جان بوجھ کر انجان بنا۔
''لو اور سنو تم جو شیری کے لیے کہہ رہے تھے۔ کہیں معاملہ سیریس تو نہیں؟'' وہ بولیں۔ ''نہیں بھابی بس وہ ایسے ہی۔'' فرہاد نے جھوٹ بولا۔ ''چلو بنو مت مجھے سب معلوم ہے۔''
''ہیں کیا معلوم ہے۔'' فرہاد گھبرا گیا۔
''یہی کہ تم شیری کو بحیثیت دوست سے کچھ زیادہ پسند کرتے ہو۔''
''ہاں وہ میری کزن بھی تو ہے۔'' وہ پھر انجان بنا۔ ''چلو بنو مت تم مجھے اپنا راز دار بنا سکتے ہو۔'' وہ ہاتھ آگے بڑھا کر بولیں۔
''پکا۔'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔
''بالکل پکا ایک دم صمد بونڈ جیسا۔'' وہ ہنس کر بولیں۔
''ٹھیک ہے پارٹنر صرف یہ بات آپ کے اور میرے بیچ رہنی چاہیے۔''
''کونسی بات؟'' فائقہ ایک دم انجان بن گئی۔
''بھابی Not fair ہاں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''ہوں میں تمہارے لیے دعا کروں گی کہ تمہیں تمہارا پیار جلدی مل جائے۔'' ''آمین۔'' فرہاد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

☆......☆......☆

''ہائے مر گئی۔ میری بھابیوں نے مجھ پر بڑا

ظلم کیا جو سارے گھر کی ڈسٹنگ کروا ڈالی۔'' شیری نے صوفے پر ڈھیتے ہوئے دہائی دی۔

''واہ جی واہ! آج ہماری نند نے تھوڑا کام کیا کر لیا ساتھ ہی جتانا شروع۔'' فائقہ بھی اس کے ساتھ صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے بولی۔

''بھابی واقعی آج ہم بہت تھک گئے ہیں مگر گھر صاف ہو گیا۔'' وہ اپنے پاؤں کو دباتے ہوئے بولی۔

''ہاں جنہوں نے صدیوں میں کوئی کام کرنا ہو وہ تو تھکیں گے ناں۔''

فرہاد نے انٹری ماری۔

''تم تو دفع ہی ہو جاؤ۔ مجھے تم سے یہ ہی امید تھی۔ ذرا جو تمہیں میرا خیال ہو۔ بس شروع ہو جایا کرو۔''

''اچھا بھئی! بہت تھک گئی میڈم۔ بولیں میں آپ کی کیا خدمت کروں۔'' وہ اس کے سامنے جھکتے ہوئے بولا۔

''دھپ۔'' ساتھ ہی سلمٰی بھابی نے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔ ''اس نے انوکھا کام کیا ہے دیور جی۔ ذرا بھابھیوں سے بھی پوچھ لیتے کہ بھابی میں آپ کی کیا خدمت کروں۔'' وہ اس کے انداز میں جھکتے ہوئے بولی۔ تو سب بے اختیار ہنس دیے۔

''اچھا اچھا چلیں۔ کیا یاد کریں گی۔ آج کی چائے میری طرف سے خوش۔'' وہ کچن میں گھستے ہوئے بولا۔

''جیو فرہاد۔'' فائقہ نے نعرہ لگایا۔

''ہاں بھئی آج گھر صاف لگ رہا ہے۔'' سکینہ بیگم اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔

''جی ممی۔ آج سارے گھر کی صفائی ہو گئی۔ آپ بس کچن دیکھ لیں کہ رمضان کی مناسبت سے سامان آجائے۔''

''ہاں میں اور بھابی وہ دیکھ لیں گے۔ تم لوگ رہنے دینا۔''

☆......☆......☆

''تمہارے رزلٹ میں کتنی دیر ہے۔'' جلیل نے فرہاد سے پوچھا جو پتا نہیں خلا میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

''ہوں، پتا نہیں۔'' وہ اس انداز سے بولا۔

''اوئے، کہاں کھوئے ہوئے ہو فرہاد۔'' شہود اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ارے کہیں نہیں شہود بھائی۔ آپ بتائیں سارا دن کہاں ہوتے ہیں نظر نہیں آتے۔''

''ارے یار یہیں ہوتا ہوں۔ وہ آج ذرا اپنی پھوپو کی طرف گیا تھا۔''

''ہیں آپ کی پھوپو بھی ہیں؟'' شیری نے حیرت سے پوچھا جو ابھی نیچے آئی تھی۔

''ہاں، میری ایک پھوپو ہیں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہیں اس شہر میں ہوتیں ہیں۔ بس ان کی طرف گیا تھا۔''

''کبھی ذکر ہی نہیں سنا۔'' جلیل بھی حیرت سے بولا۔

''ہاں ہم ان سے بہت کم ہی ملتے ہیں۔ پھوپا کو زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ بس وہ ذرا گرم مزاج کے بندے تھے۔ جب سے آیا ہوں میں بس یہ دوسری بار گیا ہوں۔ حالانکہ مجھے آئے مہینہ ہونے کو آیا ہے۔''

''شکر ہے اسے یاد تو آیا کہ کب سے ڈیرہ جمائے بیٹھا ہے۔'' شیری نے دل ہی دل میں سوچا۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گھر میں ہر طرف رمضان کا احترام چل رہا تھا۔ ہر کوئی اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ شیری کے بھی رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے اب وہ باقاعدہ سر پر دوپٹا اوڑھے رہتی تھی۔ ''واہ بھئی واہ بی بی حاجن آ گئیں۔'' فرہاد نے ہانک لگائی۔

لاؤنج میں بیٹھے سب ہی گھر والے مسکرانے لگے۔ چونکہ آج سنڈے تھا لہٰذا سبھی موجود تھے۔

شیری نے فرہاد کو آنکھیں دکھائیں۔ تو وہ شرارت بھرے انداز میں سکینہ بیگم کے پیچھے چھپ گیا۔

''رمضان ہے۔ اس لیے بخش دیا، جاؤ۔ کیا یاد کرو گے۔'' شیری شاہانہ انداز میں بولی۔ ''ہاں فرہاد واقعی ورنہ آج تیری ساری رات ہائے ہائے کرتے گزرتی۔'' رمیز نعمان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ سب ہنس پڑے۔

''بھئی کوئی شاپنگ واپنگ کرنی ہے کہ نہیں؟'' ارسلان نے پوچھا۔ ''ہاں ابھی سے شاپنگ شروع کرو بعد میں ٹیلر کپڑے نہیں سینے گے۔'' خلیل نے بھی کہا۔

''اس دفعہ ہم کچھ نیا کرتے ہیں۔'' فرہاد نے کہا۔

''کیا نیا؟ اس دفعہ تم کیا نیکر اور بنیان میں نماز عید پڑھنے جاؤ گے؟'' منان نے بھی حصہ لیا۔ سب نے قہقہہ مارا جبکہ فرہاد کا موڈ آف ہو گیا۔

شہود ان سب باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا اس کے لیے یہ باتیں بہت منفرد اور بہت مزے دار تھیں۔

''اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو۔ مابدولت تمہارے ساتھ شاپنگ پر چلیں گے۔'' شیری فرہاد کو کھسکا کر اس کے ساتھ صوفے پر گھس گئی۔

''ہاں تم جاؤ۔ اس کو بھی کتے کے پٹے دلوانا اور خود بھی لے لینا۔'' خلیل نے کہا اور اس بار دونوں نے ہی اس کو آنکھیں دکھائیں۔

''مامی جان! امی چند دنوں میں آئیں گی۔'' شہود نے سکینہ بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں' یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ جب چاہیں آئیں۔'' انھوں نے خوش ہو کر اسے دیکھا۔

☆......☆......☆

''سنیں مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' سکینہ بیگم نے مقصود شیرازی کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے بیگم! آج پھر سے شیری نے کچھ کر دیا ہے کیا؟'' انھوں نے فائلوں سے سر نکالا۔

''ارے نہیں۔ کیا کچھ نہیں ہے۔ مگر بات اس کی ہی کرنی ہے۔''

''وہ کیا؟'' انھوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''آپ نے دیکھا نہیں وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ سے گریجویشن بھی کر لیا ہے۔ اس کی شادی وادی کرنی ہے کہ نہیں۔''

''ہوں! کہتی تو ٹھیک ہو۔'' انھوں نے اپنی عینک اتاری۔ ''میری نظر میں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا شہود ہے ناں۔ آپا بھی آ رہی ہیں تو کیوں ناں بات کر لیں۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے۔ زرا بھابی سے مشورہ کر لوں۔''

☆......☆......☆

''بڑی امی آپ نے فرہاد کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے مل نہیں رہا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔''

''نہیں بیٹا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ شاید رمیز اور ارسلان کے ساتھ نکلا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے آنے دیں ذرا۔ اسے بتاؤں گی۔'' وہ غصے سے اپنے روم میں واپس چلی گئی۔

زرینہ بیگم مسکرا دیں۔ انھیں یہ بچی بہت عزیز تھی۔ ''امی کیا خیال ہے؟ شیری کو ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رکھ لیں۔'' فائقہ نے انھیں مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''ہوں! کیا بات کر رہی ہو؟ اللہ کرے کہ بچی جس گھر جائے خوش رہے۔ بھلا ہم اس کو اس گھر میں

کیوں رکھ لیں۔"
"ارے امی! ذرا اپنی نظر سے ماں کی عینک اتار کر اور ساس کی عینک لگا کر دیکھیں۔"
"ہیں کیا؟ میں سمجھی نہیں۔"
"ممی میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں ناں اسے آپ میری دیورانی کا درجہ دے دیں۔"
زرینہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
"ہاں بیٹا، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے تو خود یہ بچی بہت عزیز ہے اور پورے گھر میں رونق بھی تو اس کی اور فرہاد کی وجہ سے ہے۔ میں اسے اپنی بہو بنانے کے لیے منصور صاحب سے بات کروں گی۔
ماشاءاللہ میرے ابھی تین بیٹے ہیں۔"
"امی صرف دو۔ خلیل نے اپنی ڈھونڈ لی ہے۔"
"ہیں! کیا کہہ رہی ہو۔"
"جی امی وہ فیروزے نہیں ہے شیری کی دوست......"
"ہوں! بچی تو وہ بھی بہت اچھی ہے۔ آج ہی بات کروں گی۔ خلیل کی بھی اور شیری کی بھی۔"
انھوں نے تہیہ کرلیا۔
"ارے کہاں جا رہی ہیں آپ؟" شہود نے اسے پیچھے سے آواز دی۔
وہ بہت جلدی میں سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ رک گئی۔ عجیب حلیہ تھا اس کا۔ نائٹ سوٹ پہنا ہوا اپنے پرانے جوبن میں وہ جا رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے لگتا تھا جیسے سو کر اٹھی ہو۔
اس نے اس کا مکمل جائزہ لیا۔
اس کے گھورنے پر وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔
"وہ......وہ میں فرہاد کو دیکھنے جا رہی تھی۔"
"آپ ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں کوئی کام ہے تو مجھ سے کہہ دیں۔ میں کر دوں گا۔"
وہ چلتے چلتے اس تک آ گیا۔

اس کی سانس مزید تیز ہو گئیں۔
"مجھے فیروزے کی طرف جانا تھا۔" وہ چاہ کر بھی اسے انکار نہیں کر سکی۔
"ٹھیک ہے۔ آپ ذرا درست حلیے میں باہر آئیں۔ میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔" وہ اس کے حلیے پر طنز کرتا چلا گیا۔
اس نے اپنے اوپر نگاہ دوڑائی تو کچھ شرمندہ ہو گئی۔ وہ واقعی بہت برے حلیے میں تھی، مگر جلدی میں اس نے دھیان نہیں دیا۔
جب تیار ہو کر باہر آئی تو وہ اس کا بائیک کے پاس انتظار کر رہا تھا۔ "اف......! کیا کار نہیں ہے۔"
"نہیں، ساری گاڑیاں تو چلی گئیں۔ بس یہ بائیک ہے۔" وہ اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے۔ چلیں۔" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے بیٹھ گئی لیکن دل کی دھڑکن کو سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا لیکن شہود کے کپڑوں سے اٹھتی خوشبو اسے اپنے حواسوں پر سوار ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔"
مجھے بتائیں اس کا گھر کہاں ہے۔
"ہوں کیا کہا؟" وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ "شور کی وجہ سے آواز صحیح نہیں سنائی دے رہی ہے۔" وہ چلائی۔
شہود نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا ہلکا سا لمس شیری کے جسم میں ایک ارتعاش سا بکھیر گیا۔
"میں نے کہا کہ راستہ بتا دیں۔ سن رہی ہیں؟"
اس کی آواز جیسے اسے اپنے حواسوں میں واپس لے آئی۔ "ہوں! ہاں یہاں سے رائٹ لے لیں۔" اس نے خود پر قابو پایا۔
نہ جانے کیوں وہ اسے لمبے راستے سے لے کر گئی اور واپسی پر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔
"شیری، شیری کدھر ہو یار؟" فرہاد تو تقریباً چیختا

ہوا اسے ڈھونڈتا آیا اور اسے گارڈن میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ کہیں کھوئی ہوئی تھی اور اس اداس سے کونے میں اس کا حصہ لگ رہی تھی۔

''شیری یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''کچھ نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تو مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہے۔'' وہ گھاس اکھاڑ رہی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھ کر بولا۔

''محبت کیا ہوتی ہے فرہاد؟'' اس کے اچانک سوال پر وہ ہلکا بکا رہ گیا۔ نا چاہتے ہوئے وہ قہقہے مار کر ہنس پڑا۔ ''تو کیوں پوچھ رہی ہے۔''

فرہاد میں مذاق نہیں کر رہی۔ محبت کیا ہے؟''

اس بار وہ سیریس ہوا۔

''محبت!'' وہ رکا۔ مجھے زیادہ پتا نہیں، مگر اس میں انسان خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسے اس شخص کے ساتھ وقت گزارنا، اس کے قریب رہنا اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ اس کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے وہ۔ وہ۔ وہ۔ بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں پتا۔'' ''ہوں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تجھے ہو گئی ہے کیا؟'' اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ مگر شیری نے جواب نہ دیا اور اٹھ کر چل دی۔ ''تیرا تو پتا نہیں مگر مجھے ہو گئی ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔

آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ بار بار شہود کو سوچ رہی تھی۔ تو کیا وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھا۔

شلوار قمیض میں سلیقے سے دوپٹا لیے بالوں کی پونی کیے وہ ایک مکمل مشرقی لڑکی لگ رہی تھی۔ ''تو کیا میں لاشعوری طور پر خود کو اس کی مرضی کے مطابق بدل رہی ہوں؟ کیا میں واقعی شہود کو چاہنے لگی ہوں؟'' اس نے آہستہ سے آئینے میں ابھرتے اپنے عکس سے سوال کیا اور ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

''ارے ممی آپ نے شہود کو دیکھا ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔ ''نہیں بیٹا! وہ تو اپنی پھوپو کے گھر گیا ہے۔ کہہ کر گیا تھا کہ رات کو کھانے پر نہیں ہوں گا۔ ادھر سے کھا کر آؤں گا۔'' سکینہ بیگم نے کہا۔

''بھابی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو کیا بات ہے؟'' لان میں بیٹھی چائے پیتی ہوئی زرینہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے سکینہ کو دیکھا آپ کو شہود کیسا لگا۔

''اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ فرمانبردار ہے خوبصورت ہے۔ خوب سیرت ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' انہوں نے چائے کا کپ لے کر کہا۔

''وہ بھابی میں اور شیری کے پاپا شیری کے لیے شہود کا رشتہ مانگنے کے بارے میں سوچ رہے تھے میں نے سوچا آپ کا اور بھائی صاحب کا مشورہ بھی لے لوں۔ تھوڑے دنوں میں آپا آئیں گی تو بات کر لیں گے اگر شیری اپنوں میں جائے گی تو دل مطمئن رہے گا۔'' سکینہ بیگم کے پرجوش لہجے پر زرینہ بی ساکت سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

''آج گھر میں افطاری پر بہت اہتمام ہو رہا ہے خیر تو ہے۔'' شیری کچن میں گھس کر بولی۔ ''جی بالکل۔ آج گھر میں پھوپو آ رہی ہیں۔'' سلمیٰ نے کہا۔ ''مزہ آ جائے گا۔'' شیری نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں مزہ تو واقعی بڑا آئے گا۔'' سلمیٰ نے پراسراری ہنسی ہنسی تھی۔ جسے شیری نے محسوس کیا مگر آگے سے کچھ نہیں کہا۔ وہ باتیں کر رہی تھی کہ باہر سے فرہاد کی آواز آئی۔ ''السلام وعلیکم پھوپو جان۔''

''وعلیکم السلام جیتے رہو آباد رہو۔'' وہ اسے پیار دے کر بولیں۔ ''سلام پھوپو'' شیری ان کے گلے جا لگی۔

''ارے جیتی رہو۔'' انھوں نے اسے جوش سے گلے لگایا اور ماتھا چوم لیا۔ ''کیسی ہے میری بیٹی۔''

''بالکل فٹ فاٹ۔ آپ کو لگ نہیں رہی۔''

اس سے پہلے کہ وہ بولتی فرہاد نے لقمہ دیا۔

''چل ہٹ نظر نہ لگانا میری بیٹی کو۔'' وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

''اوں......'' شیری نے فرہاد کو منہ چڑھایا۔

''امی آپ آرام کرلیں اتنے لمبے سفر سے آئی ہیں۔'' شہود نے شیری کو ان کے ساتھ لپٹے بیٹھے دیکھ کر کہا۔ تو وہ شرمندہ ہوگئی۔ ''پھوپو آپ آرام کرلیں تھوڑی دیر۔ ویسے بھی افطاری میں ابھی کافی وقت ہے۔''

☆......☆......☆

پھوپو کے آنے سے گھر بھر میں رونق ہوگئی تھی۔ ہر کوئی پھوپو کے ساتھ لگا رہتا۔ پھوپو آپ میرے ساتھ عید کی شاپنگ پر چلیں گی۔'' شیری نے کہا۔

''ارے نہیں بیٹا میں نہیں جاؤں گی اب مجھ میں اتنی طاقت کہاں۔'' ''ارے! آپ کو کیا ہوا ماشاء اللہ سے ابھی جوان ہیں۔'' ''ہاں بھئی عید کے ساتھ ساتھ ہمیں اور بھی شاپنگ کرنی ہے۔'' زرینہ بیگم نے بھی حصہ لیا۔ سبھی نے ان کو دیکھا سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بولیں۔ ''میں نے سوچا کہ کیوں ناں اپنے دوسرے بیٹوں کے سر پر بھی سہرا سجا دوں۔ ہم نے یعنی میں نے اور سکینہ نے خلیل اور نعمان کی شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور حیران ہوئے ممی پر۔

اس سے پہلے کہ خلیل بولتا' فائقہ بھابی نے اسے کہنی ماری۔ ''پوری بات تو سن لیں دیور جی۔''

''ہاں ممی آپ کہاں تھیں ذرا لڑکیوں کے بارے میں تو بتا دیں۔''

''ہاں ہاں بھئی۔ میں کہہ رہی تھی کہ میں نے اور سکینہ نے خلیل کے لیے فیروزے اور نعمان کے لیے فائقہ کی بہن دعا کو پسند کیا ہے۔'' ''ہرے! کیا بات ہے ممی۔'' خلیل کے منہ سے اچانک نکلا۔

انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔ تو وہ کچھ شرمندہ ہوگیا۔

''بھئی! تمہیں میرا اور سلمٰی کا اور سب سے بڑھ کر شیری کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ تمہارے دل کی کہانی کو Translate کر کے سنایا ورنہ تم تو......'' خلیل نے شیری کو دیکھا جو بہت خوش تھی۔ ''تم بھی بتا دو نعمان تمہیں دعا پسند ہے۔'' سکینہ بیگم نے پوچھا۔

''جی ممی!'' نعمان نے ہنس کر کہا۔ ''واہ! واہ یعنی دونوں ہی گھنے نکلے۔'' رمیز نے ارسلان کو دیکھ کر کہا۔ ''چل ارسلان اب ہماری جوڑی کی باری۔ آج سے اپنے لیے لڑکیاں ڈھونڈنا شروع کیونکہ ان کے بعد تو پکا اپنا نمبر ہے۔'' رمیز نے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''نہیں تم سے پہلے شیری کی باری۔'' سکینہ بیگم نے کہا۔

شیری کا چہرہ جیسے بے اختیار شرم سے گلابی ہو گیا' جسے بالخصوص شہود اور فرہاد نے محسوس کیا۔

''لو جی! یعنی کم از کم تین سے چار سال انتظار۔'' ارسلان منہ بنا کر بولا۔ ''نہیں بھئی، لڑکا بس دیکھ ہی لیا سمجھ لو۔'' انھوں نے کہا۔ ''ہیں؟'' اس بار سب کے منہ سے نکلا...... ''ہوں۔'' وہ کہہ کر اٹھ گئیں جبکہ شیری کے اندر ایک عجیب بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔

آج سکینہ بیگم کا ارادہ رضیہ باجی سے شیری اور شہود کے لیے بات کرنے کا تھا۔ آج وہ صبح سے ہی

بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔
''بھابی آج افطاری کے بعد آپ میرے ساتھ باجی سے بات کریں گی شیری اور شہود کے لیے۔''
انھوں نے کلام الٰہی پڑھتی ہوئی زرینہ بیگم سے پوچھا۔
ایک منٹ کے لیے وہ رک گئیں، پھر ہمت جمع کر کے بولیں۔کیوں نہیں؟'' ''آخر شیری ہماری بیٹی ہے اور شہود اس کے لیے نہایت مناسب ہے۔''
حالانکہ وہ دل سے شیری کو اپنے فرہاد کے لیے چاہتی تھیں۔انھوں نے قرآن بند کیا اور سچے دل سے شیری کے لیے دعا کی۔
''شیری تم چائے ڈرائنگ روم میں لے آنا۔''
سکینہ بیگم نے شیری کو چائے بناتے دیکھا تو بولیں۔
''جی مما! میں لے آتی ہوں۔'' وہ چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔
ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔''باجی آج مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' سکینہ بیگم جوش سے بولیں۔''ہاں کہو کیا بات ہے۔''
''باجی! وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے کہیں۔''باجی میں چاہتی ہوں بلکہ ہم سب چاہتے ہیں کہ شیری اور شہود کا رشتہ طے ہو جائے۔آپ تو جانتی ہیں کہ شیری ہم سب کی جان ہے۔بڑے نازوں سے پالا ہے۔وہ اپنوں میں جائے گی تو ہمیں فکر نہیں ہوگی۔'' سکینہ بیگم نے ہمت کر کے بول ہی دیا۔
شیری کی دل کی دھڑکن ایک دم سے بہت تیز ہوگئی۔فرہاد نے پیچھے سے اسے ڈرایا تو اس کے ہاتھ سے ٹرے گرتے گرتے بچی۔اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اسے اس کی نانی یاد دلا دیتی مگر اس نے نظر انداز کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
اندر سے آتی آوازوں کی طرف وہ دونوں متوجہ ہوئے۔رضیہ بیگم عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھیں۔انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بات کیسے کہیں۔''یقین مانو میری اپنی بھی یہ ہی خواہش تھی۔'' سکینہ بیگم کے چہرے پر خوشی جھلک گئی۔زرینہ بیگم بھی مسکرا دیں۔''لیکن کیا باجی؟'' اس بار زرینہ بیگم بولیں جبکہ سکینہ بیگم ایک دم پریشان ہوگئیں۔
باہر کھڑی شیری اور فرہاد کا سانس بھی رک گیا۔
''میں شرمندہ ہوں۔'' رضیہ بیگم نے کہا۔''میں نے شہود کو اسی نیت سے یہاں بھیجا تھا کہ وہ شیری کو دیکھے۔میں تو بہت پراُمید تھی کہ شیری جیسی بچی اسے ضرور پسند آئے گی۔'' ''مگر وہ کہتا ہے کہ اسے لاابالی سی لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔اسے سگھڑ اور گھر کو سنبھالنے والی لڑکی چاہیے جو اگرچہ خوبصورت نہ ہو لیکن سلیقہ شعار ہو۔''
شیری کے ہاتھ سے ٹرے چھلک گئی جسے فرہاد نے سنبھالا۔''میں نے اسے سمجھایا کہ بچپنا ہے وہ سنبھل جائے گی لیکن وہ تیار نہیں ہے۔اس نے اپنے لیے اپنی پھوپو کی بیٹی پسند کی ہے۔میں اس پر زبردستی نہیں کر سکتی۔وہ میرے ہاتھوں کا پلا بڑھا نہیں ہے ناں۔بس اس بات پر چپ ہو جاتی ہوں۔''
شیری اس سے زیادہ نہ سن سکی اور ٹرے فرہاد کو پکڑا کر تیزی سے گھر چلی گئی۔اس سے زیادہ وہ کنٹرول نہیں کر سکی تھی۔فرہاد نے اس کو جاتے دیکھا تو ساری بات سمجھ گیا۔چھن...... سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا۔
سکینہ اور زرینہ بیگم دونوں ایک دم چپ ہوگئیں جبکہ رضیہ بیگم خاموش سی شرمندہ لگ رہی تھیں۔
وہ اپنے کمرے میں آ کر خوب روئی۔اسے سکینہ بیگم کی ساری باتیں یاد آنے لگیں جو وہ اسے سمجھاتی تھیں۔سکینہ بیگم بہت افسردہ تھیں۔انھوں نے مقصود صاحب کو بتایا تو انھیں دکھ ضرور ہوا، مگر انھوں نے

سکینہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اللہ نے ہماری بیٹی کا جوڑ ضرور اچھا ہی بنایا ہوگا۔''

''مگر مقصود صاحب میں کتنا سمجھاتی تھی کہ کچھ تو لڑکیوں والی حرکتیں کرو، مگر اس وقت مجھے سب کہتے تھے بچی ہے۔ اب دیکھیں لوگوں نے اس کے بچپنے کے ہی طعنے دیے ہیں۔'' وہ غصے سے منہ موڑ گئیں جبکہ مقصود صاحب نے خاموشی میں عافیت جانی۔ انھیں اپنی بیٹی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

آج سکینہ بیگم جب نیچے آئیں تو وہ سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم اسے نظر انداز کر گئیں۔ اس دفعہ عید بھی بہت خاموشی سے گزری۔ لڑکوں کو تو پتا نہیں تھا سب مصروف رہے۔ البتہ شیری کی خاموشی سبھی نے محسوس کی مگر پوچھا کسی نے نہیں۔ رضیہ بیگم عید کے بعد چلی گئی تھیں۔ انھوں نے اگلے ہفتے شہود کی منگنی کرنے آنا تھا۔ سکینہ بیگم نے اور زرینہ بیگم نے شہود کی منگیتر کے لیے کپڑے پسند کرنے کے لیے بازار جانا تھا۔ انھوں نے سلمیٰ اور فائقہ کو کہا کہ وہ بھی چلیں شیری سے بھی کہا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

فرہاد اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی مگر ہمت نہیں کر سکا۔

شہود سے رشتے کی بات صرف وہ چاروں ہی جانتے تھے اور گھر میں کسی کو پتا نہیں تھا۔

آخر وہ ہمت کر کے شیری کے کمرے میں گیا۔

وہ کانوں میں ہیڈ فون لگائے گانے سن رہی تھی۔

وہ دھڑام سے بیڈ پر گرا اس طرح وہ ماحول کو ہلکا بنانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ شیری کے دل کی ساری بات جان سکے۔ وہ اس کے کانوں سے ہیڈ فون اتار کر بولا۔ ''کہاں پر ہو یار میں کب سے یہاں ہوں تو بات نہیں سن رہی۔''

''فرہاد! میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے اس لیے تو پنگا مت لینا۔'' وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔

''سب ٹھیک ہے ناں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں کیوں؟'' وہ نظر انداز کر گئی۔

''یار سچ سچ بتا کہ کہیں تو شہود سے محبت......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شیری کو دیکھا ''ہاں!'' وہ اس سے زیادہ سنجیدگی سے بولی۔ ''فرہاد کے چہرے کا رنگ ایک دم ماند پڑ گیا۔ تو اس دن محبت کا اس لیے پوچھ رہی تھی؟''

''شاید ہاں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ میرا بچپنا تھا۔'' وہ اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کا غبار نکال دے۔ وہ جانتا تھا کہ شیری اپنے دل کی بات اس کے سوا کسی سے اتنا کھل کر نہیں کرے گی۔

''تو نے سنا نہیں کہ شہود صاحب (اس نے زور دیا) کو لاابالی لڑکیاں پسند نہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ مجھ میں بچپنا بہت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے۔''

وہ اٹھ کر ٹیرس میں چلی گئی۔ وہ بھی سر جھٹک کر پیچھے چلا آیا۔

رات کے تقریباً 9 بجے تھے اور ہوا میں خنکی بہت تھی۔ جاتے دسمبر کے دن تھے۔ ''مگر فرہاد وہ رک کر بولی۔ بچپنا ہی سہی، محبت تو محبت ہی ہوتی ہے ناں۔''

''ہاں محبت، محبت ہی ہوتی ہے۔'' وہ پتا نہیں کیسے بولا، مگر ضروری نہیں جسے ہم چاہیں وہ بھی ہمیں چاہے۔''

''ہاں ضروری نہیں مگر......'' وہ خاموش ہوگی۔

''تم نے کبھی اظہار کیا تھا؟'' وہ بولا

''نہیں۔''

''تو پھر اتنا یقین کیوں؟''

''پتا نہیں۔''

''مجھے محبت کا زیادہ نہیں پتا پھر، میں نے کہیں

پڑھا تھا ''زندگی اس کے ساتھ گزارو جو آپ کو چاہے جیسا کہ آپ ہو۔ وہ آپ کو نہ بدلے بلکہ ویسے ہی چاہے۔ آپ کی تمام خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ۔ وہ شخص آپ سے زیادہ محبت کرے گا۔'' جو آپ کو آپ کے اصل کے ساتھ اپنائے گا۔'' تم نے شاید جانا نہیں کہ کوئی تمہیں تمہارے اصل کے ساتھ اپنانا چاہتا ہے۔'' وہ خلا میں گھور کر بولا جبکہ شیری کو ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔

''تم......'' وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ وہ کیسے نہ جان پاتی کہ فرہاد کیا کہہ رہا ہے کیونکہ وہ بھی تو اسی منزل کی راہی تھی۔ ''تم......'' وہ کچھ بولتی اس سے پہلے فرہاد بول پڑا۔

''تمہاری شاید قریب کی نظر کمزور ہے میڈم! جو تمہیں یہ ہینڈسم نہیں دکھا۔'' وہ ہلکا سا مسکرا کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جو نہ جانے کب سے تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔ تمہارے اصل اور بچپنے کے ساتھ۔ مگر تم نے دھیان ہی نہیں دیا۔'' شیری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آنسو خوشی کے ہیں غم کے ہیں یا شرمندگی کے۔

''ذرا غور کرنا......'' وہ کہہ کر چلا گیا۔

جبکہ وہ منجدھار میں اکیلی رہ گئی۔

نہ جانے وہ شہود کے لیے اپنے دل میں محبت کا جذبہ کیسے پیدا کر پائی۔ اس نے فرہاد کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ یا شاید محسوس نہیں کیا تھا۔ یا شاید......؟؟

☆......☆......☆

آج کل گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ سب ہی شہود کی منگنی کی تیاریوں میں لگے تھے۔ شیری اس دن سے فرہاد سے کترا رہی تھی۔ آج فرہاد نے اسے پکڑ ہی لیا۔ ''ہائے......'' اس کی چیخ نکل گئی۔

''فرہاد کے بچے تجھے میں بتاتی ہوں۔''''ہائے میری قسمت۔'' وہ سر کے قریب ہاتھ لا کر بولا۔ ''میرے بچے جو پتا نہیں کہاں ہیں۔ لوگ انھیں یاد کرتے ہیں اور زندہ سالم ایک فرہاد نظر نہیں آتا۔'' وہ ایک دم سٹپٹا گئی۔

''یار تم مجھے اگنور کیوں کر رہی ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں تمہیں اگنور کیوں کروں گی۔'' وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔

''شیری یار تم سے معافی مانگنی تھی۔''

''کس لیے؟''

''اُس دن کے لیے شاید میں جذباتی ہو گیا تھا۔''

وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''I am sorry۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

جبکہ وہ چپ چاپ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

وہ ٹیرس پر کھڑی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ فائقہ بھابی اس کے پاس چلی آئیں۔ ''شیری ادھر آؤ۔'' وہ کپڑوں کا بیگ بیڈ پر رکھ کر بولیں۔

''جی بھابی۔'' وہ ٹیرس سے ان کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''تم بتاؤ کہ کون سا ڈریس شہود کی منگنی پر پہنوں۔ کب سے سلمیٰ سے کہہ رہی ہوں مگر وہ بے چاری اپنے میاں کے ساتھ مصروف ہے۔ تم بتاؤ۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں تو ٹھٹک گئیں۔ ''کچھ ہوا ہے شیری؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔ ''نہیں بھابی کچھ خاص نہیں۔ وہ ٹال گئی۔''

''آج کل میں نوٹ کر رہی ہوں کہ تمہارے اور فرہاد کے بیچ کچھ چل رہا ہے۔ وہ بھی چپ چپ ہے اور تم بھی۔ کہیں۔ تمہارا کوئی جھگڑا وگڑا تو نہیں

ہوا۔‘‘

وہ چپ رہی۔

’’تم چاہو تو شیئر کر سکتی ہو جیسا کہ فرہاد کرتا ہے۔‘‘

’’ہیں؟‘‘ اس نے مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا۔

’’میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔‘‘ انہوں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

’’کیا شیئر کیا ہے فرہاد نے؟‘‘ اسے ڈر تھا کہ کہیں شہود والی بات تو شیئر نہیں کی!

’’یہی کہ اس نے تم سے شاید اپنے دل کی بات کہہ دی ہو

’’ہوں اور؟‘‘

’’اس سے بڑی بھی کوئی بات ہے؟‘‘ وہ دوبارہ اس بے سوال کر کے بولیں۔

’’نہیں بھابی۔ میں سمجھ نہیں پا رہی۔ میں نے کبھی فرہاد کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ میرا سب سے بہترین دوست ہے۔‘‘

’’تو دیکھ لو جان! اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اس نے تم کو اس نظر سے دیکھ لیا ہے ناں۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔ اس سے بڑی کیا بات ہوگی کہ تم اپنے سب سے بہترین دوست میں اپنا ہم سفر پاؤ۔ وہ دوست جو تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات جانتا ہے۔ تم دونوں کے بیچ کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ لڑکیاں بہت خوش قسمت ہوتی ہیں جو اپنے شوہر میں اپنا بہترین دوست پائیں۔ اور تم تو اور بھی لکی ہو کہ تم اپنے بہترین دوست میں اپنا شوہر پاؤ گی۔ سچ تم دونوں ساتھ میں کتنے مکمل لگتے ہو۔‘‘

’’Made for each other‘‘ کتنے خوبصورت انداز میں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

’’ہوں۔‘‘ وہ مسکرا دی۔ شاید دل سے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

شہود کے لیے اسے اپنی فیلنگز بے جان سی محسوس ہونے لگیں۔ بھابی نہ جانے کب کی چلی گئی تھیں اور وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

وہ جتنا سوچ رہی تھی اتنی ہی پُرسکون ہوتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

آج سب بہت دنوں کے بعد لاؤنج میں موجود تھے۔ شیری چائے لے کر آئی۔

’’واہ واہ! ہماری مہارانی چائے لائیں ہیں۔ لوگو جگہ دو۔‘‘ ارسلان نے ہانک لگائی۔

اس نے چائے کی ٹرے ارسلان کو تھما دی۔

’’چلو ذرا جگہ عنایت کرو۔‘‘ وہ فرہاد کو کہنی مار کر بولی اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

فائقہ بھابی نے انگوٹھا اٹھا کر شاباش دی۔

وہ واپس اپنے جوبن پر آ گئی تھی جیسے سب ہی نے محسوس کیا۔

’’یار شیری! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ تو اتنے دن چپ چپ رہی اور عید بھی پھیکی گزری۔‘‘ رمیز نے لقمہ دیا وہ منان کے ساتھ بیٹھا کسی میگزین سے ڈریس چوز کر رہا تھا۔

’’ہاں، ہاں! بس تھوڑا سوبر بننے کا موڈ تھا۔ اس لیے تھوڑے دن چپ رہی۔ مگر اللہ توبہ کتنا مشکل کام ہے چپ رہنا۔‘‘ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

’’واہ! آج ہماری بیٹی نے بڑی مزے کی چائے بنائی ہے۔‘‘ مقصود صاحب بولے۔ ’’ہاں بھئی ہماری پری تو expert ہو گئی ہے۔‘‘

چائے بنانے کی زرینہ بیگم نے بھی تعریف کی جبکہ شیری نے جھک کر داد وصول کی۔

’’تم لوگوں کی تیاری مکمل ہے۔ کل شہود کی

انگیجمنٹ ہے۔'' خلیل بولا۔
''ہاں میری تو مکمل ہے۔'' رمیز نے کہا۔ ''میں نے سب سے پوچھا ہے۔ تجھ اکیلے سے نہیں پوچھا۔'' خلیل نے لقمہ دیا۔
''ہاں تقریباً سبھی کی مکمل ہے سوائے شیری کے۔'' سلمٰی بھابی بولیں۔ ''ارے! فرہاد نے بھی تو کپڑے نہیں لیے ابھی تک۔'' نعمان بھی بولا۔
''واہ جی واہ! آخر کسی کو ہماری یاد آ ہی گئی۔'' فرہاد اپنے اور شیری کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
''لو بھلا، تم دونوں وہ بلائیں ہو جنھیں فراموش کرنا ناممکن ہے۔'' جلیل نے لقمہ دیا۔
''ہم بلائیں تکتے ہیں۔'' شیری بولی۔ ''پوچھو ذرا بڑی امی سے۔ جان! جان ہیں ہم دونوں اس گھر کی۔''
زرینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
''خبردار جو کسی نے اس ہنسوں کی جوڑی کو کچھ کہا تو مقصود صاحب نے بھی پیار سے ان دونوں کو دیکھا۔''
''واہ چھوٹے پاپا چچی دل جیت لیا آپ نے۔'' فرہاد بولا۔
''کیا خطاب دیا ہے ہنسوں کی جوڑی۔'' منصور صاحب بھی مسکرائے جبکہ سکینہ بیگم کچھ خاموش خاموش تھیں۔
''چل یار شیری! ہم دونوں شاپنگ کر کے آتے ہیں۔'' فرہاد اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے شیری نے فوراً تھام لیا۔ فائقہ بھابی اور زرینہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی جبکہ باقی سب نے نوٹس نہیں کیا۔
''لو جا رہے ہیں دونوں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''کتوں کے پٹے لینے۔'' رمیز نے ساتھ ہانک لگائی۔

وہ دونوں مال میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔
''کچھ کھا لیں مجھے بھوک لگی ہے۔ دو گھنٹے سے کپڑے لینے آئے ہیں اور کچھ لیا بھی نہیں ابھی تک۔ فرہاد شیری سے بولا۔
''ہاں۔ پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔'' وہ بھی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں برگر سے مکمل انصاف کر رہے تھے۔ جب ایک دم شیری کو جیسے کچھ یاد آیا۔
''یار فرہاد! اس دفعہ میں چوڑی پاجامہ پہنوں گی اور پراندہ لگاؤں گی اور جو مجھے فیروزے نے ائیر رنگ دیئے تھے ناں اس کے ساتھ کا کلر لوں گی اس دفعہ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے۔'' وہ اس نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ فرہاد کو دیکھا۔
فرہاد جس کا منہ ابھی تک کھلا تھا اس نے صرف سر ہلایا۔
''اور تو کسی کو کچھ مت کہنا۔ میں اس بار سب کو سرپرائز دوں گی ٹھیک ہے۔''
''ہوں بالکل!'' وہ صرف اتنا ہی بول پایا۔
وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور تصور کر رہا تھا کہ شیری مشرقی حلیے میں کیسی لگے گی۔ فرہاد نے اس کی شاپنگ کرنے میں مدد کی اور شیری نے اس کے کپڑے سلیکیٹ کرنے میں اس کا ساتھ دیا۔ وہ صبح سے تیاری میں لگی تھی۔

☆......☆......☆

''یار کوئی میری مدد کر دے مجھے میرا جوتا نہیں مل رہا۔'' ارسلان لاؤنج میں زور سے چلا رہا تھا۔
''فرہاد کے کپڑے اس کے ساتھ اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے وہی لے گیا تیرے جوتے۔ رمیز نے کہا۔
''یار اس فرہاد کی تو میں ابھی خبر لیتا ہوں۔''
آج سکینہ بیگم کچھ خاموش تھیں۔ انھیں اپنی بیٹی کی زیادہ فکر ہو رہنے لگی تھی۔ ابھی تو اپنوں نے ٹھکرا

دیا تھا۔ کل غیروں نے بھی اس کے بچپنے کو لے کر اسے ٹھکرا دیا تو کیا کریں گے۔ بس یہ ہی فکر انہیں کھائے جا رہی تھی۔

مقصود صاحب نے ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بولے۔ ''بیگم اس طرح منہ مت بناؤ۔ رضیہ بہن کیا سوچیں گی کہ ہم ان کی خوشی میں خوش نہیں ہیں۔ تم دیکھنا ہماری شہزادی کے لیے کوئی شہزادہ ضرور آئے گا۔ تم اللہ کی ذات پر بھروسا رکھو اور موڈ ٹھیک کرو۔''

تب ہی دستک کے ساتھ زرینہ بیگم اندر آئیں۔

''اچھا ہوا بھابی آپ ذرا اسے سمجھائیں۔'' ''ہاں ضرور۔ تم ذرا جاؤ تمہارے بھائی بلا رہے ہیں تمہیں۔'' ''جی بھابی!'' وہ کہہ کر چلے گئے۔

''بھابی آپ ذرا انہیں سمجھائیں یہ کیوں نہیں سمجھ رہے۔ ماشاء اللہ شیری بائیس کی ہونے والی ہے۔ اب وہ بچی نہیں رہی۔''

''ارے میں آج تم سے اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔ ہماری شیری کے لیے رشتہ آیا ہے۔''

''ہیں بھابی۔'' اُن کے چہرے کا رنگ کھل گیا۔

''کون ہے بھابی؟ کہاں رہتا ہے؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بتاتی ہوں بھئی بتاتی ہوں۔''

''لڑکا بہت ہی اچھے گھرانے کا ہے۔ چار بھائی ہیں۔ وہ سب سے چھوٹا ہے۔ بڑے بھائی کی شادی ہوگئی ہے۔ دوسرے کی منگنی وغیرہ کی تیاری ہے اور تیسرے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کا۔

اچھا بھابی! کہاں رہتے ہیں۔ وہ لوگ؟''

''بھئی اس گھر میں رہتے ہیں وہ لوگ اور لڑکے کی ماں ہی تمہارے آگے بیٹھی ہے۔''

''ہیں! بھابی یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

''ہاں سکینہ مجھے شروع ہی سے شیری بہت عزیز ہے۔ میں اپنے فرہاد کے لیے اسے مانگ رہی ہوں۔ بس تم ہاں کرو۔ شیری اسی گھر میں رہے گی۔''

سکینہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے پگلی روکیوں رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی ساری زندگی اس گھر میں رہے گی اور تم دیکھنا میرا فرہاد اسے بہت خوش رکھے گا بہت چاہتا ہے اسے وہ۔''

''سچ بھابی! میں نے کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں اتنا ہی کم ہے۔''

ان کی آنکھوں میں مشکوریت کے آنسو تھے۔

''بھئی ابھی میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ پہلے تم سے ہی بات کر رہی ہوں۔ اب تمہاری رضامندی کے ساتھ پورے رسم و رواج سے رشتہ مانگوں گی سب کے سامنے۔'' تبھی فرہاد نے آکر بتایا کہ پھوپو وغیرہ آگئے ہیں آجائیں۔

''بھئی سب آگئے ہیں تو چلیں۔'' مقصود صاحب بولے۔ ''جی ماموں! نکلنے میں کافی دیر ہوگئی ہے۔'' شہود کی بڑی بہن بولی۔

''ارے بھئی! یہ شیری کہاں ہے؟'' سلمٰی بھابی نے کہا۔ فرہاد جو پانی پی رہا تھا بولا۔ ''آج لگتا ہے وہ لڑکیوں کی طرح تیار ہو رہی ہے۔ کافی ٹائم لگ رہی ہے۔'' ''ہاں بھئی کہاں ہے یہ؟'' رمیز کو بھی جستجو ہوئی۔ تبھی فیروزے بھی داخل ہوئی۔

''السلام علیکم! ایوری باڈی۔''

''وعلیکم السلام بیٹا آؤ بھئی بڑے ٹائم پر آئی ہو۔ ہم بس نکل رہے تھے۔'' منصور صاحب نے اسے پیار دیتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو آپ کو شہود بھائی۔'' وہ شہود کو پھول دیتے ہوئے بولی۔ ''Thank you فیروزے۔'' شہود نے مسکرا کر تحفہ قبول کیا۔

''آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو فیروزے۔''

سکینہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے خلیل کو دیکھا۔ تو وہ
جھینپ گیا۔
''ارے یہ لڑکی کون ہے ہمارے گھر میں جو اوپر
سے آرہی ہے۔''
ارسلان حیرت سے دیکھ کر بولا تو سارے متوجہ
ہوگئے۔
''ماشاءاللہ بہت حسین لگ رہی ہو میری بچی۔''
زرینہ بیگم نے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔
فیروزی اور گولڈن کنٹراسٹ کی لونگ شرٹ اور
چوڑی دار پاجامے میں بڑا سا دوپٹہ اوڑھے میچنگ جیولری،
پراندہ اور گجرے میں وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔
سبھی نے اس کی تعریف کی۔ اس نے فرہاد کو
فخریہ انداز میں دیکھا اور فرہاد نے آگے
سے Victory کا نشان بنایا۔
جسے صرف شہود نے دیکھا۔
فیروزے سے ملتے ہوئے اس نے جتانے
والے انداز میں۔
''لو دیکھ لو! میں نے تمہارے دیئے ہوئے ایئر
رنگز کی خاطر یہ سوٹ بنایا ہے۔''
''ہائے میری ایئر رنگز کی قسمت! دیکھو کتنے خوش
نصیب ہیں۔ ان کی خاطر شرمین شیرازی نے جوڑا
بنایا۔'' دونوں مسکراتے ہوئے گلے ملیں۔
''تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے
صدق دل سے تعریف کی۔
''سلام پھوپو جانی آپ کیسی ہیں اور آپی آپ
لوگ کیسی ہیں؟'' وہ فرداً فرداً سب سے ملی اور گول
مٹول بچوں کو پیار کرنے لگی۔
''بھئی میری بچی کی نظر اتارو سکینہ۔'' رضیہ بیگم
نے اسے نثار ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔
''جی بالکل باجی!''
''آج تو میں واقعی شکرانے کے نفل ادا کروں
گی۔ میری بیٹی لڑکی، لڑکی سی لگ رہی ہے۔'' وہ
اسے چھیڑتے ہوئے بولیں۔
''مما بھئی اب بس کریں۔ میرے ساتھ کوئی
اور بھی ہے جس کو کریڈٹ جاتا ہے۔'' وہ بولی۔
''کون ہے بھئی وہ۔'' سلمیٰ نے حیرانگی سے
پوچھا۔
''بھئی ایک ہی ہوگا اور کون ہوسکتا ہے۔'' فائقہ
بھابی نے دخل دیا۔
''فرہاد۔'' اس بار جلیل بولا۔
''جی بالکل ٹھیک اندازہ لگایا اس نے میری
بہت ہیلپ کی ہے۔''
''Thanks buddy۔'' وہ فرہاد کو دیکھتے
ہوئے بولی۔
وہ تو مسکرادیا۔ ''آپ کو بہت بہت مبارک ہو
شہود۔'' شیری شہود کو اکیلا کھڑے دیکھ کر اس کے
پاس چلی آئی۔
''Thanks۔'' وہ صرف اتنا ہی بول پایا۔ وہ
جانے لگی تو شہود نے اسے روک لیا۔ ''رکیں مجھے
آپ سے بات کرنی ہے۔''
وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ ''جی؟''
''I am sorry۔''
''کس بات کے لیے۔'' وہ حیرانگی سے بولی۔
''آپ جانتی ہیں کس بات کے لیے۔''
''اوہ اچھا! اُس بات کے لیے۔'' وہ ایسے بولی
جیسے اس کچھ یاد آگیا ہو۔
''O its OK بلکہ مجھے آپ کو Thanks
کرنا چاہیے آپ کی وجہ سے مجھے میرے بہترین
دوست میں ایک اچھا ہم سفر ملا ہے۔ اگر آپ مجھے نہ
ٹھکراتے تو شاید میں نہ جان پاتی۔
کیا مطلب؟'' وہ حیرانگی سے بولا۔
''مطلب پھر کبھی بتاؤں گی۔ ابھی آپ کی منگنی

کی تقریب کے لیے دیر ہو رہی ہے۔''

وہ اسے حیرانگی میں چھوڑ کر چلی گئی۔ جہاں سارے جانے کی تیاری میں تھے۔

''بھئی جانے سے پہلے کیوں نہ کچھ تصویریں لے لی جائیں۔'' نعمان نے رائے دی۔

''ہاں موقعہ بھی ہے اور دستور بھی۔'' منان نے ہانک لگائی۔ ''لو بھئی میں کیمرا لے آیا۔ چلو سارے اچھے اچھے پوز دو۔'' ارسلان بولا۔

''کیوں نہ سب سے پہلے ایک گروپ فوٹو ہو جائے سارے اکٹھے ہو جائیں۔'' جلیل نے کہا سارے جلدی جلدی اکٹھے ہو گئے۔

''یا خدا، اتنی بڑی فیملی ہے کہ ایک فریم میں پوری نہیں آرہی۔'' ارسلان فریم سیٹ کرتے ہوئے بولا۔

''لو بھلا! ابھی کہاں بڑی ہے۔ ابھی تو ہم پانچوں کی دلہنوں نے بھی آنا ہے پھر بڑی ہو گی یہ فیملی۔'' خلیل بولا۔ ''غلط، غلط، بات۔ پانچوں کی نہیں صرف تینوں کی۔ دو کی تو اسی فریم میں ہیں۔'' فائقہ بھابی نے خلیل کی بات کاٹی۔ ''ہیں دو کون؟'' نعمان بولا۔

''ایک تو فروزے ہو گی۔ دوسری کون؟'' رمیز بولا۔ سبھی کی آنکھوں میں حیرانی تھی جبکہ زرینہ بیگم، سکینہ بیگم فائقہ، فرہاد اور شیری مسکرا رہے تھے۔

''بھئی آپ پانچوں کو کیوں ہنسی آرہی ہے۔ ہمیں بھی پتا چلے۔'' منصور صاحب بولے۔

''بھئی ہنسی کہاں آرہی ہے۔ ہم تو بس مسکرا رہے ہیں۔'' سکینہ بیگم بولیں۔ ''چلیں وجہ تو بتائیں۔''

''بھئی ہماری ہنسوں کی جوڑی ہے ناں۔ یہ جوڑی زندگی بھر بنی رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ انہوں نے گول مول بات کر دی۔ اب بندہ پوچھے ہم سب میں سے ہنس کہاں سے پیدا ہو گئے۔ امی بھی ناں عجیب وغریب باتیں کرتی ہیں۔'' رمیز نے ہنس کر انہیں دیکھا۔ ''اوئے ہوئے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' ارسلان حیرانی سے بولا۔ ''یار! شیری لڑکے سے شادی کیسے کر سکتی ہے اس کے لیے تو ہم نے ابھی لڑکی ڈھونڈنی ہے۔''

سب بے اختیار ہنس دیے۔ جبکہ شیری آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ فرہاد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ٹھنڈ رکھ کڑیے ٹھنڈ رکھ!''

''کیا واقعی یہ ہنسوں کی جوڑی ایک ہونے والی ہے۔'' سلمٰی بھابی تقریباً چیختے ہوئے بولیں۔

''ہوں!'' سکینہ بیگم نے کہا۔

شیری ایک دم شرم سے سمٹ گئی جبکہ سبھی نے ہرے کا نعرہ لگایا۔

''یہ دونوں تو چھپے رستم نکلے۔ دیکھو ذرا ہمیں بھنک بھی نہیں لگنے دی۔'' ارسلان بولا۔ ''اور کیا ہم سمجھے کہ ابھی ان کی عمر گتوں کے پتوں سے کھیلنے والی ہے اور یہ ہم سے بھی پہلے بینڈ باجا بجوانے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' نعمان بولا۔

سبھی ہنس پڑے۔

رضیہ بیگم نے بڑھ کر اس جوڑے کی نظر اتاری۔ ''جیتے رہو۔ میرے بچو سدا آباد رہو۔''

''ہلو بھئی۔ اب سارے ذرا جوڑوں میں آؤ تصویر کے لیے۔''

ارسلان کیمرہ دوبارہ سنبھالتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے دولہا اور اس کی امی کی جوڑی، پھر بہنوں کے ساتھ اور پھر......'' نعمان مزید بولتا اس سے پہلے ہی رمیز نے ٹانگ اڑائی۔ ''ہمیں پتا ہے اور ذرا جلدی کریں دلہن والوں کا کھانا کہیں ٹھنڈا نہ ہو جائے۔''

''اچھا ہے بھئی یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ ہمیں ان لمحوں کو یادگار بنا لینا چاہیے۔'' شہود نے نعمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سب اپنے اپنے پارٹنر کے ساتھ تصویر بنوانے لگے۔ ''شیری یار! آج تم واقعی ہی حسین لگ رہی ہو۔'' فرہاد نے شیری کو اکیلا کھڑے دیکھا تو موقع غنیمت جان کر بولا۔

''ہاں پتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ شیری کوئی کام دل سے کرے اور وہ خراب ہو۔''

''ہاں بھئی! مگر پتا ہے جب تم نے اس آئیڈیا کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے لگا تھا کہ تم کارٹون لگو گی۔'' میں دل ہی دل میں تم پر ہنس رہا تھا۔

''فرہاد کے بچے تو رک ذرا تو مجھے کارٹون تصور کرتا ہے۔''

وہ کارٹون والی بات سن کر اس پر چڑھ دوڑی۔

ابھی دو تین ہی گھونسے مارے ہوں گے کہ شہود آ گیا۔

''اوہوں......'' وہ ان کا دھیان اپنی طرف کرنے کی خاطر کھنکھارا۔

''اوہ بھائی آپ! چھوڑ شیری!'' فرہاد اپنے آپ کو چھڑا کر بولا۔ شیری بھی ایک دم سنبھل گئی۔

''Congratulations میں تم دونوں کے لیے بہت خوش ہوں۔ تم دونوں واقعی ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ اور شاید یہ بات تم بھی نہیں جانتے۔ میں نے شیری کے لیے انکار بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ تمہاری ہو جائے۔ شیری I am really sorry مگر میں جب بھی تم دونوں کو دیکھتا تھا تو لگتا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر بالکل ادھورے ہو۔ اور اگر کوئی تیسرا بندہ تم دونوں کے درمیان آ جاتا تو شاید تم دونوں ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔''

''مگر شہود آپ نے تو......'' شیری حیرانگی سے بس یہ ہی بول پائی۔

''تم لاابالی سی ہو۔ یہ ہی ناں؟ امی سے میں نے ہی کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کوئی تو مضبوط ریزن ہونا چاہیے ناں انکار کے لیے اور یہ بالکل سچ ہے۔''

''مگر آج تم بالکل لاابالی سی نہیں لگ رہی اور سچ کہوں تو آج مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ شاید غلطی ہو گئی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''اچھا جی! ابھی بتاتا ہوں نیلہ بھابی کو کہ شہود بھائی کو افسوس ہو رہا ہے۔''

فرہاد بات کو سنبھالتے ہوئے اور ماحول کو ہلکا بنانے کے لیے بولا۔

''نہیں وہ بہت اچھی ہے۔ اور I am sure میں اس کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزاروں گا۔ انشاء اللہ۔''

شہود کے جانے کے بعد فرہاد نے شیری کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

''تمہیں تو کوئی افسوس نہیں ہے ناں شیری۔''

''ہوں! نہیں، بالکل نہیں میں اپنے خدا کے اس فیصلے سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم جتنے اچھے دوست ہو اس سے کہیں زیادہ اچھے جیون ساتھی ثابت ہو گے۔''

''میں دعویٰ نہیں کرتا مگر کوشش پوری کروں گا۔ چلو ہم بھی چل کر تصویر بنوا لیں کہیں ہمیں چھوڑ کر نہ چلے جائیں یہ لوگ۔ کوئی بھروسا بھی تو نہیں ہے۔''

فرہاد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

جسے شیری نے بہت گرم جوشی سے تھام لیا۔

دونوں کے خوشی سے چمکتے چہروں کو شہود نے مسکرا کر دیکھا تھا لیکن اس مسکراہٹ میں چھپے درد کو کوئی بھی نہ مان پایا تھا۔

آج شیرازی ولا میں محبت اور خوشیوں نے ایک بار پھر ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

ہر طرف محبت کی پُرسکون ہوا چل رہی تھی۔

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی اٹھارویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کرپایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچادیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔

امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کتھا سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں

ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ امل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہر النساء بیگم سے امل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہر النساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اِس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر......

(اب آگے پڑھیے)

''ہر شخص دوسرے کے بارے میں کتنی سہولت سے قیاس آرائیاں لگا لیتا ہے۔'' خاموشی کی زبان اُمِ فروا کے اندر واویلا برپا کر گئی۔ زیست کے ان گنت لمحوں کا حساب وہ کس سے مانگتی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' اُن کی گھمبیر آواز نے خاموشی کے قفل اچانک توڑے، پل بھر میں دونوں کی نگاہیں ملیں، ایک بارگی ملک مصطفیٰ علی کو محسوس ہوا کہ اُمِ فروا کی آنکھوں کی پتلیوں پر اُن کا عکس تھرتھرایا ہے۔

''کچھ نہیں۔'' حالانکہ اس کے اندر ایک الاؤ تھا دہک رہا تھا۔

''اُمِ فروا آپ کے دل میں کوئی بھی اندیشہ، فکر مندی کھٹک رہی ہے تو آپ بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔'' اس وقت وہ کچھ کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ آخر کس برتے پر اس کی آنکھیں شکوے ٹپکاتیں۔ اس وقت ملک مصطفیٰ علی کا دل چاہ رہا تھا اس کے چہرے کی مقدس اُداسی ہمیشہ کے لیے چن لیں، جو پھر کبھی نہ اس شاداب چہرے پر چھلکے، دونوں ہی خاموش تھے، بس خاموشی گفتگو کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''اے اللہ! ہمیشہ کی طرح میری مدد فرماتے رہنا۔ میں بندہ بشر ہوں بس میرے لیے وہ کر دے جو میرے لیے بہتر سمجھتا ہے۔ تجھ سے بہتر جاننے والی کوئی ہستی نہیں۔ اے رب کل رب دو جہاں سمیع لعلیم میرے لیے آسانیاں فرماتے ہوئے مجھے قوی ہمت عطا کر۔'' مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کب سے جاء نماز پر بیٹھی اپنے رب سے باتیں کر رہی تھی۔ کبھی گڑگڑاتے ہوئے رقت آمیزی سے سر بسجود ہو جاتی، کبھی دو زانو بیٹھی ہاتھوں کی گلابی ہتھیلیاں جوڑے انہیں پیشانی سے ٹیکے رب سے ہمکلام ہو جاتی تھی۔ اچانک سے اس کے بے قرار دل کو گہرا سکون میسر آ گیا۔

اس کی زندگی کے بے شمار لمحات بلال حمید نے ایک انمٹ سیاہی سے رقم کیے تھے، جنہوں نے اُمِ فروا کی زندگی کو رنجیدہ کر دیا تھا۔

'اُمِ فروا گزشتہ لمحوں کا مت جواب دو، اُن کی بار بار کی پکار کو اَن سنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ رب نے تم پر کرم کیا بس اُس کی عنایت کو یاد رکھو۔ وہی تو تمہارے اس درد کو تمہاری روح سے کھینچ نکالنے والی ہستی ہے۔' مبہم احساس بار بار اُسے سنبھال رہا تھا۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ کب کی جاء نماز پر بیٹھی تھی۔ نم پلکوں کو اُس نے ملائم پوروں پر ٹکایا تو گداز ہتھیلی کے بیچوں بیچ تمام نمی جذب ہو گئی۔ وہ کھل کھلا کر مسکرائی اور کھڑے ہوتے ہوئے عشاء کی نماز پڑھنے لگی۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ اپنے لیے ایک کپ چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ آج اس نے پورا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے نپے تلے قدموں میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔ فریج کھولا تو فریج کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے دودھ کا پیکٹ نکالا اور چائے بنانے لگی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دوپٹہ درست کرتی بنا آہٹ نرم نرم پاؤں ماربل فرش پر جماتی۔ دروازے تک آئی۔

''کون؟'' دروازہ کھولے بغیر اس نے پوچھا۔

''مصطفیٰ علی ہوں۔'' دوسری جانب سے جواب آیا۔ دروازے کے اُس پار کھڑی اُمِ فروا کے دل میں عجیب سی بے کلی ابھری جو تیزی سے اُس کے اطراف کنڈلی ڈالے اپنے اندر جکڑتی چلی گئی۔ یہ کیسی طمانیت آمیز چبھن تھی جو اسے بے قرار کررہی تھی۔ سماعتوں میں سیٹیاں بجتی چلی گئیں۔ اپنی اس کیفیت سے ہراساں ہوتے ہوئے وہ سٹ پٹائی۔

''میرے رب یہ سب کیا ہورہا ہے میرے ساتھ۔ بس تُو ہی مجھے ہدایت دینے والا ہے۔'' کتنے لمحے گزر گئے اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اب بھی ایک لرزش تھی جو اس کے وجود پر طاری تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگی۔ دل کی دھڑکنیں اب قدرے اعتدال پر آچکی تھیں لیکن تنفس بدستور تیز تھا۔

''اندر آسکتا ہوں۔'' ملک مصطفیٰ علی ابھی تک دہلیز کے اُس پار تھے۔

''ضرور تشریف لائیے۔'' وہ اندر آگئے۔

''کیسی ہیں آپ؟'' انہوں نے بغور اُمِ فروا کی متورم آنکھوں کی طرف بظاہر طائرانہ نگاہ ڈالی لیکن وہ اس کی آنکھوں کا احوال اندر تک جان گئے تھے۔ تب اُن کے بھینچے بھاری ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ ابھرتے ہوئے دوسرے لمحے معدوم ہوتی چلی گئی۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی بے قرار دل کو قرار عطا ہوگیا۔ کیسا قیامت خیزی لیے ہوئے ہے، اس کا اُداس سوگوار حسن...... مجسم کردینے کی قدرت جس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ خداوندکیا یہ اس کے اس بے انتہا بے پایاں حسن کا ہی کرشمہ ہے جو مصطفیٰ علی وہ نہیں رہا جو وہ تھا۔ ہر بار ایک نئے انداز سے وہ ٹھٹکتے تھے۔ اُمِ فروا متذبذب کنفیوز سی اُن کے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سیاہ چمڑے کی خوشانی کھیڑی میں اُن کے شفاف پیر چمک رہے تھے۔ اُمِ فروا نے دونوں ہونٹوں کو آپس میں ملا کر دبایا۔ ملک مصطفیٰ علی کے احساس کی بارآوری اُمِ فروا کو اپنے ایوانوں سے نکلنے ہی نہ دے رہی تھی۔ اُمِ فروا کی سیاہ آنکھوں پر لرزتی پلکیں جن میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے یک بارگی پھر اُس کی جانب کن اکھیوں سے دیکھا۔ وہ آہستہ روی سے چلتے لاؤنج میں آگئے۔ اُن کے ہاتھوں میں چند شاپرز دیکھ کر اُمِ فروا نے سوالیہ نگاہوں سے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔ تمام چیزیں انہوں نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیں اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے نظریں جھکا کر کھڑی اُمِ فروا کی طرف دیکھا، جس کے حسن کا تابناک لیے فسوں ہر سمت پھیل رہا تھا۔

''کیا ہورہا تھا؟'' ملک مصطفیٰ علی کی گداز نگاہیں بدستور اُمِ فروا کے صبیح چہرے پر ٹھہرتی جارہی تھیں۔

''جی......!'' برجستگی میں اُس نے جی...... کو خاصا لمبا کھینچا تھا۔ وہ اس خاص الخاص ہستی کے انداز پر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''وہ میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔'' گردن پر مخروطی انگلیوں کی پوریں سرسراتے ہوئے وہ ہکلا کر گویا ہوئی۔

''پلیز دو کپ بنا لیجیے، مجھے بھی چائے کی شدید طلب محسوس ہورہی ہے۔''

''جی اچھا۔''

''یہ گرما گرم نگٹس اور پیزا ہے یہ بھی لے آئیں بھوک لگی ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے نرمی سے اپنے بائیں گال پر انگشت شہادت سرسرائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایزی ہوکر بیٹھ گئے۔ اُمِ فروا بلاوجہ بار بار دوپٹے کو درست کررہی تھی۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، پہلے ہی فریج بھرا پڑا ہے۔''

''اُم فروا یہ کیسا تکلف ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی مسکرائے۔ اس وقت وہ گھبرائی ہوئی لڑکی دوپٹہ درست کرتی تو کبھی اپنی انگلیاں مسلتی خطرناک حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ تب اُم فروا نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ انہوں نے دیوار گیر ایل سی ڈی آن کیا، اسکرین کی بجائے اُن کا دھیان کچن میں موجود اُم فروا کی طرف ہی تھا۔ خداوند قدوس نے ملک مصطفیٰ علی کے سینے میں اُم فروا کے اُنس کے کیسے مشکبار شہر بسا دیے تھے، جن سے رہائی چاہتے ہوئے بھی اب ناممکن تھی۔ وہ کیا نام دیتے اس احساس کو جس نے ملک مصطفیٰ علی کے دل کی ہر ریش کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ دوپٹے کے ہالے میں قید اُس کا نورانی چہرہ دور سے جھلملایا۔ تب اچانک سے ملک مصطفیٰ علی نے آنکھوں کو مضبوط انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔ وہ سرگوشی میں بڑبڑائے۔

''اے اچھی لڑکی! تیرے چہرے کے یہ پاکیزہ رنگ اب تو ہمیشہ کے لیے میری زیست کے موسم بن گئے ہیں۔'' تب انہوں نے خلوصِ دل سے اپنے رب سے التجا کی تھی۔

''میرے پیدا کرنے والے! اسے میرا کر دے یا مجھے اسے سونپ دے۔'' غیر ارادی میں اُن کے یاقوتی ہونٹ ہل رہے تھے۔ تب آنکھوں کی کوروں میں کہیں دور ہلکی سی نمی اُتری تھی۔ اُن مختصر پلوں میں ملک مصطفیٰ علی کے دل میں گہری شدتیں وجذباتیت عود آئی تھی۔ اُن کا دھیان اب بھی کچن کی طرف تھا، جہاں اُم فروا موجود تھی۔ دبیز شگفتگی وتازگی میں مقید تھا اُس کا چارمنگ سراپا۔ اس وقت انوکھی طمانیت ملک مصطفیٰ علی کے چہرے پر عیاں تھی۔ وہ اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔ وہ تو صرف اور صرف اُم فروا کو ہی سوچنا چاہتے تھے۔ جس نے اس کڑیل مضبوط ملک مصطفیٰ علی کو ایک دم سے نکما کر دیا تھا۔ وہ چونکے کیونکہ اُم فروا ٹرالی گھسیٹتی اُن کے قریب آچکی تھی۔ وہ عالمِ بے خودی سے عالمِ ہوش میں لوٹ آئے۔ جب اُم فروا نے چائے کا کپ اُن کے سامنے رکھا تو وہ دل سے مسکرائے۔ اب وہ پلیٹ اُن کے ہاتھ میں پکڑا رہی تھی۔ اُم فروا کی کپکپاتی انگلیاں دیکھ کر وہ مسکرائے اور اُس کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ لی۔

''اُم فروا، آپ نے دوپہر کو کھانا کھایا تھا؟'' وہ فش پیس اٹھاتے ہوئے بولے۔

''نہیں۔'' اُس نے نظریں کترائیں۔

''واٹ؟''

''بھوک نہیں تھی۔''

''اُم فروا مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ آپ نے لنچ نہیں کیا۔'' لہجہ ذومعنی تھا متحیر سی وہ خاموش تھی۔ اُم فروا چائے کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھتی پلیٹ میں پیزا کا پیس رکھ کر۔ سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ ملک مصطفیٰ رغبت سے فش کھا رہے تھے۔

''میں دوپہر کو سائٹ پر چلا گیا تھا، اسی چکر میں میرا لنچ بھی رہ گیا۔'' وہ بلاوجہ فضول بے تکی گفتگو کر رہے تھے۔ وہ خاموش تھی۔ ان چار دنوں میں وہ جس فیصلہ پر پہنچ پائی تھی، آج ہر صورت اُسے ملک مصطفیٰ علی کو آگاہ کرنا تھا۔ اُم فروا کے پاس کیسی طلسماتی جادوئی چھڑی تھی کہ جب بھی ملک مصطفیٰ علی اس حسن بانو کے سامنے آتے غیر محسوس انداز میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتے۔ بالکل ایسے ہی جس طرح اصلی اطلس وریشم کی فرل والی قالین کی مخملیں گداز سطح میں تھکے ماندے پیر گم کر کے دلنشین لطف کا احساس روح کے ایوانوں میں رچ بس جاتا

ہے۔کھڑکی سے آتی تازگی بھری خوشبو کی مہک سانسوں سے ٹکراتی، گزرتے لمحوں کی دبیزی میں خاصا اضافہ کررہی تھی۔ سفید مہین نائیلون کے پردوں کی شوخ سرسراہٹ کے ساتھ مغرب کی جانب سفر کرتے سورج کی بنفشی و نارنجی کرنیں چھن چھناتی اس نشست گاہ کو انوکھی دلکشی بخش رہی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے پر، پُرتعیش روشنی منعکس ہو ہو اٹھتی، تب زندگی سے کشید کیے گئے یہ چند سے ان نفوس کو خاصا متبرک بنا گئے تھے۔ وجاہت آمیزی کے ضمیر سے گندھا کسرتی سراپے والا مرد اور حوروں جیسا تقدس رکھتی سحر کار لڑکی...... ساکن ساعتوں کے محور میں اسیر ہو چکے تھے۔

دونوں کے درمیان اچانک گہری خاموشی آ ٹھہری تھی۔ اُم فروا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھی۔ آج وہ ہر صورت ملک مصطفیٰ علی سے بات کرے گی لیکن گلے کی گھٹن سانسوں کو اعتدال پر نہ آنے دے رہی تھی۔ یورش کرتے گلے کی کھچ کھچ پر وہ قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں مضمحل تھیں۔ آواز تھی کہ کہیں اندر ہی سوگئی تھی۔ لبوں پر کچھ کہنے کی آمیزش مچل رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے۔ اس کے ہاتھ زور سے کانپے، اُس نے چائے کا مگ جلدی سے واپس رکھ دیا۔ غیر ارادی طور پر اُم فروا کی نگاہیں ملک مصطفیٰ علی کی جانب اٹھیں، ہونٹوں کے درمیان ہلکی سی مسکان دبائے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اُم فروا کی طرف دیکھا۔ ملک مصطفیٰ علی کی پُرشوق نگاہیں، جن میں اُم فروا کے لیے احترام تھا، اُم فروا کے نازک اندام سراپے کو پگھلا گئیں، جو اس کے بوند بوند لہو میں سرایت کرتی چلی گئیں۔ یہ اُس شخص کی ایسی بھرپور توجہ کا کمال تھا۔ اُم فروا کی روح کیوں اس غیر محرم شخص کے اطراف ہلکورے کھا رہی تھی۔ وہ ایک رئیس زادہ تھا۔ لیکن اُن کے روبرو ایسی نزدیکی میں بیٹھنا اُم فروا کے وجود کے دشت میں آشفتگی کی آمیزش کی مدھر خوشبو بسا جاتا۔ اُم فروا نے اپنے رب کو خلوصِ دل سے مدد کے لیے پکارا۔ مجھے ہمت دے! میرے لیے بہترین فیصلہ فرما۔ اچانک اُس نے ملک مصطفیٰ علی کو مخاطب کیا۔

''ملک صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''فرمایئے!'' اُن کی روشن چمکتی آنکھیں اُم فروا کے شہابی چہرے پر لحہ بھر ٹھہریں۔ اُم فروا کے ہونٹوں کی لرزش بڑھی اُس نے ڈپٹ کر خود کو زچ ہونے سے بچایا۔ اس سے پہلے کہ چائے چھلک کر اس کے ہاتھ پر قہر برسا جاتی اُس نے مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ملک صاحب آپ نے مجھے اختیار دیا ہے ناں میرے فیصلے کو آپ مقدم جانیں گے۔ میں سوچ کر اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دوں۔''

''جی فروا میں نے کہا تھا، فرمایئے؟'' ملک مصطفیٰ علی کے لہجے کی پور پور میں نرمی بھری شیرینی گھل رہی تھی۔

''آپ مجھے میرے پیرنٹس کے پاس بھجوا دیں۔'' سراسیمگی کیفیات سے دوچار وہ سانسیں روکے ملک مصطفیٰ علی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ جانے اُسے کیا جواب ملے۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کے جواب کی منتظر تھی۔

''اُم فروا آپ نے فیصلہ کرلیا۔'' چند ثانیے بعد وہ گویا ہوئے۔

''جی! میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔'' عرق ریز پیشانی پر اُس نے سپید انگلیاں سرسرائیں۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی خوشی۔'' یک لخت ملک مصطفیٰ علی کی شہد آگیں براؤنش آنکھوں میں اُداسی کی لہر پھیلی تھی۔ لیکن ہونٹوں پر بدستور زچ سی مسکان کھلی تھی۔

''ملک صاحب آپ مجھے آج ہی بھیج دیں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے سرعت سے گہری سیاہی سے مزین اُم فروا کی لانبی آنکھوں کی طرف بغور دیکھا۔ شاید وہ ایک پل بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ جاں کنی کی حالت ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی تھی جس قدر جلد ممکن ہو وہ اس قیامت خیز گھڑی سے گزر جائے جو اس کے گھر والوں پر ٹوٹنے والی تھی۔ ایسی ساعتوں کو اب مزید جھیلنا سوہانِ روح تھا۔ اُم فروا کے لیے، ملک مصطفیٰ علی نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا۔ اُمِ فروا کے یہاں سے جانے کے تذکرے نے انہیں ہولا دیا تھا۔ اُم فروا کی قربت کے چند لمحے ملک مصطفیٰ علی کی دسترس میں آ جاتے جہاں اُن کے لیے عجیب سی سرشاری کا عالم تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کے لیے یہ احساس ہی باعث راحت تھا کہ وہ ملک مصطفیٰ علی کے روبرو ہے۔ ایسے ارفع لمحات ہی انہیں مسرور کر دیتے اگر تمام عمر بس اتنی سی نزدیکی ہی انہیں میسر آ جائے تو وہ اسی پر ہمیشہ خوش رہیں گے۔ وہ اس مقدس لڑکی کو روح سے چاہنے لگے تھے۔ روح جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

'کیا اب وہ اُم فروا کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟'

'وہ اس کی دید سے محروم ہو جائیں گے؟' یہ خیال کس قدر سفاک اور کٹیلا تھا جو اُن کی روح میں چھید کر رہا تھا۔

''اُمِ فروا میں ایک دم تو آپ کو مولوی صاحب کے پاس نہیں لے جا سکتا۔ ایک دو دن تک میں خود انشاء اللہ آپ کو وہاں لے کر جاؤں گا۔ اچانک وہاں آپ کو چھوڑ دینے کی وجہ کیا بیان کروں گا۔ ڈائریکٹ تو اُن پر ایسی قیامت نہیں توڑی جا سکتی ناں کہ آپ کی شادی کی بنیاد ہی فریب اور دھوکے پر رکھی گئی تھی۔ بلال حمید جو دکھائی دیا اصل میں وہ نہیں تھا اور پھر انہیں یہ بھی تو یقین دلانا ہے کہ آپ آج بھی ویسی ہی اُجلی ہیں جیسی مولوی ابراہیم کے گھر سے رخصت ہوئی تھیں۔ صبح نور کے اولین شبنمی قطرے اب بھی آپ کی روشن پیشانی پر سجدے کرتے ہیں۔''

یہ سب کہتے ہوئے ملک مصطفیٰ علی اُس سے نظریں کترا رہے تھے۔ اُمِ فروا خاموش تھی، خوفزدگی بدستور اُس کے چہرے پر کھنڈی تھی۔ وسوسے اس کے گرد اپنا حصار تنگ کر رہے تھے۔ 'یہ دو مرد مل کر جانے میری ذات کا کیسا تماشا بنانے والے ہیں۔'

اُمِ فروا نے یک بارگی کانپ کر ملک مصطفیٰ علی کی مقناطیسی کشش کی حامل براؤنش آنکھوں کی طرف دیکھا جہاں آنکھوں سے نیچے سیاہ گھنی تراشیدہ مونچھوں تلے گلابی بھرے بھرے ہونٹ شدید سختی کے عالم میں بھینچے جا رہے تھے۔

'ملک مصطفیٰ علی مجھے آج کیوں نہیں چھوڑ کر آتے۔ آخر انہوں نے کیوں ٹال دیا ہے مجھے؟ کیا یہ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ ان کی نیت میں کھوٹ ہے، وسوسے تھے کہ اس کے اطراف کنڈلی ڈال کر بیٹھے تھے۔ اچانک اُس کا پورا وجود لرز اٹھا۔ اُم فروا ایسا مت سوچو خدا ناراض ہوگا۔ اُس کی رحمت کو کیوں نہیں یاد رکھتیں۔ کفران بھری سوچوں میں خود کو مت الجھاؤ، خدا نے اب تک تمہیں بچا کر رکھا، تمہاری عزت محفوظ ہے، یہ اُس مالک کا کرشمہ ہے۔ ایسے معجزے خدا اس لیے اپنے کمزور بندوں پر عیاں کرتا ہے تا کہ بندہ مکمل اُس کی ذات پر بھروسہ کرنا سیکھے، اُس پر توکل رکھے۔ اُس کی اعلیٰ قدرت کو مانے۔

''اُمِ فروا کیا سوچ رہی ہیں؟ شاید میری بات سے آپ پریشان ہو گئی ہیں۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں، تیار ہو جائیں۔ میں ابھی آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ ہول اٹھی۔ اُسے لگا وہ ابا جی کے سامنے مجرم بنی کھڑی ہے۔ میں اُن سے کیا کہوں گی کہ میں طلاق لے کر آپ کے پاس آ گئی۔ ملک مصطفیٰ علی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ وہ پہلے ابا جی کو طریقے سے تمام حالات بتائیں

گے۔ ممکن ہے تب میں ابا جی اور بے بے جی کا سامنا کرنے کی ہمت کر پاؤں۔

''اُم فروا کیا سوچ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''اپنا ضروری سامان لے لیں اور چلیں۔''

''ملک صاحب پہلے آپ ابا جی سے بات کرلیں۔''

یہی تو میں آپ کو سمجھا رہا تھا۔ پہلے میں مولوی صاحب سے بات کرلوں، انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے تمام حقیقت سے آگاہ کروں گا۔ بس آپ دعا کریں اللہ پاک مجھے اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔''

''آمین۔'' اُم فروا نے دل میں کہا۔

''اس وقت تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ کل میں فیکٹری سے واپسی پر مولوی صاحب سے جا کر ملوں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ ہماری نیک نیتی کو آسمانوں میں براجمان مالک دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ کیسے ہماری مدد نہیں کرے گا؟ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی۔'' انہوں نے مسکرا کر اُم فروا کو دیکھا۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھے۔ اُم فروا اب انہیں قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''میں تازہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' اُم فروا نے اُن سے نگاہیں کترائیں اور کپ اٹھائے کچن کی جانب بڑھ گئی۔ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ توقف بعد دو کشن کہنیوں کے نیچے رکھے اور کچن کی جانب دیکھا جہاں اُم فروا انہیں چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔

سکوت بھری گھمبیر خاموشی طلسماتی سحر کی بازگشت ان کے گرد جالے بُن رہی تھی۔ مہین پردوں سے چھن کر آتی کرنوں کی دانے دار جھلملاہٹ اطراف میں ناچتی منعکس ہوتی رہی لیکن ملک مصطفیٰ علی کی تمام توجہ کچن کی طرف مبذول تھی۔

☆......☆......☆

بلال حمید سانسیں تو لے رہا تھا لیکن ایسی سانسیں اُسے خود پر بوجھ لگ رہی تھیں۔ وہ لحہ لحہ موت کا ذائقہ جیتے جاگتے چکھ رہا تھا۔ پشیمانی تھی کہ جس کی انتہاؤں کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ اُسے خود سے گھن محسوس ہو رہی تھی۔ جس نے پیسے کی خاطر کس قدر غلط کام سرانجام دیے تھے۔

''میں نے ایسا کیوں کیا۔'' وہ بالوں کو مٹھیوں میں مضبوطی سے جکڑ لیتا۔

''کیا ایک بار بھی میرے دل میں خوفِ خدا نہ آیا۔ میں تو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا، جس کی پیدائش کے وقت ہی کان میں اذان دی جاتی ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ پھر مجھے اس مفہوم کی آگہی کیونکر نہ ہوئی۔ اے رب اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنائے گئے تھے تو ہمیں اتنے مقدس بندھن میں کیوں باندھ دیا گیا۔

اچانک اس کا موبائل بجا تو وہ چونک گیا اور خیالوں کی ڈوریاں گم ہوتی چلی گئیں۔ اس نے خشک ہاتھ پسینہ سے تر پیشانی پر پھیرا۔ موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ بلال حمید نے اٹھنا چاہا تو وہ اُٹھ نہ پایا اس کی ٹانگیں شل تھیں۔ جیسے کسی نے تمام طاقت کھینچ لی ہو۔ صوفے کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھے وہ بمشکل اُٹھ پایا اور موبائل تک پہنچا۔ موبائل اسکرین پر کوئی اَن نون نمبر تھا۔ مجھے کون یاد کرسکتا ہے؟'' گلا تر کرتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''ہیلو!''

''بلال صاحب؟'' لہجہ سوالیہ تھا۔ کھنکتی نسوانی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔
''جی بلال بات کر رہا ہوں، فرمائیے۔''
''پہلے مابدولت کا تعارف حاصل نہیں کریں گے؟''
''فون کرنے کی زحمت کی ہے تو یہ زحمت بھی کر لیجیے۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''میں ثمرین بات کر رہی ہوں۔''
''سوری میں کسی ثمرین کو نہیں جانتا۔'' بلال حمید نے سیل آف کر دیا۔ اُس نے سامنے لگے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی رات کا ایک بج رہا تھا۔ نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ وہ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھ کر آیا تھا۔ تب سے اس صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُم فروا کے خیال نے گزرتے وقت کے احساس سے اسے غافل کر دیا تھا۔ بلال حمید کو اُمِ فروا کو طلاق دیے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ یہ دو ہفتے جیسے کسی دار پر لٹکتے ہوئے بیتے تھے۔ کسی پل اسے قرار نہیں آتا تھا، دل بین کرتا تھا۔

اس کی آنکھیں نیند کے لیے ترس گئی تھیں۔ تمام رات اس پر غنودگی کا غلبہ طاری رہتا۔ وہ پُرسکون نیند کئی دنوں سے سو نہ سکا تھا، نزع جیسی کیفیات میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اُم فروا کے نازک مخروطی انگلیوں والے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ اب وہ اپنے خالی ہاتھوں کو بغور دیکھتا تھا۔ اُم فروا کا لمس بلال حمید کے ہاتھوں کو پسینے سے بھگو جاتا اور وہ سسک پڑتا۔ آنکھوں میں کب سے رُکے آنسو پکے پھوڑے کی طرح ٹیسیں پیدا کر جاتے۔ دل پر تیر برسنے لگتے۔ کیا میں تمام عمر بے آب مچھلی کی طرح تڑپتا رہوں گا۔
''ہاں بلال حمید تمہیں تڑپنا ہی ہوگا۔ یہ سزا ابھی بہت کم ہے۔ تمہیں تو ہر ہر لمحہ مرنے جینے کے عمل سے دوچار ہونا ہوگا۔ اب تو تمہاری تمام زندگی رب سے سکون کی بھیک مانگتے ہوئے گزرے گی۔ تمہاری سزا کی تو ابھی شروعات ہیں۔ یہ سزا تو عمر بھر کے لیے تمہارے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔'' تب اُس کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ کتنی دیر تک اندھیرے کمرے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ اُسے کسی پل سکون نہ ملتا۔ تہجد کا وقت آتا تو وہ وضو کر کے مصلے پر کھڑا ہو جاتا۔ جب وہ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتا تو اُسے گہرا سکون مل جاتا۔ اس وقت وہ اپنے خدا کا شکر ادا کرتا۔ رات کو اُسے نیند تو آتی نہیں تھی لہٰذا وہ آفس کا کام گھر پر اٹھا لاتا۔ اس دوران ایک دو بار اس نے اُمِ فروا کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی جب وہ کچن سے کچھ لینے جا رہا ہوتا تو وہ اُسے دکھائی دے جاتی۔

☆......☆......☆

اُم فروا کی رشتوں سے بھری زندگی کس قدر اجاڑ ہو چکی تھی۔ اکثر گھر سے فون آتے رہتے، اُمِ زارا شور مچاتی کہ آپی آپ کے لیے سب بہت اُداس ہیں۔ ایک چکر لگا جائیں۔'' لیکن اُسے مصلحت کی چادر میں ہی رہنا تھا۔ وہ کہتی کہ زارا تمہارے بھیا بہت مصروف ہیں۔ اُن کا شیڈول ان دنوں بہت ٹف ہے۔ آنا مشکل ہے، تم آ جاؤ۔'' ایک دو مرتبہ اُم زارا اور اسماعیل آئے بھی تھے۔ اُس وقت بلال حمید دفتر میں ہوتا تھا، عزت کا بھرم رہ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس چلے جاتے تھے۔
''آپی بھائی بھی آج کل بہت مصروف ہیں۔ ان کا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ خطاطی کے زیادہ سے زیادہ آرڈرز آ رہے ہیں۔ انہیں کافی بڑی رقم ایڈوانس ملی ہے۔ وہ پیسے اباجی کے مشورے سے انہوں نے بینک میں جمع کرا دیے ہیں۔''

اسماعیل بخش نے ماسٹرز مکمل کرلیا تھا۔ یہ ہنر محض شوق کی بنا پر اُس نے شروع کیا تھا۔ اُس کی آرٹسٹک انگلیوں میں اتنی مہارت تھی کہ اکثر وہ خود دنگ رہ جاتا۔

''بھائی نے اباجی سے مشورہ لیا ہے کہ کوئی دوکان کمرشل ایریا میں کرائے پر لے کر اس کام کو مزید آگے بڑھائیں۔ موچی گیٹ والے گھر کو کرائے سے اٹھالیا ہے۔ اسے بھائی ٹھیک کرا رہے ہیں۔ ہم سب وہیں شفٹ ہوجائیں گے کیونکہ وہاں بھائی کی دکان نزدیک ہے۔ اباجی کہہ رہے ہیں فی الحال اس گھر کو رینٹ پر دے دیں گے اور جو ہماری دوکان کرائے پر تھی، تین ماہ تک بھائی اُس میں اپنا کام شفٹ کردیں گے۔''

''اُمِ زارا آج تو تم مجھے بہت اچھی اچھی خبریں سنا رہی ہو۔ میرا دل خوش کردیا تم نے۔ شہر میں آجاؤ تو اچھی بات ہے ناں۔ موچی گیٹ والا ہمارا گھر بہت بڑا ہے اور اچھا بھی بنا ہوا ہے۔ گلیاں بھی اب تو کھلی ہوکر پکی ہوگئی ہیں۔''

''ہاں آپی میں اُسے اپنی مرضی سے سیٹ کروں گی۔ بھائی نے کہا ہے کہ ہم وہاں پر سارا نیا فرنیچر لیں گے۔ آپی بہت مزہ آئے گا۔ اب اباجی بھی بھائی پر زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے۔ بے بے جی انہیں سمجھاتی رہتی ہیں۔ دیکھا آپی سیانے ہوگئے ہیں ناں ہمارے اباجی۔'' اُمِ زارا اپنی بات کے اختتام پر زور سے ہنسی تھی۔

بہت عرصہ بعد آج اُمِ فروا کے ہونٹ مسکائے تھے۔

''بھائی کی خطاطی کی تمام حروف تہجی میں ایگزیبیشن بھی عنقریب ہوگی، پھر تو انہیں خوب شہرت ملے گی۔''

''اُمِ زارا تم دعا کرتی ہو بھائی کے لیے؟''

''آپی میری دعائیں تو ہوتی ہی آپ سب کے لیے ہیں۔''

''اُمِ زارا میرے لیے خاص طور پر دعا کیا کرو۔'' یہ کہتے کہتے اُس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ آبدیدہ ہو رہی تھی۔

''اچھا بہت دیر ہوگئی ہے میں فون رکھتی ہوں۔ سنو سب کو میرا بہت بہت سلام دینا اور دیکھو اسماعیل کے ساتھ ایک چکر لگا جاؤ۔''

''میں بھائی سے آپ کا کہوں گی، پھر تو مجھے ضرور لے آئیں گے۔''

''آنے سے پہلے فون ضرور کرنا۔''

''ہاں ضرور کروں گی۔''

آج وہ پورا دن خوش رہی تھی۔ اس کا بھائی اب اچھا کمانے لگا تھا۔ ''اللہ پاک ہمیشہ رزقِ حلال عطا کرنا اور میرے بھائی کو پل پل اپنے حفظ وامان میں رکھنا۔ اباجی سے کہوں گی، اب اچھی سی لڑکی دیکھ کر اسماعیل کی شادی کردیں۔ لیکن میں کب ملوں گی اُن سے؟ اتنا سب کچھ جاننے کے بعد کیا وہ مجھ سے بات کریں گے؟ مالک تُو نے ہی اس آزمائش سے مجھے نکالنا ہے۔''

☆......☆......☆

اس رات بلال حمید اپنے سامنے پیپرز پھیلائے بیٹھا تھا۔ شام دفتر سے آتے ہوئے وہ چند فائلیں ساتھ لیتا آیا تھا۔ صرف وقت گزارنے کے لیے چند روز سے وہ ایسا کر رہا تھا۔ چائے پینے کو اُس کا دل چاہا تو ہال کی طرف کھلنے والے دروازے سے وہ کچن میں آگیا اور اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ آہٹ پا کر اُمِ فروا نے اپنے کمرے سے کچن کی طرف جھانکا تو اُسے بلال حمید نظر آیا۔ اُمِ فروا نے پیچھے ہٹنا چاہا تو بلال حمید نے اُسے پکارا۔

''اپنے لیے چائے بنا رہا ہوں آپ پئیں گی چائے۔''

''شکریہ۔'' وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی، شاید اُسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ جبھی اُس کے کمرے سے سی ڈی پلیئر پر تلاوتِ کلام پاک کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت بے سکونی کی کیفیت میں وہ تلاوت سُن رہی تھی۔

بلال حمید چائے کا کپ لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ گرم گرم چائے نے اُس کے تھکے جسم کو خاصی حرارت اور چستی سونپ دی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اچانک اُس کا موبائل بجا۔ بلال حمید نے ٹائم دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ ''اس وقت کون ہو سکتا ہے۔'' اُس نے کاہلی سے سیل فون اٹھایا۔

وہی اَن نون نمبر تھا۔ ان محترمہ کو بھی نیند نہیں آ رہی ہو گی۔ بلال حمید نے گہرا سانس لیتے ہوئے نمبر ڈس کنکٹ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بیل بجی۔

''ارے بھئی کیا ہے۔ تم رات کو سوتی کیوں نہیں ہو؟ یا چمگادڑوں کی طرح رات بھر جاگنے کی عادت ہے۔'' وہ بغیر فل اسٹاپ، کومہ بولتا چلا گیا، دوسری طرف سے پھر آج کھنکتی ہنسی کی جل ترنگ چہار سو بکھری۔

''اپنی ہنسی سنانے کے لیے اس وقت تم نے مجھے فون کیا ہے۔''

''آپ کا نان اسٹاپ لیکچر سننے کے لیے۔''

''لگتا ہے تم نے رات بھر کا پیکیج کرایا ہوا ہے اور کتنوں کی نیند خراب کرتی ہو؟''

''صرف آپ کے لیے پیکیج کرایا ہے اور صرف آپ کی نیندیں ہی حرام کرنے کی کوشش ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ تمام رات بلا توقف آپ سے گفت و شنید جاری رکھ سکتی ہوں۔'' خوبصورت آواز نے بلال حمید کے سر سے فائلوں کا بوجھ قدرے کم کر دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا مارکر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُس نے ہاتھ پیچھے کرتے ایک لمبی انگڑائی لی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں اُس نے کارپٹ پر پھیلا دی تھیں۔ اس وقت بلال حمید کے اعضا کافی تھک چکے تھے۔ اس لڑکی کی آواز تازہ جھونکے کی طرح اسے غنیمت لگی۔

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''آپ بھول رہے ہیں بلال صاحب! میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہے۔''

''بتایا ہو گا لیکن مجھے یاد نہیں ہے۔ دوبارہ زحمت کریں گی۔''

''بالکل زحمت کروں گی۔ مجھے ثمرین کہتے ہیں۔''

''اچھا فرمایئے ثمرین صاحبہ!''

''آپ کی یادداشت لگتا ہے بہت کمزور ہے۔ آپ اجنبیوں کی طرح بات کر رہے ہیں؟''

''تو ہم اجنبی ہی تو ہیں۔'' بلال حمید نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

''ایک مرتبہ پہلے بھی میری آپ سے بات ہوئی تھی۔''

''اچھا ہوئی ہو گی۔'' لہجے میں لاپروائی چیخ رہی تھی۔

''کہہ تو رہی ہوں آپ کا حافظہ بہت کمزور ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے کیونکہ عمر کا تقاضا ہے ناں۔'' وہ مسکرایا۔

''کیا عمر ہے آپ کی؟''

''ساٹھ سے اوپر ہوں۔'' وہ کھی کھی کر کے ہنسی۔

''آواز سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

''کیسا لگتا ہے آواز سے؟'' بلال حمید کا ٹائم اچھا پاس ہونے لگا تھا اس لیے اُس نے بات جاری رکھی تھی۔

''یہی پچیس چھبیس سال کے ہوں گے۔''

''چلو تم جو قیاس کرلو وہی ٹھیک ہے۔''

''مسٹر بلال ہم اتنے بھی ابھی بے تکلف نہیں ہوئے کہ آپ مجھے تم کہہ کر مخاطب کریں۔ اب تم کا عنوان نہ بنا دیجیے گا۔'' وہ خاصی تیز طرار لڑکی تھی۔

''یقیناً میں تم سے بڑا ہوں اس لیے تم کہہ دیا۔''

''آپ کو کیسے معلوم آپ مجھ سے بڑے ہیں؟''

''کیونکہ بی بی تمہاری آواز لڑکیوں جیسی ہے۔''

''لڑکی ہوں تو آواز لڑکیوں جیسی ہی ہوگی۔'' اُس کی پھر خوبصورت ہنسی کی آواز بلال حمید کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ مردوں کو شیشے میں اُتارنے کا گر بخوبی جانتی تھی۔ مرد ہوتا ہی احمق ہے، جو اتنی جلدی شیشے میں اُتر جاتا ہے۔

''یہ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟'' وہ دوسرے ہاتھ سے پیپرز فائل میں لگانے لگا تھا۔

''جانتی کیا میں نے تو آپ کو دیکھا ہوبھی اہے، اس لیے تو میں آپ پر فدا ہوگئی ہوں۔ کیا ڈیشنگ پرسنالٹی ہے آپ کی۔''

''تم فیکٹری میں کام کرتی ہو؟''

''کون سی فیکٹری بابا۔'' وہ جان بوجھ کر حیرانگی سے بولی۔

''جہاں تم نے مجھے دیکھا ہے۔'' بلال حمید نے اب تمام پیپرز فائل میں لگالیے تھے اور وہ دوبارہ صوفے کی بیک سے ٹک گیا تھا۔

''بھئی میں نے تو آپ کو ایک لمبی سی زیرو میٹر گاڑی میں دیکھا تھا کسی خوبرو جوان کے ساتھ۔''

''تو پھر اُس خوبرو جوان کے بارے میں کیا سوچا؟'' بلال حمید نے لفظ چبا چبا کر بات مکمل کی۔

''وہ مجھے لفٹ نہیں کرائے گا۔'' شاید وہ اپنی بات پر پھر ہنسی تھی۔

''کیوں؟ تم اتنی بدصورت ہو؟'' آج کئی دنوں بعد بلال دل سے ہنس رہا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا خود کو خوش رکھنے کے لیے یہ بھی اچھا مشغلہ ہے۔ کیا بات ہے موبائل فون کی۔ اے موبائل بنانے والے زندہ باد۔ وہ دل میں ہنسا۔

''ہاں میرے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ سارا چہرہ بھرا ہوا ہے۔'' وہ پھر ہنسی، اُس کی ہنسی سے صاف لگ رہا تھا وہ مذاق کر رہی ہے۔

''تو تم کیا سمجھتی ہو ایک چیچک زدہ چہرے والی لڑکی سے میں دوستی کرلوں گا۔''

''میں نے سُنا ہے آپ بہت سخی داتا ہیں، سوچا شاید...... '' اُس نے بات ادھوری چھوڑی۔

''ٹھیک سُنا ہے لیکن اب مزید کی گنجائش نہیں ہے۔''

''پلیز میرا دل نہ توڑیں۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔ ''سنو......''

''ثمرین...... ثمرین۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ہاں ثمرین...... کل رات تم اپنا یہ پیکیج کسی اور پر خرچ کرنا۔ اُمید ہے تمہاری مراد بر آئے۔''

''کسی اور سے کیوں آپ ہی سے کیوں نہیں۔''

''میری دو بیویاں پہلے بھی ہیں۔ وہ تمہیں کچا چبا جائیں گی۔''

''کوئی بات نہیں، میں بھی آگے سے شیرنی ہوں۔ ایک ہی دھاڑ سے دبک جائیں گی۔''

''اور پھر تمہیں روٹی بھی پکا کر کھلائیں گی؟''

''ہاں کیوں نہیں جہاں وہ دو روٹیاں بنائیں گی تیسری بھی بنالیں گی۔ چھوڑو یہ سب باتیں، تم مجھے یہ بتاؤ مجھے کب مل رہے ہو؟''

''اب تم بھی تم پر آ گئیں ناں۔''

''ظاہر ہے، ہمیں اتنا تو فرینک ہو ہی جانا چاہیے۔ ہاں بولو کب ہم مل رہے ہیں۔''

''میں اپنی دونوں بیویوں سے پوچھ کر تمہیں بتاؤں گا۔''

''اگر وہ بھی تمہارے ساتھ آ گئیں تو؟''

''پھر اور مزہ آئے گا۔ میں یہ دیکھ کر انجوائے کروں گا کہ تین تلواریں کیسے ایک میان میں رہ سکتی ہیں۔''

''مسٹر بلال حمید اس طرح تو پرابلم ہو جائے گی؟''

''تو تم میرا پورا نام جانتی ہو؟''

''آف کورس، تمہارا آدھا نام جان کر کیا کرنا تھا مجھے۔''

''تم بھی کمال ہو۔''

''بم بولیں بم ہوں میں۔''

''پھر تو تم بہت خطرناک ہو؟''

''سب سے پہلے تمہاری دونوں بیویوں پر پھوڑوں گی۔''

اُس کی باتوں سے وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ آج بہت عرصہ بعد نسوانی آواز اُس نے اتنی دیر تک سنی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک جو جسم میں درد اور اکڑاؤ محسوس ہو رہا تھا وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ میٹھی عورت طمانیت بخش مرہم کی مانند ہوتی ہے۔ عورت کی تھوڑی سی توجہ بیمار ذہن مرد کے دل کے زخم پر اپنی شیریں گفتاری سے تریاق کا کام کرتی ہے۔ غیر ارادی طور پر اب بلال حمید کو نیند آنے لگی تھی۔ چلو آج رات تو سکون سے سوؤں گا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے کاکی جا کر سو جاؤ۔''

''اب نیند کس کو آئے گی؟'' اس کے لہجے میں بے قراری عود آئی۔

''بی بی مجھے نیند آ رہی ہے۔'' بلال حمید کی پیشانی پر تیوریوں کا جال بُن گیا۔ آنکھوں کا کساؤ بڑھا، لہجے میں تلخی بڑھی۔ بلال حمید کے یوں تپ جانے پر، وہ لمحہ بھر کے لیے سٹ پٹائی تھی۔ بلال حمید کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کس طرح اس باتونی لڑکی سے جان بخشی کرائے۔ وہ گلا کھنکار کر ہنسی۔ اس کی کھنکتی ہنسی بلال حمید کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس دلنشیں ہنسی پر واقعی اُس کی نیند غائب ہونے لگی تھی۔

''دیکھیں مسٹر! فی الحال سونے کا ہرگز ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً ہی سہی بات تو آپ کو مجھ سے کرنی ہی ہوگی۔ جب تک مجھے نیند نہیں آتی، آپ کو مجھ سے باتیں کرنی ہوں گی۔'' وہ کھل کھلا کر مسکرائی تھی۔ بلال حمید کا دل تو چاہا کہہ دے بھاڑ میں جاؤ تم۔ میں فون بند کر رہا ہوں لیکن نہ وہ فون بند کر سکا نہ ہی کچھ ایسا کہہ سکا۔ اب وہ

نپے تلے لفظوں میں گویا تھا۔

''ایویں ہی تم جیسی فضول لڑکی کے لیے میں اپنی نیند خراب کروں۔''

''آپ مجھے فضول کہہ رہے ہیں۔'' وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی۔

''اور کیا کہوں۔ اے لڑکی تہجد کا ٹائم ہونے والا ہے۔ اس وقت لوگ تہجد پڑھتے ہیں۔ تم کن فضولیات میں پڑی ہوئی ہو۔''

''تو آپ اب تہجد پڑھیں گے۔'' اُس نے پھر سے مذاق اڑایا۔

''تم جیسی عورت ہی نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔''

''مان جائیں پھر آدم زادی کی کارستانیاں۔''

''ہاں مانتا ہوں اللہ پاک عورت کے شر سے بچائے۔''

''واہ جی کیا کہنے آپ جیسے صالح بندوں کے۔'' اس بار بلال حمید مسکرایا۔

''اب میں فون بند کرنے لگا ہوں۔ مجھے زوروں کی نیند آرہی ہے۔''

''دیکھا میری باتوں نے نیند کی گولی جیسا کام دیا۔'' واقعی اب بلال حمید کو سو جانا چاہیے تھا۔ صبح اُسے فجر کی نماز کے لیے جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ بلال نے فون بند کر دیا تھا۔

فجر کی نماز پڑھ کر وہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھتا۔ صبح کی سپیدی پھوٹنے لگتی تو وہ واپس آتا۔ تیار ہو کر ناشتا کرتا اور اپنی بائیک پر آفس چلا جاتا۔ ملک مصطفیٰ علی نے کئی بار بلال سے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ گاڑی میں آفس جایا کرو لیکن اُس نے منع کر دیا تھا۔

''ملک صاحب مجھے آٹھ بجے آفس پہنچنا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کی آپ کو تکلیف دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' آج بھی بائیک چلاتے ہوئے اُس کی دیمک سے کھوکھلی پڑتی سوچیں اُم فروا کے گرد سسکیاں بھر رہی تھیں۔

''اس وقت تو وہ سو رہی ہوگی؟ رات کو اُسے صحیح نیند کیسے آتی ہوگی۔ اتنا کچھ اُس کے ساتھ ہو گیا۔ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد شاید وہ سو جاتی ہو۔'' اچانک سے بلال حمید کی نگاہوں میں وہ ارفع و اعلیٰ لمحات سرکے تھے۔ جب اُم فروا نماز پڑھ کر قرآن پاک پڑھتی پھر وہ لاؤنج میں آ کر تمام پردے دونوں اطراف سمیٹ دیتی۔ اس وقت ایک نئی صبح خوشبودار کا منظر کس قدر دبیز ہوتا۔

اُم فروا تھوڑی دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی پرندوں کی بولیاں سنتی۔ اُن کی چہچہاہٹ پر زیر لب مسکراتی۔ تب آہستہ روی سے چلتی کچن میں آجاتی۔ اتنی دیر میں بلال حمید بھی نماز پڑھ کر مسجد سے آجاتا۔ وہ ہال میں آ کر بیٹھ جاتا۔ اُم فروا ٹرے میں دو کپ چائے رکھے بلال حمید کے نزدیک آجاتی۔ تب وہ کچھ عرصہ بلال حمید کے ساتھ فیصل ٹاؤن والے فلیٹ میں رہی تھی۔ یہ وہیں کی تو یادیں تھیں جو اکثر و بیشتر اس کے خیالوں میں امرت آمیزی لیے میٹھا زہر چھڑکتی رہتی تھیں۔

چائے کے دوران دونوں ڈھیر ساری باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بلال حمید کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جاتی۔ اُس کی باتیں سنتی کچھ اپنی کہتی۔ پھر چائے کے برتن اُٹھا کر کچن میں چلی جاتی۔ آٹھ بجے وہ ناشتا بناتی تھی۔ بلال حمید کو اس کے ہاتھ کے پراٹھے بہت پسند تھے۔ وہ رغبت سے ناشتا کرتے کہتا۔

''فروتم جیسے پراٹھے دُنیا کی کوئی لڑکی بھی نہیں بناسکتی۔'' وہ ہنستی، اس کے موتیوں جیسے دانت اس کی دلکشی

میں اور اضافہ کر جاتے۔ وہ کہتی۔

''اتنا بڑا جھوٹ بھی نہ بولیں کہ مجھے شرمندگی ہونے لگے۔''

''ایک تو تم میری بات کا یقین نہیں کرتی ہو۔'' وہ بھی مسکرایا تھا۔

اچانک سے اُس کا بائیک کا ٹائر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ، فٹ پاتھ کے ساتھ رگڑ کھا کر ٹکرایا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیچھے سے کوئی تیز رفتار گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ وہ اُم فروا کے خیال میں اس قدر منہمک تھا کہ اُسے پتا ہی نہ چل سکا جب بائیک رُکی تو اُسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اچانک سے اُس کی محویت ٹوٹی، سائیکل پر ٹرن لیتے ایک بزرگ نے مسکرا کر بلال حمید کو دیکھا اور مسکرایا۔

''برخوردار دھیان سے چلایا کرو، زندگی بہت قیمتی ہے۔''

''شکریہ سر!'' اس بار بلال حمید خجل ہو کر مسکرایا اور بائیک سیدھی کرتا آگے بڑھ گیا۔

اُم فروا کے ساتھ بِتایا ہر ہر پل اُسے شدتوں سے یاد آتا۔ اُسے اُداس کر دیتا۔ وہ بار بار ذہن سے اُن یادوں کے لمس کھرچتا لیکن وہ کسی صورت اُس کے دماغ سے نکل نہ پاتیں۔ بے بسی اُس کے اطراف اُگ آتی۔ اُس کے دماغ کی نسیں تن جاتیں اور بلڈ پریشر کی گولیاں پھانکنے سے بھی افاقہ نہ ہوتا۔ پھر آخری حربہ یہی تھا وہ ثمرین کے فون کا منتظر رہتا۔ جو واقعی بلال حمید کو اذیت ناک گھڑیوں سے نکال لیتی۔ وہ کروٹیں بدلتے ہوئے سونے کی کوشش کرتا تو ثمرین کا فون آ جاتا۔ ہر وقت ہنستی اُس لڑکی کی چٹکلے نما اُوٹ پٹانگ باتوں سے بلال حمید بہل جاتا اور اُس کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔

جب بلال حمید خدا حافظ کہہ کر فون بند کرتا تو وہ خود ہی مسکرا پڑتا۔ وہ سوچتا اللہ نے ہی اسے وسیلہ بنا کر بھجوادیا ہے۔ میں ڈسٹرب ہوں، فروا کی جدائی کسی طور سکون نہیں لینے دے رہی۔ ثمرین سے بات کر کے طبیعت بہتر ہو جاتی ہے۔ اُس کی باتیں کچھ دیر کے لیے اُم فروا کے خیالوں سے دور لے جاتی ہیں، اُن عذاب لمحوں سے فرار پالیتا ہوں۔ پھر مجھے اچھی نیند آ جاتی ہے اور میں سو جاتا ہوں۔

اُس رات بارہ بجے کے بعد ثمرین کا فون آیا تھا تو بلال حمید اُس سے کہہ رہا تھا۔

''تم ہر رات مجھے فون کرتی ہو۔ جس روز میری بیویوں کو بھنک پڑ گئی کہ ہمارا شریف قسم کا شوہر کسی غیر عورت سے باتیں کرتا ہے تو وہ دونوں مجھے گولی مار دیں گی۔''

''ٹھیک ہے اپنا ایڈریس ابھی سے مجھے لکھوا دیں۔ ہماری اتنے دنوں کی شناسائی ہے۔ مجھے آپ کے سوئم پر تو لازماً آنا چاہیے۔ کم از کم کھانے کو چنے تو ملیں گے ناں؟''

''ہاں ملیں گے، محلے والوں کو بھی ساتھ لے آنا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں کل ہی سب کو کہہ دوں گی۔'' وہ بمشکل ہنسی روک پائی تھی۔ ''سب آپ کے ایصال ثواب کے لیے ایک ایک سپارہ بھی پڑھ دیں گے۔'' ٹھہر ٹھہر کر طمانیت سے بول رہی تھی، جیسے واقعی یہ سب ہونے والا ہے۔

''پیشگی شکریہ۔'' وہ جل کر بولا۔

''ارے شکریہ کو چھوڑیں کچھ دن آپ کے ساتھ گپ شپ رہی ہے۔ اس کے بدلے آپ کے بلند درجات و مغفرت کے لیے اپنا حصہ بھی ڈال دوں گی۔''

''ویسے تم میری بہت ہمدرد ہو۔''
''ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔''
''کیا تم میری باتیں مذاق سمجھ رہی ہو؟''
''اور کیا۔''
''لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میرے پانچ بچے ہیں، چھٹے کی آمد آمد ہے۔''
''یعنی دونوں بیویوں سے تین تین بچے۔'' اب وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔
''دونوں میں برابر عدل رکھتا ہوں۔ میں نے ابھی دو شادیاں اور کرنی ہیں۔''
''صرف دو یا دو سے زیادہ؟'' وہ کھی کھی کر کے ہنس رہی تھی۔ ہونٹوں کو بار بار ایک دوسرے میں دابتے ہنسی روکنے کی کوشش بھی کرتی۔ لیکن ایک فلک شگاف قہقہہ اُس کے ہونٹوں سے برآمد ہوتا۔ وہ ہنستی بہت تھی، بات بات پر قہقہے لگاتی، ہنستے ہنستے وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اُس کی شربتی آنکھیں پانی سے بھر جاتیں۔
بلال حمید اس کی باتیں سُن کر فریش ہو جاتا۔ دونوں کے پاس وقت گزاری کا اچھا ذریعہ تھا۔
''صرف دو اور کروں گا۔''
''ٹھیک ہے اب آپ فٹافٹ تیسری شادی کر لیں کیونکہ چوتھی اور آخری شادی آپ کو مجھ سے کرنی ہوگی۔''
''تم سے میں شادی نہیں کر سکتا۔''
''کیوں بھئی۔'' وہ چیخی۔
''تم بہت لڑاکا ہو۔''
''پرامس تم سے نہیں لڑوں گی۔'' وہ تم پر اُتر آئی تھی۔
''اچھا سوچوں گا۔ پہلے تیسری تو کر لینے دو۔''
''تو پھر جلدی کرو ناں۔''
''تمہیں کافی انتظار کرنا پڑے گا۔''
''کر لوں گی۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔
''ہاں سنو! تمہاری بیویوں اور بچوں کی کبھی آواز نہیں آئی۔''
''وہ دونوں الگ الگ کمروں میں ہوتی ہیں۔''
''کیوں؟''
''کسی ایک کے بیڈروم میں سوؤں گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔''
''واہ تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔''
''یار کہاں کمال کا آدمی ہوں۔ وہ دونوں ہر وقت مجھ پر شک کرتی ہیں کہ میرا کسی تیسری عورت سے چکر ہے۔''
''تو تم انہیں بتا دو، بات کلیئر کرو کہ تیسری سے نہیں چوتھی سے چکر ہے۔ تیسری نے تو ابھی درمیان میں آنا ہے۔''
''تم مجھے اچھے مشورے دے رہی ہو۔ اُن دونوں نے پہلے ہی میرا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔ تیسری چوتھی کا بتا دوں تو تمہیں صرف میرے چیتھڑے ہی ملیں گے۔'' بلال حمید کے کہنے پر وہ پھر ہنسی۔
''سنو ثمرین تمہاری ہنسی بہت خوبصورت ہے۔ یقیناً تم خود بھی اپسرا ہوگی۔'' بلال حمید بھی وقتی دل لگی کرنے

سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''بلال تمہاری ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ بندی اتنی بھی خوبصورت نہیں ہے۔ بس ایویں ہی ہے۔''

''اچھا اب مجھے سونے دو صبح آفس بھی جانا ہے۔''

''بائے دا وے تم کرتے کیا ہو۔''

''جاب کرتا ہوں۔''

''وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ آفس جاتے ہو تو جاب کے لیے ہی جاتے ہو۔ پر کہاں جاب کرتے ہو؟''

''لاہور ہی میں۔''

''کس ادارے میں؟'' وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

''تم نے پہلے ہی انٹرویو شروع کر دیا۔''

''یہی سمجھ لو۔''

''اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''بلال پلیز پلیز میری بات سنو۔''

''بولو۔''

''ابھی فون بند مت کرنا۔''

''کیوں بھئی؟'' وہ بیزاری سے بولا۔ واقعی بلال حمید کو سخت نیند آ رہی تھی۔

''کیونکہ مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔'' وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

''ثمرین تم اب کسی اور کا نمبر ٹرائی کرو۔'' وہ جھنجلاہٹ پر قابو پا کر گویا ہوا۔

''تو تم دل جلانے والی باتیں بھی کر لیتے ہو۔'' وہ آواز میں شکوہ سموئے بولی وہ اچانک سنجیدہ ہو چکی تھی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی بلال حمید کی باتوں کا برا نہیں مناتی تھی۔

''اچھا میں فون بند کرنے لگا ہوں۔'' واقعی اُسے افسوس ہوا تھا ثمرین کو اس طرح کہنا۔

''کہیں میری دوسری بیوی اچانک کمرے میں نہ آ جائے۔ دراصل ایک ہفتہ سے ہماری ناراضگی چل رہی ہے۔ ہم دونوں ہفتے سے زیادہ ناراض رہ نہیں سکتے۔ وہ آج کل مجھے منانے کے چکر میں ہے، میٹھی میٹھی محبت پاش نظروں سے مجھے آتے جاتے گھورتی رہتی ہے۔ کبھی پاس سے گزرتے ہوئے ٹھوکا بھی مار جاتی ہے۔'' ثمرین مسکرائی۔

''بلال پھر تم کیا کرتے ہو؟''

''میں جھینپ کر خجل ہو جاتا ہوں۔''

''جب صلح ہو جائے گی تو وہ تمہارے روم میں آ جائے گی؟'' ''نہیں۔''

''واہ پھر تو مزے ہیں یعنی مابدولت یونہی رات گئے تم سے باتیں کرتے رہیں گے۔'' بلال حمید مسکرایا اور فون بند کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اگر وہ ثمرین سے گپ شپ نہ لگاتا تو تمام رات اُم فروا کے خیالوں سے بچ نہ پاتا۔ ثمرین کی کھنکتی آواز میں مکمل زندگی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہتی تھی۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے
اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ مئی میں ملاحظہ کیجیے)

شروع شروع میں تو آیا ایسی گھبرائی کہ کام چھوڑ کر بھاگنے کو تیار ہوگئی تھی مگر پھر وہ رکی! اور تب اس نے سوچا۔ ساٹھ روپے مہینے۔ بس اس کے گھر کا راشن آجائے گا۔ بچے پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔ اگر وہ اس کتے کی نوکری چھوڑ دے گی تو پھر......

سفید کفن پر آنسوؤں کے پھول سجاتی ایک یادگار کتھا

بانو نے بڑے درد کرب کے ساتھ ایک بار پھر اپنا آنچل اٹھا کر گود میں اپنی مُردہ بچی کو دیکھا اور

بلبلا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

''ہائے! سہجادی بٹی اب اپنا کٹورا لے کے بھات کون مانگے گا۔؟'' گھٹنوں سے بانو کی گود میں اس کی ڈھائی برس کی بیٹی شہزادی مُردہ پڑی تھی اور بانو کی برص والی چتکبری ساس اس وقت بھی جلی بھنی ہوئی سی قریب ہی بیٹھی تھوڑی تھوڑی دیر پُرسا دینے والی کسی عورت کے آگے اپنے دل کا پھپھولا پھوڑے چلی جارہی تھی۔

''ارے! اب ای اللہ کا ماریے ہے نہ کی رات بھر سے میت گھر میں پڑی ہے اور! گور کپھن کا کوئی ٹھکانا۔''

ہر بار بانو یہ سن کر تلملا جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ دیوار سے اپنا سر اتنی زور سے ٹکرائے کہ پھر وہ اپنی منحوس زندگی کی دوبارہ سانس نہ لے سکے۔

شہزادی جب زندہ تھی تب بھی اس کو کبھی چین سے کھانا نہ ملتا تھا اور اب جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تو اس کے لیے گز بھر کفن کے پیسے بھی نہیں مل رہے تھے۔

بانو کی تقدیر کسی رات کی تاریکی میں بنی تھی جو کبھی اس کو سکھ کی سانس نصیب نہ ہوئی۔ شادی سے پہلے ساری لڑکیوں کی طرح اس نے بھی اپنی معصوم آنکھوں میں کچھ سپنے سجائے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اتنے سارے بھائی بہنوں کے ساتھ دھیارے ماں باپ کے گھر میں آرام کہاں سے ملے گا۔ پھر بھی وہ بڑے پیار و محبت اور سکون سے اپنی بھوکوں اور سارے دکھوں کو بانٹ لیا کرتے تھے۔

جس دن کھانا گھر میں نہیں پکتا' ماں کی چڑ چڑاہٹیں بڑھ جاتی تھیں مگر اس کے غمزدہ چہرے پر پیار و محبت کی دنیا بسی نظر آتی تھی۔ چولہا بجھا رہتا مگر وہ بڑے لاڈ و پیار سے اپنے بچوں کو نہلاتی' مٹی رگڑ رگڑ کر ان کے بالوں کو دھوتی' کنگھی کرتی' پھر تازہ پیوند کپڑے اس شوق سے پہناتی جیسے آج گھر میں کوئی تقریب ہو رہی ہو۔ بڑی ہو کر اس نے سمجھا تھا کہ ماں اس طرح سے اپنے دکھوں کو بھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر کبھی مکئی اور کبھی چنے کے بھنے ہوئے تھوڑے تھوڑے دانے پا کر وہ اپنے سارے بھائی بہنوں کے ساتھ کیسی نہال نہال ہو جاتی تھی؟

لال رنگ کی نئی کوردار ساڑی پہن کر جب وہ اپنے نئے گھر کی طرف نئی زندگی سنوارنے چلی تو پرانی زندگی کے دہلیز سے باہر قدم دھرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اُس کے پاؤں تھرتھرا اُٹھے تھے۔

کیا پتا کہ اس ٹوٹے ہوئے چوکھٹ سے نکل کر جب وہ دوسرے گھر میں جائے گی تو وہ زندگی کیسی ہوگی؟ راستے میں نیچی نگاہوں کے ہوتے ہوئے بھی جب اس نے اپنے جیون ساتھی کو دیکھا تو اس کا جی دھک سے رہ گیا۔ یہ اُس کا شوہر تھا؟ جو نخریلی عورتوں کی طرح لچک لچک کر اور ہاتھوں کو چمکا چمکا کر باتیں کر رہا تھا؟ اُس کے سارے انداز عورتوں جیسے تھے کہیں سے بھی مردانے پن کی کوئی جھلک اس میں نہ تھی ایک بڑی غمزدہ سی لمبی سانس لے کر بانو نے دل ہی دل میں کہا۔ ''ماں! ایسے نچنیاں جیسے مرد سے بیاہنے سے کہیں بہتر تھا کہ تم مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دیتیں۔ ہائے! اس کے خوابوں کی کیسی گھناؤنی تعبیر اس کے سامنے تھی۔''

بانو جس گھر میں بیاہ کر آئی وہ ایک جج صاحب کے سرونٹ کوارٹر کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کے سامنے بہت ہی چھوٹا سا ایک برآمدہ تھا اسی برآمدے میں ایک طرف چولہا تھا اور جب سے بانو بیاہ کر آئی تو چتکبری ساس اپنی چٹائی بھی اسی جگہ بچھا کر سونے لگی تھی۔ بڑھیا کو ٹھمک ٹھمک چال چلنے والے بیٹے کے بیاہنے کا بڑا ارمان تو تھا مگر برآمدے میں چٹائی پر پڑی پڑی بڑھیا کوٹھری کے بند دروازے کو دیکھتے ہی ہزاروں صلواتیں سناتی رہتی۔ اس کی

زبان گز بھر لمبی تھی۔ احاطے میں سرونٹ کوارٹر کے سارے ملازم چڑیل جیسی بڑھیا کی گندی زبان سے عاجز آچکے تھے۔ احاطے کی عورتوں نے بانو کی صورت کو بہت سراہا تھا۔ کھلتا ہوا صاف سنہرا رنگ، تیکھا نقشہ، کٹورا سی آنکھیں اور بڑا اچھا نکلتا ہوا قد، پھر اس پر سے چھریرا بدن۔ پہلی بار جب عورتوں نے بہو کا منہ دیکھا تو سب ہی نے بڑھیا سے کہا تھا۔ بوا جی! بہو تو خوب لائی ہو جیسے اتنی بڑی کوٹھری میں رانی کا روپ آگیا ہو۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ بانو کے شرمیلے لبوں پر بھی آئی تھی اس کو یاد آگیا کہ ماں کو جب بھی اس پر پیار آتا تھا تو وہ اسے رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

مگر اب تو یہ چٹکبری بڑھیا اس کے جنم اور کرم پر تھوک رہی تھی اور وہ گھبرائی گھبرائی سی اپنے میلے آنچل میں سمٹی جاتی تھی۔ شادی کے بعد بس تھوڑے ہی دنوں تک چولہا جلا تھا۔ گھڑی گھڑی بانو کا میاں جج صاحب کے گھر کے کسی نہ کسی ملازم سے جھگڑا کر کے اپنی کوٹھری والے گھر میں بیٹھ رہتا۔ ماں اس کو کھانے کو دوڑتی کبھی جھاڑو اور کبھی بیلن پھینک کر مارتی مگر وہ ہاتھ نچا نچا کر ہر کسی سے جھگڑنے لگتا تھا ماں کا غصہ وہ ہمیشہ دوسروں پر اتارنے کا عادی بن چکا تھا۔ عصیلی ساس کے ڈر سے بانو نے کبھی آنکھ اُٹھانے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ بڑھیا کی آنکھوں میں بہو کی صورت بُری طرح کھٹکنے لگی۔ کوٹھری کی قید سے گھبرا کر اگر اس نے ذرا کھل کر سانس لینی چاہی تو ساس کے کلیجے پر آرے چل جاتے تھے۔ پھر جیسے ہی اس کا جھگڑالو بیٹا کسی نہ کسی سے پٹ کر آتا، بڑھیا کھڑی ہو کر بہو کو پٹوانے لگتی۔ خالی پیٹ رہنے کی تو وہ بچپن سے عادی تھی مگر یہ لکڑی، چپل جوتے کی مار اس کے لیے ایک نئی مصیبت بن گئی تھی۔ اس کا میاں جتنا کمر لچکا کر نزاکت بھری چال سے چلا کرتا تھا اتنا ہی بیوی کو مارتے وقت وہ ایک بھرپور ظالم مرد بن جاتا تھا۔ ماں کے سامنے اس کی زبان بند رہتی۔ بیس روپے مہینے میں بڑی طاقت تھی جو ہر تین مہینوں کے بعد اس کی چٹکبری ماں کو سرکاری خزانے سے سپاہی کی بیوہ کی پنشن کہہ کر ملا کرتی تھی اور یہی بڑھیا کی جادو کی چھڑی تھی جس سے اس کا نکھٹو بیٹا ہر گھڑی ڈرتا رہتا تھا۔ ہر تین مہینے پر گھر میں راشن آتا، بڑے آب و تاب سے گیہوں دھو کر سکھائے جاتے، چولہے پر رونق آجاتی اور بڑھیا چند دنوں تک ذرا اکڑی اکڑی سی پھرتی۔ پھر دھیرے دھیرے جیسے پھولے اور لہراتے ہوئے بیلوں سے ہوا نکلنے لگتی ہے۔ اسی طرح چولہے کا دھواں بھی مدھم پڑتا چلا جاتا تھا۔

دن رات کے ایسے ہی اُلٹے سیدھے چکر چلتے رہتے۔ بانو اپنے بچھڑے ہوئے گھر والوں کو یاد کر کے چپکے چپکے رو لیتی مگر اس کی ہمت کبھی نہ ہوئی کہ چند دنوں کے لیے بھی اپنے ماں باپ کو دیکھ آئے۔

بڑھیا کی ٹانگیں دابتے دابتے بانو کی انگلیں اور ہاتھوں میں ہر گھڑی درد رہنے لگا تھا۔ اس پر سے چٹکبری ساس بھی بہو کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ جب نہ تب وہی گالیاں اور وہی صلواتیں اس کے نصیب میں تھیں۔ ڈری، سہمی ہوئی بانو جتنی خدمت گزاری میں جتی ہوئی رہتی بڑھیا اتنا ہی شیرنی کی طرح ڈکرتی چلی جاتی تھی۔

ماں کی گود میں مردہ بچی اکڑی ہوئی پڑی تھی۔ بانو کے پھٹے آنچل سے بچی کے الجھے ہوئے سنہرے بال نظر آرہے تھے۔ مکھیاں ہر طرف سے بھنبھناتی چلی آتی تھیں مگر ایک پرسا دینے والی عورت دیر سے مردہ بچی پر پنکھا جھلتی چلی جا رہی تھی۔ بانو کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں اس کو یاد آرہا تھا کہ بچی جب پیٹ میں تھی تو کیسی کیسی مار اس پر پڑتی رہتی تھی۔ بھوک سے نڈھال اور مار کے زخموں سے چور اس وقت بھی اس کی مامتا اپنے ہونے والے بچے کو

چوٹ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی تھی اور جب سنہرے بالوں والی بچی پیدا ہوئی تو بہت کمزور تھی۔ بڑھیا ساس نے تو اسی وقت منہ بنا کر کہا تھا۔ ''ہائے ای جنم جلی نگوڑی کاہے کو آئی ہے۔'' مگر بانو کے میاں نے جب اپنی خوب صورت سی کمزور بیٹی کو دیکھا تو بہت دیر تک اس کو اپنی گود میں لیے پیار کرتا رہا تھا۔ اب اس گھر میں ایک بچی کا تھوڑا سا خرچ اور بڑھ گیا تھا۔ حالات کی بے ترتیبی اپنی جگہ پر تھی۔ بھوکی ماں بچی کا پیٹ کیا بھر سکتی تھی۔ اسی حال میں بانو کی سوکھی ماری بچی بڑھتی گئی۔ بانو کے میاں نے بڑے لاڈ سے بچی کا نام شہزادی رکھا تھا۔ بڑھیا کی گالیوں کا خرچہ چلتا رہتا اور اس کے بیٹے کی مار دھاڑ اپنی جگہ پر رہتی بانو کی سسکیوں، ہچکیوں اور کراہوں کے درمیان شہزادی لڑکھڑاتی ہوئی چال سے چلتی ہوئی ماں کے پاس آ کر کہتی۔

''ماں بھات دے'' ہر گھڑی اس کے ہاتھ میں ایک المونیم کا پیالہ رہتا تھا۔ جو اس کا کھلونا بھی تھا۔ پانی پینے کا گلاس بھی وہی تھا اور اُسی پیالے کو ماں کے آگے پھیلا کر وہ بڑی معصومیت سے کہتی ''ماں بھات دے'' اب تک بس یہی اتنی سی بات اس نے سیکھی تھی۔ کبھی کبھی بانو کی آنکھیں اس وقت بھیگ جاتیں جب اس کا چولہا ٹھنڈا پڑا رہتا تب وہ سلیمان دھوبی کی بیوی سے دو نوالہ بھات مانگ کر لے آتی۔

بانو کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ گئی۔ پھر اس کی نگاہوں میں لیڈی ڈاکٹر مائر کی کوٹھی جھلک پڑی۔ لیڈی ڈاکٹر کی دوست پائر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی چڑچڑی سی سوکھی ماری بڑھیا کسی کو کوٹھی میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ دیتی تھی مگر لیڈی ڈاکٹر خانساماں ماں رشید ایک فرشتہ انسان تھا جو بچا کھچا ہوا کھانا چھپ چھپا کے چنگبری بڑھیا کو دے آتا تھا۔

ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے، سڑے گلے آم امردو

اور کبھی کبھار جو رشید کی طبیعت اچھی نہ رہتی تو وہ اپنا کھانا بھی انہیں دے جاتا تھا پھر وہ دیر تک اپنی کوٹھی کا حال سنا تا رہتا۔ بڑھیا پائر سے اس کی کبھی نہیں بنتی تھی اور ڈاکٹر بچاری کو اتنی فرصت کہاں تھی جو ان سارے بکھیڑوں میں پڑتی، سارا دن ہوسپٹل میں پھر شام سے بارہ بجے رات تک گھر پر مریضوں کا میلا سا لگا رہتا۔

مگر سوکھی ماری بڑھیا پائر رشید پر ایک مستقل عذاب تھی جہاں بڑھیا کے اپنے اتنے نخرے تھے۔ وہاں سب سے بڑی مصیبت پائر کا چہیتا کتا تھا۔ کتے کے لیے کولڈ فش پکتا، آئرش اسٹوڈ بنتے قسم قسم کے وٹامن بھرے ڈبے کے کھانے دیئے جاتے اور ہر ہفتہ اس کا ویٹ لیا جاتا تھا۔ بڑھیا کا کتا بھی اسی کی طرح نخریلا تھا۔ وہ ایک طرح کا کھانا بھی دو وقت نہیں کھایا کرتا۔ اس کو ورائٹی چاہیے تھی اور کتے کی یہ ساری مزاج داری بڑھیا پائر کے لاڈ اور پیار کے وجہ سے تھی۔ رشید بچارا پانچوں وقت کا نمازی، ہر گھڑی سر پر ٹوپی پہنے رہنے والا پرہیز گار آدمی، وہ کتے کے نخرے کو کیا جانے۔ اس پر سے پائر نے لاکھ سر پٹکا کہ کسی طرح رشید اس کے کتے کو صبح شام ٹہلا کر لے آیا کرے مگر رشید نے ایک نہ مانی اس نے صاف طور پر انکار کر دی کہ اس نجس جانور کے قریب بھی وہ نہیں جائے گا۔ چاہے نوکری رہے یا جائے۔''

تب آخر تھک ہار کر پائر نے اپنے چہیتے کے لیے ساٹھ روپے مہینے پر ایک آیا رکھ لیا تھا۔ شروع شروع میں کتے کی زنجیر تھامتے ہوئے آیا تھر تھر اتی تھی۔ کُتے کے بچے نے غرا کے بھونکا اور وہ تڑپ کر آنگن میں بھاگی مگر رفتہ رفتہ پائر نے پیار دُلار کر کے کتے کو آیا سے ہلا ملا دیا تھا۔ کتے کا سارا کام آیا کے سپرد تھا مگر نہلانے دُھلانے کے کام پر ایک الگ سے جمعدار تھا آیا صبح اور شام کتے کی زنجیر تھامے اس کو ٹہلانے گھمانے نکلتی تھی اور اِدھر محلے کے سارے بچے

اپنے دونوں ہاتھوں میں لکڑی کے ٹکڑے لیے ایک دوسرے پر مارتے ہوئے ایک ساتھ چلاتے رہتے۔
''کتے کی آیا' کتے کی آیا' کتے کی آیا۔''
''یہ دیکھو جی! کتے کی آیا' کتے کی آیا۔''

شروع شروع میں تو آیا ایسی گھبرائی کہ کام چھوڑ کر بھاگنے کو تیار ہوگئی تھی مگر پھر وہ رکی! اور تب اس نے سوچا۔ ساٹھ روپے مہینے میں اس کے گھر کا راشن آجائے گا۔ بچے پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔ اگر وہ اس کتے کی نوکری چھوڑ دے گی تو پھر ساٹھ پیسے کمانے کی بھی امید نہ رہے گی۔ بچوں کا کیا ہے شور کرتے کرتے خود ہی چپ ہو جائیں گے۔''

اس پوری کوٹھی اور اس کے احاطے کے کونے کونے تک پائر کی حکومت تھی اور اس کے ساتھ اس کا کتا دندناتا پھرتا تھا۔ ''ہونہہ! سالی! کتا لیے پھرتی ہے۔ آدمی کا بچہ گھر میں جھانکے نہیں مگر سالا اِی نجس کتا چاہیے جس بچھونے پر چڑھے جس کرسی پر بیٹھے جس گدے پر کودتا پھرے سب کا سب اس کے باپ کا ہے۔''

رشید کو پائر سے اسی دن سے نفرت ہوگئی تھی جس روز اس نے سنا تھا کہ ڈاکٹر بے چاری اپنی پسند کی شادی کر رہی تھی مگر اسی بڈھی گھوڑی نے رُو دھو کر اس کی شادی رکوا دی تھی۔

اور اب اس ویران گھر میں بڑھیا ایک کتے کے بچے کی رونق لیے پھر رہی تھی۔

بانو نے کتے کے اس موٹے تازے بچے کو کئی بار دیکھا تھا چکنا پھرتیلا کتا پائر میم صاحب کے ساتھ بھی اور آپا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے بھی۔ پھر اس کو یاد آیا کہ ایک دن رشید نے اس کی بیٹی شہزادی کو اپنی ڈاکٹر مائر سے دکھلا دیا تھا۔ بغیر فیس لیے ڈاکٹر نے بہت اچھی طرح سے اس بچی کو دیکھا تھا۔ ہڈیوں کی ڈھانچہ اس بچی میں تھا ہی کیا سوکھے مارے چمڑے کے۔ ڈاکٹر نے بہت سی دوائیں لکھیں' انجکشن لیتے رہنے کی

تاکید کی اور بتایا کہ کھانا نہیں ملنے کی وجہ سے یہ بچی اس حال تک پہنچ گئی ہے اس کو آہستہ آہستہ بہت اچھی غذا دینی چاہیے دودھ' انڈا اور پھلوں کا رس دینا بے حد ضروری ہے۔'' ماڑ نے اپنی الماری میں سے سمپل کی کچھ دوائیں بھی رشید کے ہاتھ میں تھمادی تھیں اور رشید کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جب نجس کتے کولڈفش اور ائرش اسٹو کے ساتھ سیروں دودھ پیتے اور کلیجی کے ٹکڑے کھانے لگتے ہیں۔ تب انسان کا بچہ بھوک سے مرنے لگ جاتا ہے۔'' مگر چند ہی مہینوں میں گھڑی دیکھ کر انگلش کھانا کھانے والا کتے کا بچہ اچانک بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں اور مزاج پرسی کرنے والوں کی کئی گاڑیاں ماڑ کے گیٹ پر لگی رہتیں۔ بڑھیا پاڑ کتے کے بچے کی بیماری کے غم سے نڈھال اور دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ ڈاکٹر پاڑ نے بھی ہوسپٹل سے کئی دنوں کی چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ ڈاکٹر ماڑ اور بڑھیا پاڑ پر تو جیسے غموں کی بجلیاں سی گر پڑی تھیں۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئیں۔ بس اسی دن ان کے گھر کا گیٹ ہر کسی کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماڑ اور بڑھیا پاڑ نے جانے پہچانے ہوئے گھروں میں فون کے ذریعے یہ پیغام بھیج دیا تھا کہ اگر'' آپ چاہیں تو اُن کے جگر کے اس ٹکڑے کا آخری دیدار کرلیں۔'' ملنے ملانے والے اور ضرورت مند لوگ اس دل خراش پیغام کو سن کر کیسے نہ آتے؟ آنے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ اسی دن اپنی ساس کے ساتھ بانو بھی حیرت سے یہ دیکھنے آئی تھی کہ کتے کا ماتم کیسا ہوتا ہے۔ نوار کی چھوٹی سی پلنگڑی پر ڈنلپ کے گدے کے اُوپر ریشمی چادر سے ڈھکی کتے کی لاش دھری تھی جس کے سرہانے شمع دان میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ گھر کی خاموش اور افسردہ فضا میں ڈاکٹر اور بڑھیا پاڑ کی ہچکیوں اور سسکیوں کی لہریں اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی تھیں۔ انہی آنسوؤں' آہوں اور کراہوں کے درمیان کتے کی پلنگڑی سے لگی بیٹھی آیا زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔ غم سے اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں فکر سے گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھیں اور ایک کنارے افسردہ چہرے بنائے ایک درزی مشین پر تیز تیز پیر چلاتا ہوا سفید چمکیلے ساٹن سے کتے کا کفن سی رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا تابوت رکھا ہوا تھا۔ کفن کے اُوپر ڈھانکنے والی چار ہلکے نیلے رنگ کی جاپانی نیلون کی تھی جس کے چاروں طرف اسی رنگ کا لیس درزی نے ابھی لگا دیا تھا۔

بڑھیا پاڑ تو غم میں حال سے بے حال ہوئی جارہی تھی مگر اتنے پُرسا دینے والوں کے سامنے ڈاکٹر ماڑ نے اپنے آپ کو کچھ سنبھال رکھا تھا۔ تابوت اور کفن سب تیار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے بڑے پیار سے مردہ پلے کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا پھر اس کو گود میں لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اُسے جھلملاتا ہوا ساٹن کا کفن پہنانے لگی۔ ڈاکٹر کی کئی دوستوں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنی چاہی تھی مگر اپنے پیارے کتے کی یہ آخری خدمت وہ اپنے ہاتھوں سے انجام دینا چاہتی تھی۔ آخری آرام گاہ گدے دار تابوت میں جب کتے کے اس مردہ بچے کو سلا دیا گیا تو نیلون کی خوب صورت چادر سے ڈھانک دینے کے بعد بھی اس کا چہرہ جھلک رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے کئی تصویریں جب اتار لیں تب بڑھیا پاڑ اور ڈاکٹر ماڑ نے اپنے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ مردہ کتے کے بچے کو جھک کر بڑی حسرتوں سے آخری بار پیار کیا تھا اور پھر تابوت میں کانٹیاں ٹھوکی جانے لگی تھیں۔

ڈاکٹر ماڑ کا ٹرانسفر ہو چکا تھا مگر اس کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹی سی قبر پر ابھی تک یہ لکھا ہوا رہ گیا ہے۔

''ہماری محبتوں کا چراغ اس اندھیرے میں بجھا ہوا ہے۔'' بانو ایک بارگی چیخ پڑی۔ ''ہائے رے میری سہجادی بیٹی! تورے ایک بچ پھن بھی نہ ملا۔''

☆☆

دوشیزہ میگزین

رنگِ کائنات

دوشیزہ گلستاں

نئے لہجے، نئی آوازیں

یہ ہوئی نا بات

لولی وُڈ، بولی وُڈ

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

کچن کارنر

حکیم جی!

بیوٹی گائیڈ

اسماء اعوان

فرمان الٰہی

اور تم لوگ جہاں سے نکلو (نماز کے لیے) اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔ اور بے شک وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ سے بے خبر نہیں۔ اور تم جہاں سے نکلو مسجد حرام کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو اور مسلمانوں تم جہاں ہوا کرو اسی (مسجد) کی طرف رُخ کیا کرو (یہ تاکید) اس لیے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم لوگوں کو کسی طرح کا الزام نہ دے سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں گے) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا تاکہ میں تم کو اپنی نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

سورۃ البقرۃ:2 آیات 149 تا 150

حدیث نبویؐ

حضرت نوفل رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ کے ایک بازار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک نماز ایسی ہے اگر وہ کسی سے فوت ہو جائے تو گویا اس کے اہل خانہ اور مال و دولت تباہ ہو گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے وہ نماز عصر ہے۔

مسند: احمد بن حنبل

حکایت سعدی

توکل سیکھنا ہے تو پرندوں سے سیکھو کہ وہ جب وہ شام کو گھر جاتے ہیں تو ان کی چونچ میں کل کے لیے کوئی دانا نہیں ہوتا۔

حسن انتخاب: معصومہ رضا۔ گلستان جوہر، کراچی

فوری ضرورت ہے

☆ خون کی نہیں، صرف ایک الیکٹریشن کی، جو دوبارہ کرنٹ دوڑا سکے، ان لوگوں کے درمیان جو لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

☆ ایک (Optician) عینک ساز کی جو لوگوں کا آؤٹ لک تبدیل کر سکے۔

☆ ایک آرٹسٹ کی جو ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بنا سکے۔

☆ ایک تعمیراتی ورکر کی۔ جو پل بنا سکے، پڑوسیوں کے درمیان۔

☆ ایک مالی کی جو اچھی سوچ کاشت کر سکے۔

☆ ایک استاد کی جو دل سے پڑھا سکے۔

☆ ایک ریاضی دان کی جو ہم سب کو سکھا سکے کہ کس طرح ہم خوشیوں کو بانٹ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگیوں میں۔

مرسلہ: راشدہ اعجاز۔ کراچی

یقین کامل

ماں نے ایک پل کراس کرتے ہوئے اپنے

بچے سے کہا۔

''میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔''

بچہ بولا۔ ''نہیں ماں آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں۔''

ماں نے کہا۔ ''اس میں کیا فرق ہے۔''

اگر میں نے آپ کا ہاتھ پکڑا تو شاید میں مشکل میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں۔

لیکن اگر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے یقین ہے، آپ میرا ہاتھ کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑیں گی۔'' بچے نے سادگی سے جواب دیا۔

مرسلہ: فرح عالم۔ اسلام آباد

سخت جان

گداگر نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خاتون خانہ باہر نکلیں۔ فقیر کو دیکھ کر وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے تمہیں پچھلے سال بھی کھانا دیا تھا۔''

فقیر نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا' آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا بیگم صاحبہ! دراصل آپ نے مجھ اکیلے کو کھانا نہیں دیا تھا۔ ہم تین فقیر اکٹھے آئے تھے۔ آپ نے ہم تینوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اتفاق سے ان میں سے صرف میں ہی زندہ بچا ہوں۔''

مرسلہ: عارش۔ عاشر۔ لاہور

میرا دل یہ کہتا ہے

جو فاصلے دلوں میں ہوں
تو رابطوں کا کیا کرنا
سلسلوں کا کیا کہنا،
میرا دل کہتا ہے
رابطوں کو جوڑو تم ،
فاصلے مٹا دو
سلسلوں کو توڑو...... ناں
الفتوں کی برکھا ہو

جس میں بھیگ جائیں سب
پیار سیکھ جائیں سب

شاعرہ: شگفتہ شفیق۔ انتخاب۔ صبوحی کاظمی

سادگی پہ تیرے......

سردار اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لینے گیا۔

لڑکی والے: ابھی تو ہماری بیٹی پڑھ رہی ہے۔

سردار: چلو کوئی بات نہیں ہم ایک گھنٹے بعد پھر آجائیں گے۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

جیسے کو تیسا

بیوی: جب میں تم پر غصہ کرتی ہوں تم اپنا غصہ کہاں نکالتے ہو۔

شوہر: ٹوائلیٹ صاف کر کے۔

بیوی: (ہنس کر) کیسے صاف کرتے ہو۔

شوہر (اطمینان سے) تمہارے ٹوتھ برش سے۔

مرسلہ: حیات نور۔ لاہور

حقیقت

ہم جب بھی موت یا قبرستان کا ذکر کرتے ڈاکٹر اشفاق حسین ہمیں روک کر کہتے۔ ''نہیں دوستو! بری بات تم زندہ ہو۔ صرف زندگی کی بات کرو۔''

لیکن ہم میں سے کوئی انہیں ٹوک کر کہتا۔ ''ڈاکٹر صاحب موت سب سے بڑی حقیقت ہے۔''

''وہ کہتے پر دوستو! زندگی اس سے بھی بڑی حقیقت ہے۔ وہ لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں جو چمکتی دوپہر میں رات کے اندیشے سے کانپتے رہتے ہیں۔

مرسلہ: افشاں رضا۔ اسلام آباد

غزل

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں
بات نیت کی ہے صرف ورنہ
وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں

بھول جاتے ہیں مت برا کہنا
لوگ پُتلے خطا کے ہوتے ہیں
وہ جو بظاہر کچھ نہیں لگتے
اُن سے رشتے بلا کہ ہوتے ہیں
وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیض
جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں

انتخاب۔ ندیا مسعود۔ کراچی

اے ماں

ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے موت کا فرشتہ کھڑا تھا میں نے گھبرا کر پوچھا کہ یہاں کیسے۔

ملک الموت نے کہا۔ تیری ماں کو لینے آیا ہوں۔'' میں ایک دم گھبرا گیا۔ آنکھ نم ہوگئی میں نے کہا سودا کرتے ہیں۔ مجھے لے جاؤ میری ماں کی زندگی بخش دو۔'' وہ مسکرایا اور بولا کہ لینے تو تجھے ہی آیا تھا پر تجھ سے پہلے تیری ماں نے سودا کرلیا۔''

زریں زبیر گوٹھاری۔ کراچی

گھر کی مرغی

سیکرٹری نے اپنے باس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔'' سر! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آئی ہیں۔''

''کیا وہ خوبصورت ہے......؟''

باس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

'' جی ہاں انتہائی خوبصورت اور دلکش۔'' سیکرٹری نے جواب دیا۔

''اچھا...... اسے اندر بھیج دو۔'' باس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو باس نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔'' تم احمق تو نہیں ہو؟'' باس نے غصے سے کہا۔'' اس بدصورت عورت میں حسن کہاں سے تمہیں نظر آ گیا؟''

''میں معذرت خواہ ہوں'' سیکرٹری نے لجاجت میں کہا'' انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ان کے انداز سے میں سمجھا کہ وہ آپ کی بیوی تھیں''

''وہ میری بیوی ہی تھی۔'' باس نے آہستگی سے کہا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔''

مرسلہ: عرفان۔ کوٹری

پہلا اصول

ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے منیجر نے ایک سیلز مین کو آفس میں بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہا۔'' میں یہاں سے دیکھ رہا تھا تم ایک گاہک کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ تمہیں تو دکانداری کا پہلا اصول ہی معلوم نہیں کہ گاہک کی کسی بھی بات کی تردید نہیں کرتے۔ وہ جو بات کہے تمہیں جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب اس کے بعد اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے وہ گاہک کہہ کیا رہا تھا؟''

سیلز مین نے سر جھکا کر جواب دیا۔'' سر! وہ کہہ رہا تھا تمہارے منیجر سے بڑا گدھا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

مرسلہ: شاہینہ۔ ٹنڈو آدم

امید اور انتظار

امید، زندگی کا لنگر ہے۔ اس کا سہارا چھوڑ دینے سے انسانی کشتی گہرے پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی امید میں جی رہا ہے۔ ہر آنے والے دن سے بے شمار لوگوں کی لاتعداد امیدیں وابستہ ہوتی ہیں مگر وہ دن تمام لوگوں کی امیدیں کب پوری کرتا ہے؟

پھر ایک نئے دن کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

مرسلہ: نور العین۔ چک شہزاد

اداس لوگوں کے نام

جانے کس دل سے مسکراتے ہیں
وہ جو اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں

شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

تین جھوٹ

دنیا میں تین جھوٹ ایسے ہیں جو سب سے زیادہ بولے جاتے ہیں۔

☆ میری بیوی مجھے آج تک نہیں سمجھ سکی۔

☆ ہم نے رقم کا چیک ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیا ہے۔

☆ حکومت چاہتی ہے کہ لوگوں کے مسائل حل کرے۔

مرسلہ: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دوسروں کے مال کی طمع نہ کرنا بھی دراصل سخاوت ہے۔

☆ نصیحت اگرچہ ناخوشگوار ہوتی ہے لیکن اس کا انجام خوشگوار ہوتا ہے۔

☆ شر اور فساد کو چھوڑنا بھی صدقہ ہے۔

☆ جو محبتوں کی قدر نہیں کرتے، وہ نفرتوں کا نشانہ بنتے ہیں۔

☆ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو دوسروں کی خوشی ضرور مانگیں کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ آپ کی خوشیاں دوسروں کی دعاؤں کی بدولت آپ کے پاس ہوں۔

مرسلہ: افشین۔ حیدر آباد

ایک سے بڑھ کر ایک

لڑکے نے لڑکی سے موبائل فون پر پوچھا۔

''کہاں پر ہو؟''

لڑکی نے بتایا میں اپنے ڈیڈی کی بی ایم ڈبلیو کار میں کلب جا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور مجھے کلب چھوڑے گا، اس کے بعد شاپنگ کے لیے جاؤں گی پھر تمہیں کال کروں گی، تم کہاں پر ہو؟''

''ویگن میں تمہاری سیٹ کے پیچھے بیٹھا ہوں۔ تم کرایہ مت دینا، میں نے دے دیا ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

مرسلہ: احسن عرفان۔ کراچی

کامیابی تک

کامیابیوں کی چوٹی کو چھونے والے ناکامی کا سبق سیکھتے ہیں۔ ''کبھی نہ گرنا کوئی کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھلنا کمال ہے۔ یقیناً کسی عقل مند نے ناکامی سے سبق سیکھ کر یہ بات کہی ہوگی۔ ناکامی کا سامنا حوصلے اور ہمت سے کرنے والے لوگ ہی زندگی کے ہر میدان میں کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں اور تاریخ بناتے ہیں۔ جو کبھی غلطی نہ کرے یا ناکامی کا سامنا کرے، وہ انسان نہیں بلکہ ایک روبوٹ ہے۔ روبوٹ کبھی غلطی نہیں کرتا اور نہ ہی ناکام ہوتا ہے۔ جب تک اس کی میعاد ختم نہیں ہو جاتی۔ ناکامی کا سامنا بزدلی سے کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے اس لیے زندگی میں اگر کبھی ناکامی سے دوچار ہونا پڑے تو ہمیں اس وقت تک ہمت اور جواں مردی سے کام لینا چاہیے، جب تک کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چومے۔ ناکامی، کامیابی کے دروازے کی کنجی ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر سہیلا کاظمی۔ کراچی

ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں تو صرف تیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔''

''کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

''جناب ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے سسرال جا رہا تھا۔'' ان صاحب نے جواب دیا۔

مرسلہ: سارہ ظفر۔ ساہیوال

☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

غزل

آج بھی یاد ہے وہ چھوڑ کے جانا تیرا
مجھ سے منہ پھیر کہ وہ آنسو بہانا تیرا
پیڑ کی چھاؤں میں ندی کے کنارے اکثر
بانسری پر وہ حسیں گیت سنانا تیرا
جب بھی برسات کی رم جھم میں محو ہو جاتی
آ کے کھڑکی میں اچانک وہ ڈرانا تیرا
باغ میں جھولتی رہتی تھی میں اکثر جھولا
ایک سے ایک غزل بڑھ کے سنانا تیرا
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو وہی وقت وہ آنا تیرا
جانے والا کبھی واپس نہیں آتا انزاء
اتنا آساں تو نہیں بھول ہی جانا تیرا

اِنزاء نقوی۔کراچی

عورت

آج بھی عورت ظلم کی چادر اوڑھے سوتی ہے
آج بھی عورت ہر لمحہ دھتکاری جاتی ہے
آج بھی عورت ہے بے عزت و بے توقیر
لیکن پھر بھی حرص و ہوس کا شکار ہو جاتی ہے
آج بھی عورت کو بازار میں سجایا جاتا ہے
جہاں خریدی اور وہ بیچی جاتی ہے
آج بھی عورت بیٹی پیدا کرنے پر
سولی پہ لٹکائی جاتی ہے
آج بھی عورت سے حق چھینا جاتا ہے
بوڑھا ہو یا گود پالا، ورنہ قران سے بیاہی جاتی ہے
آج بھی عورت سے وابستہ رشتے ہیں صرف نام کے
جن کے نام پر وہ روز ماری و جلائی جاتی ہے
آج بھی عورت سہہ رہی ہے مرد کا ہر ظلم
اور زہر کا ہر گھونٹ امرت سمجھ کے پی جاتی ہے

ثمینہ عرفان۔کراچی

کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو

اب کون سے دکھ کی بات کروں
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو
جی جان سے مر جانے کا دکھ؟
یا اس کے بچھڑنے کا دکھ؟
کُرلاتی ہوئی کونجوں سا دکھ؟
یا گرتی ہوئی بوندوں سا دکھ؟
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو
میں کون سے دکھ کی بات کروں
کوئی ایک ہو دکھ تو یاد بھی ہو

فرح علی۔کراچی

غزل

ایک چہرہ جو چشم خواب میں تھا
عکس اس کا ہر اک گلاب میں تھا
سکھ کے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں
دکھ تو سارا مرے حساب میں تھا
ہم نفس مجھ سے بے رخی کے بعد
مبتلا خود بھی اک عذاب میں تھا
اک فسانہ جسے کہیں چاہت
نامکمل ہر اک کتاب میں تھا

نشہ جو اس کی آنکھ میں تھا جمال
وہ بھلا کب کسی شراب میں تھا
سمیع جمال۔کراچی

غزل

بے چین سے یہ دن ہیں اور بے قرار راتیں
کب ختم ہوں گی یا رب! یہ انتظار راتیں
جھلسا رہی ہیں تن کو، لرزا رہی ہیں من کو
مثل شرار راتیں، یہ شعلہ بار راتیں
آنکھوں میں غم کی جل تھل، دم گھٹ رہا ہے پل پل
دار و صلیب کی ہیں آئینہ دار راتیں
کیسی ملی جدائی، اک پل نہ نیند آئی
دشمن کا جیسے مجھ پر کرتی ہیں وار راتیں
خانم ہے شب گزیدہ، جیسے بدن دریدہ
میرے کریم رب تُو اس کی نکھار راتیں
فرید خانم۔لاہور

غزل

محبت میں دست دعا لکھنے والو
محبت کو سمجھو وفا لکھنے والو
ذرا خود بھی اس پہ عمل کر کے دیکھو
کبھی زندگی کو انا لکھنے والو
زمیں پر تمہاری حکومت رہے گی
کہاں تک یہ خود کو خدا لکھنے والو
تمہیں جو تجھی لکھنا ہے مرضی تمہاری
ہمیں ہر گھڑی بے وفا لکھنے والو
قفس میں پرندے مرے جا رہے ہیں
کہاں چھپ گئے ہو ہوا لکھنے والو
تمہیں کس قدر خوبصورت لگی ہوں
فری کی قاتل ادا لکھنے والو
فریدہ فری۔لاہور

غزل

روز دوستی کر کے روز توڑ دیتے ہیں
خواب آنکھ کھلنے پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
داغ اچھے ہوتے ہیں دل پر اس لیے احباب
جب بھی موقع ملتا ہے داغ چھوڑ دیتے ہیں
تتلیاں محبت کی ہاتھ میں نہیں ٹھہرتیں
رنگ ہاتھ پر لیکن چھوڑ دیتے ہیں
اک نئی لغت دیکھی دوستی کے رشتوں کی
ہاتھ جو ملاتے ہیں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
درد کی فیصلوں پر کرب جاگتا ہے جب
لفظ بھی تسلی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
خولہ عرفان۔کراچی

غزل

پسند آتی ہے اس کی سادگی جو مجھ کو
وہ روٹھ جائے تو بھاتی ہے دل لگی مجھ کو
وہ ایک پھول سا چہرہ جو دے گیا ہے دعا
یوں اپنی ذات میں لگتی ہے تازگی مجھ کو
جو ایک دل تھا وہ خانوں میں بٹ گیا آخر
یہ کس مقام پہ لے آئی بے دلی مجھ کو
میں آگ بن کے سمندر میں کود جاؤں گی
بلا رہی سمندر کی تشنگی مجھ کو
بھلا کے درد میں سارے تجھ ہی کو سوچوں گی
تو راس آ تو سہی میری زندگی مجھ کو
ہما میں گنتی میں بٹتی رہی ہوں اک اک پل
سمیٹ لے کبھی صدیوں کی آگہی مجھ کو
ہما اعظمی۔کراچی

☆☆......☆☆

اس ماہ شازیہ رضوی۔ کراچی کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جارہا ہے (ادارہ)

نگہت سلطانہ۔ کویت سٹی

☺: زین بھائی! میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو؟

☆ پھر وہ گاڑی کب رہی، وہ تو رکشا ہو گیا۔ میاں آگے دو بیویاں پیچھے۔

درشہوار۔ کراچی

☺: زین جی! جلدی سے ہمیں مچھر کی مونث بتائیے؟

☆ ارے ارے، ذرا آرام سے۔ یہی سوال جب ہم نے مسٹر مچھر سے کیا تو اس نے پتا ہے کیا کہا تھا وہ بولا ہم اپنی گھر والی کا نام کیسے بتا سکتے ہیں۔ بھائی ہمارے ہاں بہت پردہ ہوتا ہے نا۔

امید فاطمہ۔ گھوٹکی

☺: بند آنکھوں سے کیسے سپنے دیکھتے ہیں؟

☆ بہت اچھے......کبھی بہت ہی اچھے۔

عامر بشیر۔ کراچی

☺: بھائی جان! لوگ دور جا کر بھلا کیوں دیتے ہیں؟

☆ دور جا کر......ارے بھئی ہمیں تو قریب کا بھی بڑا تجربہ ہے۔

نرگس اشرف۔ کراچی

☺: زین بھائی! اگر مجنوں کی جگہ آپ ہوتے تو؟

☆ نا بابا نا! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

شمسہ بابر۔ چیچہ وطنی

☺: زین جی! اس موسم بہار میں، میں کون سا پودا لگاؤں؟

☆ اس بار نیم ٹھیک رہے گا۔

انور جہاں۔ حیدرآباد

☺: زین جی! جلدی سے بتا دیں کہ لڑکیوں کے لیے کون سا پروفیشن ٹھیک رہتا ہے فائنشلی طور پر؟

☆ ٹیچنگ کا! کیوں کہ شادی کے بعد بھی وہ Miss ہی کہلاتی ہیں۔

پروین صدیق۔ لاہور

☺: بھیا جی! اس مرتبہ بہار ہمیں کیا پیغام دے رہی ہے؟

☆ وہی جو ہر سال دیتی ہے۔ بہارو پھول برساؤ

کوئی تو آنے والا ہے۔

صبور احمد۔ سیالکوٹ

☺: زین جی محبوبہ کی زلفوں کی چھاؤں میں سکون ملتا ہے یا درخت کی چھاؤں میں؟

☆ بھئی ہمیں تو درخت کی ہی چھاؤں کا تجربہ ہے۔ سچ مچ بہت سکون ملتا ہے۔

شاہانہ احمد۔ کراچی

☺: بھیا گھر میں آنے والے مہمانوں پر زیادہ پیار آتا ہے یا جانے والوں پر؟

☆ یہ تو بھئی مہمانوں پر منحصر ہے کہ وہ جمالی ہیں یا جلالی۔

شازیہ رضوی۔ کراچی

☺: زین بھائی! وہ سالگرہ کا کیک کیوں نہیں کھاتے؟

☆ انہیں نقصان جو بہت دیتا ہے۔ کیسے منہ میٹھا کر سکتے ہیں۔

عائمہ کنول۔ سکھر

☺: زین بھائی! وہ مجھے جند جان کہتے ہیں۔ بتائیے میں ان کو کیا کہوں؟

☆ شاہ رخ خان کہہ دو خوش ہو جائیں گے۔

شبانہ زمان۔ کراچی

☺: بھیا! بوجھیں تو جانوں۔ اشارے یہ ہیں۔ بیوی کا ڈر، نہ گھر کا نہ باہر کا؟

☆ کسی پالتو جانور کی طرف اشارہ ہے۔

حنا لطیف۔ اسلام آباد

☺: بھیا جی! ہر سال وہ مجھے کیلنڈر اور جنتری کیوں تھما دیتے ہیں؟

☆ ارے ذرا خیال سے! بہت دور اندیش ہیں، اس لیے ان سے ذرا دور دور ہی رہا کرو اور سنبھل کہ بات کیا کرو۔

صائمہ جہاں۔حویلیاں

☺: زین بھائی! ذرا یہ تو بتایئے کہ بیوی کے میکے جانے پر شوہر حضرات کی خوشی دیدنی کیوں ہوتی ہے؟

☆ ارے واہ! بھئی جلدی سے سن لیں۔ آزادی کسے پسند نہیں ہوتی۔

عروج انیس۔امریکہ

☺: زین جی! کسی کے دل میں گھر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

☆ یہ کوئی مسئلہ ہے؟؟ تم انہیں پہلے سے بتا دو جہیز میں ٹرک بھر کر مال اور ایک عدد مکان لے کر جاؤ گی۔

صدف نوید۔کراچی

☺: زین بھائی! زین بھائی امیدوں کے پھول کس رنگ کے ہوتے ہیں؟

☆ سرخ سرخ۔

فرزانہ خان۔ملتان

☺: زین بھیا! گرمیوں میں کسی کے گھر جائیں تو کیا لے کر جانا چاہیے؟

☆ ملتان سے کڑھائی والے کھسے اور سوٹ۔

مونس۔نانگا پربت

☺: بھیا! اگر میاں جی روز روز تعریفیں کرنے لگیں تو کیا سمجھا جائے؟

☆ سمجھ لیں آپ نے انہیں فتح کر ہی لیا۔

رابی شاہ۔جہلم

☺: زین جی! اکثر بیوٹی گرلز کے ہزبینڈ گنجے کیوں ہوتے ہیں؟

☆ ارے یہ تو پیسے والوں کا ٹریڈ مارک ہے بھئی۔

سدرہ انور علی۔جھنگ

☺: زین جی! بچوں کی کون سی قسم شریف ہوتی ہے؟

☆ جو ابھی دنیا میں آئی ہی نہیں۔

حور فاطمہ۔پشاور

☺: زین جی! لوگ زیادہ میٹھا کیوں اور کس لیے کھاتے ہیں مختصر جواب دیں؟

☆ لگ رہا ہے پیپر کا سوال ہے خیر جواب یہ ہے بی بی! میٹھا کھانے والے کڑوی باتیں بھی بڑے مزے سے کر لیتے ہیں۔

حریم آصف۔شیخوپورہ

☺: بھیا! دل کے قریب کون رہتا ہے؟

☆ دل تو بادشاہ ہے۔ کسی کو بھی زیادہ قریب آنے نہیں دیتا۔

افشین ظہور۔کراچی

بھیا! اگر عامر خان مجھے اپنے ساتھ ہیروئن کی آفر کریں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

☆ فوراً اپنی امی سے کہو کہ تمہیں چٹکی بھر لیں۔

☆☆......☆☆

کوپن برائے
مئی 2015ء

نام:

پتا:

ظفر عمر زبیری

ہٹ لسٹ

کہنے لگے آپ اس خبر کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ بات یہ ہے کہ جب یہ خبر شائع ہوگی تو ہم خود اسے پڑھ کر دوسروں کو سنائیں گے تو کیا ان پر ہمارا رعب و دبدبہ طاری نہیں ہو جائے گا۔ ہٹ لسٹ پر عام آدمی کا نام تو نہیں آتا ہے، جاں بازوں کے نام ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں قتل......

آج کے حالات کے پس منظر میں، ظرافت کا رنگ لیے ایک خوبصورت تحریر

ہمارے محلے میں ایک بڑا پارک ہے، جس میں صبح کے وقت خاصی رونق رہتی ہے کچھ حضرات قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، کچھ چہل قدمی فرماتے ہیں اور کچھ دبلے مرد اور موٹی خواتین پارک کے باہر اس کے اردگرد تیز تیز قدموں سے چلتی یا دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ہم بھی کچھ عرصے پہلے ایسے ہی دبلے مردوں میں شامل تھے، لیکن جب موٹی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو خواتین کی چست خرامی بجائے پسندیدگی کے ہمیں ناپسندیدگی میں تبدیل ہوئی اور ہم نے پارک جانا ترک کر دیا۔

صبح ہی صبح ہم نہ صرف اپنا ناشتا تیار کرنے لگے، بلکہ کچھ پڑھنے لکھنے کا بھی اہتمام ہونے لگا۔ ایک دن کیا ہوا ہمارے محلے اور پارک کے دلدادہ بھائی نفیس عالم نے ٹھیک سات بجے ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھول کر جب ان کا دیدار ہوا۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صبح دم تشریف آوری کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے۔

''ایک ناول آئیڈیا میں آیا ہے۔'' ہم نے دریافت کیا۔

''ناول آپ اردو میں لکھیں گے یا انگریزی میں؟'' کہنے لگے۔

''نہیں یار، ذہن میں ایک اسکیم آئی ہے، سوچا آپ سے پہلے اس مسئلے پر گفتگو ہو جائے۔'' ہمیں اپنی صلاحیتوں پر شک ہونا لازمی تھا۔ پوچھنے لگے، بھابی جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔'' عرض کیا،'' وہ فجر کی نماز پڑھ کے دوبارہ سو جاتی ہیں، پھر آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتیں۔'' بولے میں اندر آ جاؤں تفصیل سے بات ہوگی۔

کمرے میں آرام سے بیٹھ کر بھائی نفیس عالم نے کہا،'' کمرے کا دروازہ بند کر دیں مسئلہ اتنا نازک ہے کہ فی الحال اس کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے، ورنہ بعد میں تو پورے شہر کو ہی معلوم ہو جائے گا۔''

ہم محو حیرت تھے کہ نفیس عالم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنا ایک کان بھائی نفیس عالم کے منہ کے سامنے کر دیا کہ کہیں بات سنی ان سنی نہ ہو جائے۔ ہماری مستعدی پر تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ آپ نے ایک

دن تذکرہ کیا تھا کہ آپ کے ایک دوست روزنامہ ''
بھنگ'' میں چیف رپورٹر ہیں۔'' ہم نے ان کی
یاداشت پر صاد کیا اور کہا۔
''ان کا نام شہریار خان ہے ان سے آپ کو کیا
کام آن پڑا ہے۔
جیب سے ایک پرچہ نکالتے ہوئے کہا یہ خبر پہلے
صفحے پر چھپوانی ہے وہ پرچہ جب ہمارے ہاتھ میں آیا
تو ہم پر سکتہ طاری ہوگیا۔
نفیس عالم صاحب، تھوڑی دیر خاموش رہے،
پھر گویا ہوئے،'' زبیری صاحب! یہ آپ کو کیا
ہوگیا ہے، لگتا ہے آپ تو کوچ کرنے والے ہیں۔''
ہم نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول کر سر کو دو
تین جھٹکے دیے اور کہا۔
''حضور یہ کیا لکھ لائے ہیں آپ؟'' کہنے لگے
بہت اہم بات ہے، آپ کی سمجھ میں مشکل آئے گی۔
قارئین، نفیس عالم کے پرچے میں تحریر تھا کہ۔
''مشہور سماجی کارکن نفیس عالم کا نام اپنی لٹ
لسٹ پر ایک سیاسی جماعت نے اپنے حالیہ بیان
میں کہا ہے کہ اس نے مشہور سماجی کارکن نفیس عالم کا
نام اپنی ہٹ لسٹ پر لگا دیا ہے۔ وہ یا تو سماجی کاموں
سے فوری طور پر دست بردار ہوجائیں، یا اپنی قبر کا
انتظام کرلیں۔''
ہم نے یہ تحریر با آواز بلند پڑھ کر نفیس عالم
صاحب سے کہا کہ پہلے ہمارے چند سوالات کے
جوابات عنایت فرمائیے:
کہنے لگے ''ضرور ضرور۔''
پہلا سوال! آپ مشہور سماجی کارکن کب سے
بن گئے ہیں؟
جواب:'' ہم تقریباً ہر روز سڑک پر پڑی ہوئی
ایک دو اینٹیں ضرور ہٹاتے ہیں۔
ترکاری بیچنے والے کو روز ڈانٹتے ہیں کہ اتنی زور
سے چیخ کر سبزی مت فروخت کرو، محلے کا سکون
برباد کردیتے ہو اور تیسرے یہ کہ ہم ایک تنظیم بنانے
والے ہیں، جس کا نام ہوگا'' کارکنان سماجی تحریک۔
وطن عزیز۔''
دوسرا سوال: اس سیاسی تحریک کا نام بتائیے، جو
آپ کو قبرستان کا راستہ دکھانا چاہتی ہے۔''
''جواب: ایسی کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے، لیکن
محلے میں اپنی دہشت بٹھانے کے لیے سیاسی
جماعت لکھنا ضروری ہے۔
''ہم نے عرض کیا اول تو آپ کوئی مشہور سماجی
کارکن نہیں ہیں، دوسرے کوئی ایسی سیاسی جماعت
نہیں ہے، جو آپ کو راہ عدم دکھانا پسند کرتی ہو، آپ
کیوں اپنی بیوی کو اس قدر جلد بیوہ بنانے پر مصر ہو
گئے ہیں۔''
کہنے لگے آپ اس خبر کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔
بات یہ ہے کہ جب یہ خبر شائع ہوگی تو ہم خود اسے
پڑھ کر دوسروں کو سنائیں گے تو کیا ان پر ہمارا رعب و
دبدبہ طاری نہیں ہوجائے گا۔ ہٹ لسٹ پر عام آدمی
کا نام تو نہیں آتا ہے، جاں بازوں کے نام ہی
ہوتے ہیں۔ ہمیں قتل کرنے والا تو کوئی نہیں، خواہ
مخواہ کون کسے قتل کرتا ہے۔''
عرض کیا،''اس شہر میں شوقین قاتل بھی بستے
ہیں، ان کا کام قتل کردینا ہے کسی کو معلوم ہوگیا کہ
آپ لسٹ پر آگئے ہیں تو دو آدمی اسکوٹر پر آپ کا پتا
پوچھتے آئیں گے۔ آپ گھر سے باہر نکلیں گے کئی
گولیاں آپ کے سینے میں پیوست کرکے وہ رفو چکر
ہوجائیں گے۔ ان کا شوق پورا ہوجائے گا اہل محلہ
سناٹے میں آجائیں گے۔''
کہنے لگے،'' آپ کمال کرتے ہیں، ہم کوئی
مرنے کے لیے تھوڑی یہ خبر چھپوانا چاہتے ہیں، بس
ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ جو محلے کا جمعدار ہے، یہ ہمیں

دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے سلام تک نہیں کرتا اور جو ترکاری والا ہے، یہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ زیادہ ہی شور مچاتا ہے، اور یہ جو لائن مین ہے جمال اس نے دس دن سے ہمارا فون ٹھیک نہیں کیا ہے۔ ہٹ لسٹ پر ہمارا نام سن کر سب اپنے ہوشوں میں آجائیں گے۔ کیا سمجھے آپ......؟''

ہم نے کہا، ہم بالکل سمجھ گئے، سارا قصہ جمال کا ہے۔''

کہنے لگے، کل میں نے اسے پکڑ لیا تو کہنے لگا آپ کا کمپلینٹ نمبر تو ایک سو ستائیسواں ہے، ایک ہفتہ اور لگے گا۔ میں نے کہا بکواس بند کرو، ستائیسواں نمبر ہے، سمجھ گئے۔ میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔

ہم نے کہا، وہ رشوت کب مانگتا ہے وہ تو قرض مانگتا ہے۔ تنخواہ ملتے ہی قرض ادا کردوں گا۔''

فرمایا مجھے معلوم ہے آج تک اس نے کسی کا قرض ادا نہیں کیا، جو میرا ادا کرے گا۔''

ہم نے پوچھا،''قرض میں کتنی رقم مانگ رہا ہے؟'' بولے پورے ایک ہزار روپوں کا مطالبہ ہے کہ بچوں کی اسکول کی کتابیں خریدنی ہیں۔ یہ خبر پڑھتے ہی وہ ہمارا فون ٹھیک کردے گا۔''

ہم نے کہا یہ خبر اتنی آسانی سے شائع نہیں ہو سکتی، بلکہ ہمارے خیال میں ناممکن ہے۔''

کہنے لگے، پھر آپ کی دوستی کا فائدہ! اچھا اب ہمیں اجازت دیں۔'' یہ جملہ اس قدر دردانگیز انداز میں کہا گیا کہ ہم نے کہا۔

''نفیس صاحب ہم کو کم از کم دو دن تو دیں کہ ہم ''بھنگ'' اخبار کے چیف رپورٹر سے بات کرلیں، جمال لائن مین کو سمجھا بجھالیں۔'' کہنے لگے آج بدھ کا دن ہے میں ہفتہ کی صبح حاضر ہوں گا۔''

☆☆......☆☆

ہفتہ کو ٹھیک سات بجے نفیس عالم صاحب نے ہمیں ہلکی سی آواز دی ہم نے فوراً دروازہ کھول کر انہیں کمرے کے اندر آرام سے بٹھا دیا۔ وہ ہمیں امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

عرض کیا ہے کہ چیف رپورٹر صاحب نے پہلے آپ کا پرچہ پڑھ کر کچھ مغلظات سنائی تھیں، جو ہم دہرا نہیں سکتے۔ ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے فرمایا کہ اسے ایک خصوصی اشتہار کی صورت میں شائع کرسکتے ہیں، جس کا ہدیہ دس ہزار روپے سے کم نہ ہوگا۔''

''دس ہزار روپے، اس دو سطری اشتہار کے؟ نا بابا نا ہم اس محبت سے باز آئے۔ یہ کیسے دوست ہیں آپ کہ گلا کاٹنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔''

تھوڑے وقفے کے بعد جمال سے متعلق دریافت کیا تو ہم نے کہا ہم نے اس کو پانچ سو روپے پر تیار کرلیا ہے اور اس نے پکا وعدہ کیا ہے کہ وہ چھ ماہ کے اندر آپ کا قرضہ اتار دے گا۔

نفیس صاحب کہنے لگے۔''میں جمال کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔'' ہم نے کہا،''آپ نہ دیں ہم دیتے ہیں۔ بعد میں آپ ہم کو ادا کردیجیے گا۔'' وہ کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ ہم نے ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھا اور جمال کو قرضے کی رقم دے دی۔ اگلے دن ان کا فون درست ہوگیا۔ تو انہوں نے ہمیں فون کرکے خوش خبری سنائی کہ ان کا فون خود بخود درست ہوگیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے ان کی طرف سے پانچ سو روپے جمال کو کل دے دیے تھے تو وہ ناراض ہوکر بولے۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ میں ایک پیسہ دینے والا نہیں ہوں۔

اس طرح ہم خود بھائی نفیس کی مالیاتی ہٹ لسٹ پر نمودار ہوگئے۔ بیوی نے سارا قصہ سن کر صرف اتنا کہا۔

''نیکی کرو اور لیاری ندی میں ڈالو۔''

☆☆......☆☆

لولی وڈ بولی وڈ

ڈی۔ خان

فواد خان کی کپور اینڈ سنز

بہترین نئی دریافت کا فلم فیئر ایوارڈ پانے والے لولی وڈ کے نمبر ون اسٹار فواد خان نے حال ہی میں کرن جوہر کی فلم کپور اینڈ سنز سائن کرلی ہے۔ یادرہے کرن جوہر کا نام ہی بولی وڈ میں کامیابی کی ضمانت مانا جاتا ہے۔ وش یو بیسٹ آف لک مسٹر ہیرو۔

حمزہ علی عباسی، آئٹم نمبر کے خلاف

حمزہ علی عباسی ان دنوں خبروں میں ہیں۔ پیارے افضل سے شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے حمزہ نے کہا ہے کہ بول اور خدا کے لیے میں کوئی آئٹم نمبر نہیں تھا لیکن فلمیں بلاک بسٹر ثابت ہوئیں۔ فلم کی کامیابی کے لیے مسالوں کی نہیں مضبوط اسکرپٹ، ڈائریکشن اور اداکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

نازیہ حسن کی پچاسویں سالگرہ

موسیقی کی دنیا میں نیا انداز متعارف کرانے والی پاپ گلوکارہ نازیہ حسن آج اگر زندہ ہوتیں تو اپنی پچاسویں سالگرہ منارہی ہوتیں۔ نازیہ حسن اور

ان کے بھائی ذوہیب حسن کو پاکستان میں پاپ

موسیقی کا بانی کہا جاتا ہے۔ نازیہ اور ذہیب نے اسی کی دہائی میں بھارتی فلم میں آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے گا کر گلوکاری کی دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔

سشانت سنگھ راجپوت

کی ڈٹیکٹو بیوم کیش بخشی

بلاک بسٹر فلم پی کے سے شہرت پانے والے سرفراز یعنی سشانت سنگھ راجپوت ڈیٹیکٹو بیوم کیش

بخشی ماہ اپریل میں ریلیز ہونے والی بولی وڈ کی پہلی فلم ہے۔ ہدایت کار دیپا کر بینر جی کی فلم کی کہانی معروف مصنف شرادند کے افسانوی سراغ رساں کردار بیوم کیش بخشی سے ماخوذ ہے۔ ایکشن اور تھرل سے بھرپور اس فلم کے دیگر ستاروں میں آنند تیواری، دیویا مینن اور سواستیکا مکھری جی شامل ہیں۔

عامر خان نے دنگل کے لیے صحت داؤ پر لگا دی

مسٹر پرفیکٹ عامر خان نے اپنی آنے والی فلم

دنگل کے لیے خوب وزن بڑھا لیا ہے۔ اس وقت عامر خان کی صحت مندی کے چرچے زوروں پر ہیں۔ نتیش تیواری کی فلم دنگل میں عامر خان نے لگ بھگ 25 کلو وزن بڑھایا ہے۔ امید ہے عامر خان کی آنے والی فلم دنگل کامیابی کے نئے ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوگی۔

دھرم سنکٹ سنسر کی زد میں

بولی وڈ سنسر بورڈ سی بی ایف سی نے آنے والی فلم دھرم سنکٹ میں یعنی مذہبی بحران کا شکار، کی اسکریننگ کے لیے مذہبی رہنماؤں کو مدعو کیا ہے۔ باریش راول اور نصیر الدین شاہ جیسے لیجنڈا اداکاروں کی فنکاری سے مزین اس فلم کی کہانی حساس موضوع پر مبنی ہے اطلاعات کے مطابق فلم می

سادھو سنتوں پر سنز کیا گیا ہے۔ اس فلم کی کہانی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے اس کی عمر کا اچھا خاصا حصہ گزر جانے کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ ایک مسلم گھر میں پیدا ہوا تھا اور ایک ہندو نے اسے گود لیا تھا۔

مسٹر چالو

فواد خان نے دھرما کرن جوہر کپور اینڈ سنز سائن کی تو دوسری طرف انہیں فوراً ہی پریانکا چوپڑا کے ساتھ لیڈنگ رول میں مسٹر چالو میں ریما کاگتی نے سائن کر لیا ہے۔ یاد رہے اس سے پہلے اس فلم میں کنگنا رناوت اور سیف علی خان کو سائن کیا گیا تھا لیکن ان اداکاروں کی مصروفیات کے پیش نظر فواد اور پریانکا کے نام قرعہ کھلا۔ فلم کی شوٹنگ اسٹارٹ ہو چکی ہے۔ امید ہے 2015 ہی میں یہ فلم نمائش پذیر ہو جائے گی۔

ڈرٹی پولیٹکس کے بعد عشق ان سنسرڈ

ڈرٹی پولیٹکس کی کامیابی کے بعد ملکہ شراوت کی نئی فلم شرمن جوشی کی 'عشق ان سنسرڈ' ہے۔ اب دیکھنا ہے ملیکہ کے لٹکے جھٹکے سنسر سے بچ کر شائقین فلم کو پلکیں جھپکنے پر کتنا مجبور کرتے ہیں۔

بولی وڈ کے نیشنل ایوارڈ

بولی وڈ کے نیشنل ایوارڈز کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ بیسٹ ایکٹر ٹھہرے کناڈا فلم 'نانو اوانلا' سے وجے۔ بیسٹ ایکٹریس میں ہندی فلم کوئن سے گنگنا رناوت ٹھہریں اور بیسٹ معاون اداکارہ کا ایوارڈ بلجندر کو ہریانوی فلم پگڑی کے لیے دیا گیا۔ میری کوم کی ڈائریکشن پر بہترین ہدایت کار قرار پائے سری جیت مکھرجی۔ بیسٹ ڈائیلاگز اور بہترین میوزک کے ایوارڈ وشال بھردواج کے حصے

میں۔ فلم حیدر سے آئے۔ حیدر ہی سے سکھو یندر سنگھ بسل گا کر بہترین میل سنگر کا ایوارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تو ڈولی آہلو والیا بھی حیدر سے بہترین کاسٹیومز ڈیزائنر کا ایوارڈ حاصل کر گئیں ۔میری کوم پر سنجے لیلا بھنسالی بیسٹ پروڈیوسر قرار پائے تو کوئن کے لیے بہترین ہندی فلم ڈائریکٹر کے طور پر وقاص بہل قرار پائے۔

ریما خان ماں بن گئیں

لولی وڈ کی صف اول کی اداکارہ اور

پروڈیوسر ریما خان ماہ مارچ میں ایک خوبصورت بیٹے کی ماں بن گئیں۔ ریما کی خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ بورن بے بی کی صحت اور زندگی کی دعائیں ہم سب کی طرف سے ہیں۔ ہپی ہپی ریما کے لیے۔

ماہرہ خان کی رئیس ریڈی

لولی وڈ کی نامور ہیروئن ماہرہ خان اپنی اداکاری کے ذریعے بڑا نام بنا چکی ہیں اور یہ ان کی کامیابی ہے کہ بولی وڈ کے فلم میکرز نے ماہرہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کنگ خان کہ ساتھ فلم رئیس میں بطور ہیروئن کاسٹ کر

لیا۔ شاہ رخ خان کی فیورٹ ہیروئنوں میں ماہرہ خان بھی شامل ہوگئی ہیں۔ ماہرہ خان کی فلم رئیس تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتے ہوئے مکمل ہوگئی ہے۔

ماہرہ خان اس وقت فواد خان کے بعد لولی وڈ ہاٹ کیک بن چکی ہیں ۔اس وقت ماہرہ خان کی ڈیمانڈ میں زبردست اضافہ ہو چکا ہے لیکن فی الحال ماہرہ نے اس کامیابی کو انجوائے کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور فی الحال انہوں نے کوئی پروجیکٹ سائن نہیں کیا۔ گڈ لک ماہرہ خان۔

☆☆......☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کرسکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

ثناء۔ فیصل آباد

✿: باجی! میرا بیٹا آٹھ سال کا ہے۔ ہر روز پہلے سے زیادہ رقم اسکول لے کر جانا چاہتا ہے۔ ایک دن اس نے سینڈوچ کے ساتھ دس روپے لیے پھر دوسرے دن بیس روپے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح تیسرے دن کہنے لگا یہ پیسے کم ہیں زیادہ دیں ورنہ اسکول نہیں جاؤں گا اور اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی میں نے فوراً پیسے دے دیے۔ میرے شوہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے آئندہ صرف لنچ ملے گا کوئی پیسا نہیں دیا جائے گا۔ جب وہ اسکول چھوڑنے جاتے ہیں تو وہ خاموشی سے چلا جاتا ہے مگر میرے ساتھ ضد کرتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا بچے کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟

☆: بچہ اُسی کے ساتھ ضد کرتا ہے جو ضد پوری کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اگر آپ بھی بچے کے اسکول نہ جانے والی دھمکی پر پریشان نہ ہوتیں اور اس کے مطالبے کی رقم میں اضافہ نہ کرتیں تو وہ سمجھ جاتا کہ بات نہیں مانی جائے گی۔ اگر وہ ایک بار بھی چھٹی کرلیتا تو والد کی ناراضگی اسے دوبارہ چھٹی پر آمادہ نہ کرتی پہلی بار ہی ضد پر بات پوری نہ کریں بلکہ اُس وقت سمجھا دیں کہ بات غلط ہے اور مطالبہ بھی غلط وقت پر ہے تاکہ اس کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ آئندہ اپنے حربے استعمال کرنے سے گریز کرے۔

صفیہ بانو۔ لاہور

✿: میرے مزاج، سوچ وطرز زندگی میں اس وقت بہت اچھی تبدیلیاں آئی تھیں، جب بیٹی کی پیدائش متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بیٹی ہوگی تو بھی میرے مزاج پر کوئی برا اثر نہ پڑا اور اب جب کہ بیٹی تین ماہ کی ہے، میں پہلے کی طرح بد مزاجی کا مظاہری کرتی ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ شوہر کہ ساتھ رویہ خراب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے میری والدہ سے بھی شکایت کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ شروع سے ہی غصے کی تیز ہے۔ خط اس لیے لکھ رہی ہوں اگر میرا مزاج خراب ہے تو حمل کے دوران خوشگوار کیوں رہا، پانچ سال قبل ڈپریشن بھی ہو چکا ہے۔

☆: دوران حمل خون میں ہارمونز کا مناسب توازن رہنے کے سبب طمانیت کا احساس رہا، جو قدرت کی طرف سے تھا اسی وجہ سے ذہنی کیفیت پر سکون رہی، بعد میں پھر پہلے والی کیفیت ہوگئی۔ پانچ سال قبل ہونے والا ڈپریشن کس طرح ٹھیک ہوا تھا، یہ آپ نے نہیں لکھا۔ بعض اوقات وقت کے ساتھ ذہنی کیفیت میں کچھ بہتری آجاتی ہے اور پھر دوبارہ وہی کیفیت ہو سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ غصہ اور

بدمزاجی کے ساتھ گھر بستے کم اور بگڑتے زیادہ ہیں۔ مزاج کی خرابی پیدائشی نقص نہیں، اس میں بہتری ممکن ہے۔

فاخرہ بتول۔راولپنڈی

☆: باجی! میرا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ میرے شوہر نے شادی کے بعد مجھ سے بہت باتیں کی تو قسمیں کھائی کہ تمہارے علاوہ کوئی اور عورت نہیں آ سکتی میری زندگی میں۔ لیکن جیسے ہی میں بیٹے کی ولادت کے بعد میکے میں رہنے کے لیے گئی۔ وہ گھر میں ایک لڑکی کو لے آئے اور وہ اب اس سے نکاح کر چکے ہیں۔ وہ لڑکی میرے بستر پر سوتی ہے۔ میری چیزیں استعمال کرتی ہے شوہر مجھ سے ملنے آتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں لیکن ساتھ لے کر نہیں جاتے۔ بچے سے بھی خاص دلچسپی نہیں۔ ان حالات میں شدید ڈپریشن کا شکار ہوں۔ میرا تو ماں کے سوا میکے میں بھی کوئی سہارا نہیں جو بچوں کے ساتھ یہاں زندگی گزاروں۔

☆: یہ سب کچھ برداشت کرنا معمولی بات نہیں جب کہ صحت کے حوالے سے بھی حساس دور سے گزر رہی ہیں۔ ننھے بچے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ہے۔ اب دو راستے ہیں یا تو ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنے حقوق حاصل کیے جائیں اور پھر سے بچوں ہی کی خاطر بہتر زندگی گزاری جائے۔ یا پھر غمگین ہو کر خود کو نفسیاتی مریضہ بنا لیا جائے مجھے آپ سے پہلے والے راستے کو اپنانے کی امید ہے اور یقیناً آپ ایسا کریں گی۔ سنبھال لیں خود کو! صبر کے ساتھ اٹھیں اور شوہر سے سنجیدگی سے بات کریں کہ وہ دوسری بیوی کو دوسرے گھر میں رکھیں، آپ کو آپ کا گھر خالی کروا دیں۔ اس معاملے میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

امیرہ فاطمہ۔کراچی

☆: باجی وقت کے ساتھ میری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے، کسی پل بھی سکون نہیں جبکہ ہمارے مالی حالات بھی خراب نہیں ہیں، اچھی جاب ہے میرے پاس مگر امی ہر بات پر ذہنی اذیت دیتی رہتی ہیں۔ بڑی بہن کی عمر 29 سال ہے میری 27 سال ہے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ خاندان سے دو رشتے آئے وہ بھی امی ابو نے نہیں ہونے دیے۔ اب نیٹ پر ایک آدمی سے بات ہوئی۔ کہتا ہے شادی شدہ ہے بیوی کو چھوڑا ہوا ہے۔ اس نے مجھے شادی کی آفر کی میں نے رشتہ لانے کو کہا تو اس نے ملنے کی شرط لگا دی، مگر مجھے اس بات پر شک ہے کہ وہ مجھے دھوکہ نہ دے دے کیوں کہ عزت پیاری ہے۔ یہ بھی سوچتی ہوں وہ مجھے باتوں سے غلط نہیں لگتا اعتبار بھی نہیں کر سکتی۔

☆: آپ کے جملے سے والدین کے حوالے سے بدگمانی ظاہر ہو رہی ہے۔ خاندان سے آنے والے رشتوں میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہو گی جو انکار ہوا یا پھر وہ قسمت میں ہی نہیں ہوں گے۔ والدہ کس قسم کی باتیں کہتی ہیں جن سے اذیت ہوتی ہے۔ یہ واضح نہ ہو سکا شادی میں دیر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انجانے لوگوں سے تعلق رکھا جائے، خواہ وہ صرف گفتگو تک ہی ہو، غلط ہے۔ آپ یقیناً ایک اچھی لڑکی ہیں جو ملنے نہیں گئیں لیکن لوگ اپنی باتوں سے خود کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو وہ حقیقت میں نہیں ہوتے کسی کی بیوی بلاوجہ علیحدہ نہیں ہوتی۔ اس شخص سے کبھی بھی کہیں ملنے نہ جائیں اور بات کرنی بھی چھوڑ دیں۔ آپ کی نیکی کے صلے میں اچھی زندگی ضرور ملے گی۔

☆☆......☆☆

پیارے قارئین! موسم آہستہ آہستہ تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ گرمیوں کی آمد آمد ہے۔ موسم براہ راست ہمارے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہم اس تبدیلی کو اپنے کھانوں کی انفرادیت اور ورائٹی سے ایک حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں۔ موسم کی مناسبت سے اس ماہ بھی آپ کے لیے پکانے میں آسان اور کھانے میں ذائقے دار ڈشز کی تراکیب حاضر ہیں۔

مٹن ہرا مسالا

اجزاء:

گوشت	ایک کلو مٹن، بیف یا چکن
ہری مرچ	15 سے 20 عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ادرک لہسن پیسٹ	2 ٹیبل اسپون
لال مرچ پاؤڈر	1 ٹی اسپون
ہلدی پاؤڈر	1 ٹی اسپون
پیاز	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا کلو
گرم مسالا	2 ٹیبل اسپون
نمک	حسب ذائقہ
گھی یا تیل	آدھا پاؤ

ترکیب:

گوشت اچھی طرح دھو کر دیگچی میں ڈالیں۔ اوپر پیاز کاٹ کر ڈالیں ادرک لہسن پیسٹ شامل کر لیں۔ تیل یا گھی ڈالیں۔ ساتھ میں لال مرچ پاؤڈر اور ہلدی پاؤڈر ڈالیں اور نمک بھی ڈال دیں ہری مرچ بھی شامل کر لیں۔ ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پہلے تیز آنچ پر ابالیں، پھر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب دیکھیں کہ گوشت گل گیا ہے۔ پانی خشک ہو رہا ہے تو اچھی طرح بھون لیں اور جب تیل یا گھی اوپر آجائے تو چولہا بند کر کے گرم مسالا چھڑک دیں۔ رائتہ اور نان سے تناول فرمائیں۔

عربی رائس

اجزاء

چاول	آدھا کلو
چکن	1 کلو
لہسن ادرک پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
پیاز	2 عدد
لیموں کا رس	4 کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	1 کھانے کے چمچ
بادام	آدھی پیالی
کشمش	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن کی بڑی بوٹیاں بنا کر دھولیں اور چھلنی میں رکھ کر ان کا اضافی پانی خشک کر لیں۔ پھر لیموں

کے رس میں نمک، پسی کالی مرچ اور لہسن ادرک کا پیسٹ ملا کر چکن پر لگائیں اور ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں دو چمچے تیل گرم کر کے چکن کو سنہرا کر لیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں پھر اس میں چکن بادام اور کشمش سمیت چاول ڈال کر بھونیں پھر چار پیالی پانی شامل کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہونے پر ہلکے ہاتھ سے چمچے کی مدد سے چاولوں کو اوپر نیچے کریں اور دم لگا دیں۔

مٹھیا کباب

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	1 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	4 عدد
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
سرخ مرچ	1 چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	1 چائے کا چمچہ
انڈا	1 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

ایک بڑے برتن میں قیمے میں لیموں کے رس اور انڈے سمیت تمام مسالے ڈال دیں۔ ہری مرچ اور ہرا دھنیا بھی باریک کاٹ کر ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ (قیمہ چکن کا بھی بنوا سکتی ہیں)۔ اب قیمے کو ہاتھ سے سیخ کباب کی طرح کباب کا شیپ دیں۔ مٹھی میں دبائیں تاکہ انگلیوں کے نشان آ جائیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے احتیاط سے تلیں سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔ سلاد چٹنی یا رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

کریم سلاد

اجزاء

آلو ابلے ہوئے اور چوکور کٹے ہوئے	2 کپ
کریم	1 کپ
نمک	چٹکی بھر
سفید مرچ	چٹکی بھر
ہری پیاز	آدھا کپ

ترکیب:

ان تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کر لیں اور فریج میں رکھ کر ٹھنڈی کر کے کھائیں۔

دال ماش اور قیمہ

اجزاء

دال ماش	ایک پاؤ
قیمہ	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
لہسن	ایک پوتھی
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
ہری مرچ	چار، پانچ عدد
گرم مسالا	چائے کا ایک چمچہ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

پیاز لچھے دار کاٹ لیں اور دال میں بھون کر

بادامی کر لیں۔ اس پر لہسن پیس کر ڈال دیں اور ساتھ ہی قیمہ دھو کر ڈال دیں۔ قیمے کو خوب بھونیں جب قیمے کا رنگ سرخ ہو جائے تو اس میں ہلدی، سرخ مرچ اور نمک ڈال دیں اور تھوڑا بھونیں اور پھر اتنا پانی ڈالیں کہ دال گل جائے اور خشک ہو جائے۔

جب پانی خشک ہو جائے تو دیکھیں کہ دال نے گھی چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہرا مسالا ڈال کر پانچ منٹ دم لگا دیں۔ اب اتار کر گرم مسالا چھڑک دیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

چکن چلی

اجزاء

چکن بغیر ہڈی	1/2 کلو
نمک	ایک ٹی اسپون
کالی مرچ	1 ٹی اسپون
انڈا	1 عدد
کارن فلور	3 ٹیبل اسپون

(سوس کے لیے)

ٹماٹو کیچپ	1 کپ
چلی ساس	2 ٹیبل اسپون
کٹا ہوا لہسن	1 ٹی اسپون
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	1/2 چمچ
سویا سوس	3 ٹیبل اسپون
تیل	1/4 کپ
شملہ مرچ (لمبائی میں کٹی ہوئی)	2 عدد

ترکیب:

تمام اجزاء کو ملا کر چکن کو میری نیٹ کریں اور ڈیپ فرائی کر لیں۔

سوس بنانے کی ترکیب: تیل گرم کریں۔ لہسن فرائی کریں۔ شملہ مرچ اور تمام اجزاء بھی چکن سمیت شامل کریں اور سادے چائنیز رائس کے ساتھ سرو کریں اور داد حاصل کریں۔

مرغ چھولے

اجزاء

مرغی (چھوٹے پیس)	چھوٹے پیس
چھولے ابلے ہوئے	2 پیالی
پیاز	2 بڑی
ٹماٹر	2 بڑے
لہسن ادرک کا پیسٹ	1-1 چمچ
نمک مرچ	1 چمچ
پسا گرم مسالا	1 چائے کا چمچ
مرچ	1 چمچ
پسا دھنیا	1 چمچ
تیل	ڈیڑھ پیالی
ہلدی	آدھی چمچی

ترکیب:

پیاز تیل میں تل لیں۔ جب پیاز سنہری ہو جائے تو تیل سے نکال لیں۔ گرینڈر میں پیاز اور ٹماٹر پیس لیں۔

اب تیل میں لہسن، ادرک ڈال کر 2 منٹ بھونیں پھر دھنیا، پیاز اور ٹماٹر وغیرہ ڈال کر کچھ دیر بھونیں۔ نمک مرچ ڈال کر چکن گلنے دیں۔ جب چکن گل جائے تو ابلے ہوئے چھولے شامل کر دیں۔ مزید دس منٹ تک پکائیں اور تھوڑا سا شوربا رہنے دیں۔ اب سرونگ ڈش میں ڈال کر گرم مسالا، ہرا دھنیا اور ہری مرچ سے سجا کر پیش کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

حافظہ بڑھانے کے لیے

کمزور دماغ کے لوگ ترقی نہیں کر سکتے کیوں کہ انسان کی ترقی کا دارومدار اعلیٰ دماغ پر ہے۔ جب انسان کی یادداشت کمزور ہو جائے تو وہ انسان بے بس اور لاچار ہو جاتا ہے۔ اس کمزوری کی وجہ سے نہ صرف مریض متاثر ہوتا ہے بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے افراد یعنی والدین، اولاد، بیوی بچے اور دیگر رشتے دار بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے بعض اوقات پاگل پن کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

مدارس، اسکول، یونیورسٹی کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں جو تعلیمی بوجھ سے دب کر اپنی صحت خراب کر لیتے ہیں۔ جن کی بھوک اور نیند ختم ہو جاتی ہے حافظہ کمزور، بھول کا مادہ، ذہن مرکوز نہ کر سکنا، پڑھنے والے بچوں میں ذہنی قوت کی کمی، ذہنی خرابی، ذہنی کمزوری، امتحان کا خوف وغیرہ پیدا ہو جاتا ہو تو ان حالات میں روشن دماغ بہترین نعمت لگی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں کامیابی کے لیے توانا جسم سے کہیں زیادہ دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید دور میں دماغ کی کمزوری کی شکایت عام ہو گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم جسم کو غذا تو دیتے ہیں لیکن دماغ کا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے رطوبات زندگی کے ضائع ہو جانے سے یا اخلاقی جذبات کے دب جانے سے دماغی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور وقت سے پہلے بڑھاپا، دن بھر محنت اور چلنے پھرنے کے بعد سخت تھکاوٹ محسوس کرنا جاگتے ہوئے یا نیند کی حالت میں قوت ارادی کی کمی، مطالعہ کرنے سے دردسر، پیٹھ اور ٹانگوں میں کمزوری، دماغی اعصابی، پریشان خیالی، رنج وغم کے احساس کی زیادتی، نفسیاتی ذہنی امراض دماغ میں خون کی زیادتی، بے آرامی طبیعت، اکھڑی اکھڑی سستی کا احساس، اداسی، بے چینی، غمگین، خاموشی، رعشہ، غصہ کے تاثرات، کام سے عدم رغبتی اپنے آپ میں گم رہنا، بات کرنے کو دل نہ چاہنا۔ ان تمام علامات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے شعبہ ریسرچ نے ایسا قیمتی دیسی جڑی بوٹیوں کا فارمولہ تیار کیا ہے کہ جس سے انسان کا حافظہ کبھی خراب نہیں ہوتا اور انسان ہمیشہ کے لیے ایسی علامات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ آپ کوئی بھی کام کرتے ہیں قوت حافظہ اور نظر دونوں صلاحیتیں دونوں آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اسی طرح بینائی بھی کامیاب زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

نسخہ نمبر 1

اجزاء	وزن
مغز بادام	10 گرام
مغز پستہ	10 گرام
مغز اخروٹ	10 گرام
مغز تربوز	10 گرام
مغز کدو	10 گرام
مغز پنبہ دانہ	10 گرام
خشخاش سیاہ	10 گرام
بالنگو	10 گرام
نیتر بالا	10 گرام
زرشک	10 گرام
اگرعود	10 گرام
دکنی مرچ	10 گرام

نسخہ نمبر 2

اجزاء	وزن
چندن سفید	10 گرام
برگ گاؤزبان	10 گرام
الائچی سبز خورد	10 گرام
آنولہ	10 گرام
تخم خرفہ سیاہ	10 گرام
بادرنجبویہ	10 گرام
بہمن سفید	10 گرام
دورنج عقربی	10 گرام
گل عشنہ	10 گرام
گل سرخ	10 گرام
مغز کشنیز	10 گرام
تودری سرخ	10 گرام

ترکیب:

ان تمام اجزاء کو سفوف بنا کر شہد میں ملائیں کر صبح شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں ایک ٹی اسپون۔

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

پیارے قارئین اس ماہ آپ کی جانب سے بھیجے گئے ان سوالوں کے جواب دوں گا جو مسئلے کی صورت کسی نا کسی طور پر آپ کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔

آمنہ شاہ۔اسلام آباد

☆: خرم بھائی میں جاب کرتی ہوں۔روزانہ لپ اسٹک لگاتی ہوں لیکن کچھ عرصے سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ہونٹ سیاہ پڑتے جا رہے ہیں؟ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے ہونٹ گلابی ہو جائیں۔

□: لپ اسٹک کے مسلسل استعمال سے ہونٹ کالے ہو جاتے ہیں۔خراب قسم کی لپ اسٹک ہو تو تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔اس صورت حال سے بچنے کے لیے آپ تھوڑے دن کے لیے لپ اسٹک کا استعمال بالکل چھوڑ دیں اور ہر رات کو سونے سے پہلے ہونٹوں پر زیتون کا تیل لگائیں، ہونٹ اپنی قدرتی گلابی رنگت پر آ جائیں گے۔ اگر آپ یہ معمول بنا لیں کہ زیتون کے تیل کے ساتھ دو قطرہ لیموں کا عرق ملا کر ہر روز لگائیں تو ہونٹ کبھی سیاہ نہ ہوں گے۔

روبینہ۔شیخوپورہ

☆: ڈاکٹر صاحب! میرے چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں۔میں ان بالوں سے نجات کے لیے ویکسنگ یا تھریڈنگ کرتی ہوں، لیکن ہفتہ یا پندرہ دن بعد بال دوبارہ نکل آتے ہیں۔بار بار اس تکلیف دہ عمل سے گزرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے سنا ہے لیزر سے بالوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ کیا ممکن ہے؟ اور یہ سہولت کہاں مل سکتی ہے؟

□: لیزر کی سہولت بڑے بیوٹی پارلرز میں دستیاب ہے لیکن یہ غلط ہے کہ لیزر سے ہمیشہ کے لیے بالوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔علاج کے چھ ماہ بعد دوبارہ بال نمودار ہو جاتے ہیں۔ آپ کو لیزر کی ضرورت نہیں، آپ بلیچ کر کے تھریڈنگ کریں، اس سے تکلیف کم محسوس ہو گی۔

چہرے پر بال موروثی بھی ہوتے ہیں یا ہارمونل خرابی کی وجہ سے نکلتے ہیں۔ایام کی کمی کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں تو اس خرابی کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔

انور جہاں۔ملتان

☆: میرا مسئلہ موٹاپا ہے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کرتی ہوں۔ ایک روٹی دوپہر اور ایک رات میں کھاتی ہوں عمر میری بیس سال ہے۔ قد 5 پانچ فٹ 5 انچ ہے اور وزن 70 کلو ہے۔ ٹانگوں کے اوپر والا حصہ اور منہ موٹا ہوتا ہے۔ مجھے پانی بھی موٹا

کرتا ہے۔ دل کرتا ہے ایک کمرے میں بند ہو جاؤں۔ بواسیر کا بھی مسئلہ ہے اور مجھے اپنے پیریڈ بھی درست نہیں لگتے ہیں۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے اور جسم موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے ایک دو طرح کی ورزش کی ہے لیکن ایک دو دن بعد میرا سارا جسم درد کرنے شروع ہو جاتا ہے کہ چلا ہی نہیں جاتا ہے اور آپ سے پوچھنا تھا کہ کیا دیسی آملے کا مربہ اور ڈبے کا دودھ موٹا کرتا ہے؟

□: موٹاپے کا سبب تو آپ نے خود ہی بتا دیا ہے پیریڈ صحیح نہ ہونا، قبض اور موٹاپے کا اہم سبب ہیں قبض دور کرنے کے لیے ہرڑ کا استعمال بہت مفید ہے۔ اسے باریک ٹکڑوں میں توڑ کر رکھ لیں اور کھانا کھانے کے فوراً بعد ایک دو ٹکڑے منہ میں رکھ کر چوستی رہیں یا چھوٹی ہرڑ خشک کر کے باریک پیس لیں اور کسی شیشی میں بند کر کے رکھ دیں۔ اس کے ایک دو چمچ شام کو کھانے کے دو تین گھنٹے بعد پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ پانی زیادہ پئیں کچی سبزیاں اور پھل کھائیں۔ قبض دور ہو جائے گا۔

ایک بہت آسان اور پر اثر ڈائٹنگ لکھ رہا ہوں اس سے کافی لوگوں کا فائدہ ہوا ہے، پہلے ہفتے میں صرف دال، موسمی پھل اور سبزیاں کھائیں۔ دال میں گھی نہ ڈالیں، ممکن ہو تو سبزیوں کو بھی کچا یا صرف ابال کر کھائیں۔ سلاد کی صورت میں گاجر، مولی پالک، ککڑی، بند گوبھی اور ٹماٹر وغیرہ جی بھر کر کھائیں۔ صبح شام چھاچھ کا ایک گلاس لیں۔

دوسرے ہفتے میں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ۔ اور جو آٹے کی روٹی صبح و شام کھائیں۔ آٹا تیار کرنے کے لیے پانچ کلو ثابت چنے اور ایک کلو جو کو ملا کر پسوا لیں۔ اور پورا ہفتہ استعمال کریں۔ ایک مہینے تک یہی خوراک لیں۔ ایک مہینے بعد گندم کے آٹے کی روٹی کھا سکتی ہیں لیکن ہفتے میں دو دن چنے اور جو کے آٹے کی روٹی کھائیں وزن کم ہو جائے گا۔

ورزش کریں تو جسم میں شروع شروع درد ہوتا ہے۔ بعد میں جب جسم عادی ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ ورزش اس طرح کریں کہ پہلے دن بہت ہلکی کریں پھر آہستہ آہستہ وقفہ بڑھاتی جائیں۔ ڈبے کا دودھ اگر چکنائی کے بغیر ہو تو موٹا نہیں کرتا، آملے کا مربہ بھی وزن نہیں بڑھاتا لیکن آپ چکنائی کے بغیر چھاچھ استعمال کریں۔

روحی۔ حیدر آباد

☆: میرے بال لمبے اور گھنے ہیں لیکن خشک، بے رونق اور کھردرے ہیں۔ آج کل بہت تیزی سے گر رہے ہیں۔ میں ہفتہ میں دو دن شیمپو کرتی ہوں لیکن گرمی کی وجہ سے ہفتے میں تین دن شیمپو کرنا شروع کیا تو بالوں کا رنگ بھی خراب ہو گیا اور وہ مزید بے رونق ہو گئے۔ کوئی آسان سی ترکیب بتائیں جس پر عمل کر کے بال چمکدار اور سلکی ہو جائیں۔

□: گرمی کے موسم میں جب ہم شیمپو زیادہ کرتے ہیں تو یہ بالوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو تیل کا استعمال باقاعدگی سے کرنا چاہیے۔ رات کو سونے سے پہلے یا بال شیمپو کرنے کے دو گھنٹے پہلے بالوں میں تیل لگائیں۔ اس کے علاوہ ہر شیمپو سے پہلے بالوں میں کنڈیشننگ کریں۔ اور انڈا لے کر اس میں ایک چائے کا چمچ سفید سرکہ اور گلیسرین ملا کر اچھی طرح پھینٹ کر مکس کر لیں۔ پھر اس کے بعد مکسچر کو اپنے سر پر اچھی طرح لگائیں۔ اس کے بعد بالوں کو دھونے سے پہلے بیس منٹ کے لیے گرم پانی میں تولیہ بھگو کر سر پر لپیٹ لیں، اس سے بالوں میں چمک اور نرمی آ جائے گی اور شیمپو کے مضر اثرات بھی رفع ہو جائیں گے۔

☆☆......☆☆